سنسنی خیز موضوعات پر دُنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
سنگتراش
ناگ جھون
سرورق کی تین کہانیاں
اِس شمارے کی اِنعام یافتہ کہانی
اور دُوسری کہانیاں

جلد ۳ ● شمارہ ۴ ● اپریل ۱۹۷۳ء
قیمت ● دو روپے
زرِ سالانہ مع رجسٹری فیس ● /۲۵ روپے
خط و کتابت کا پتہ ● پوسٹ بکس ۲۲۹ کراچی
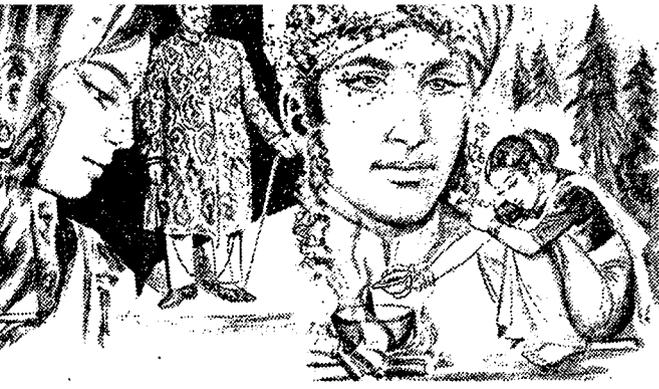
ماہ مبین ایم اے کی زیرِادارت
خواتین کیلئے ایک منفرد ڈائجسٹ

مارچ کے آخر میں شائع ہو رہا ہے

پاکیزہ میں کیا ہوگا؟

اِن سطور میں 'پاکیزہ' میں شائع ہونے والے موضوعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہنوں سے درخواست ہے کہ ان موضوعات پر اپنی تجاویز اور مضامین ارسال کریں۔

انٹرویو — مشہور سماجی، علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات (خواتین) کے انٹرویو، خواتین کے مسائل پر، اُن کے خیالات اور اُن کو حل کرنے کی تجاویز۔

افسانے — پاکیزہ میں ہر ماہ کم از کم ۱۰ افسانے پیش کیے جائیں گے ہماری خواہش ہے کہ نامور لکھنے والیوں کے ساتھ ساتھ ان بہنوں کے افسانے بھی شائع ہوں جو زیادہ مشہور نہیں ہیں یا جنہوں نے حال ہی میں لکھنا شروع کیا ہے۔ پاکیزہ میں شائع ہونے والے ہر افسانے کا معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

اِنعامی افسانے — پاکیزہ میں ہر ماہ دو انعامی افسانے شائع ہوں گے۔ تمام بہنیں اِس مقابلے میں حصہ لے سکتی ہیں۔

پہلے افسانے پر /۳۰۰ روپے
دُوسرے افسانے پر /۱۵۰ روپے

انعام پیش کیا جائے گا۔ تین نامور خواتین پر مشتمل ایک کمیٹی انعامی افسانوں کا فیصلہ کرے گی۔

سچّی کہانیاں اور آپ بیتیاں — آپ کی، یا آپ کی کسی سہیلی یا عزیزہ کی زندگی میں ممکن ہے ایسے واقعات پیش آئے ہوں جو دُوسروں کے لیے دلچسپ یا سبق آموز ثابت ہوں ایسے واقعات ہمیں لکھ بھیجیے، ہم انہیں کہانی کی صُورت میں ڈھال لیں گے۔

مُسلسل ناول — "چارہ گر" کی مُصنفہ بشریٰ رحمٰن کا ایک نیا شاہکار ناول قسط وار پیش کیا جائے گا۔

اِن موضوعات پر آپ کا تعاون درکار ہے

معصُوم باتیں — معصُوم بچّوں کی پیاری پیاری باتیں ہمیں لکھ بھیجیے۔

ایسا بھی ہوتا ہے — کوئی ایسا واقعہ جس نے آپ کو متاثر کیا ہو۔

خواب کی تعبیر — کوئی ایسا خواب جس کی آپ صحیح تعبیر چاہتی ہوں

اُلجھنیں — آپ کی اُلجھنیں خواہ وہ نفسیاتی ہوں، معاشرتی یا ازدواجی، ہمیں بھیجیے۔ ماہرین انہیں حل کریں گے۔

طبّی مشورے — بیماریاں، ہومیوپیتھک، یونانی اور ایلوپیتھک مشورے

کچھ اور موضوعات

نظمیں، غزلیں، گیت ● عورتوں کی نفسیات
خانہ داری ● تربیّتِ اطفال
کشیدہ کاری ● آرائش
فیشن ● مذہب
نامور خواتین ● باورچی خانہ
لطائف، ناقابلِ فراموش واقعات، اعترافات، اقتباسات اور کارٹون

صفحات: ۱۵۰، قیمت: ۲ روپے، زرِ سالانہ: ۲۵ روپے

پاکیزہ
پوسٹ بکس نمبر ۲۲۹ ● کراچی

پبلشر ● عبدالغفار
پرنٹر ● منظور احمد خان
مطبوعہ ● جاوید پریس
آئی آئی چندریگر روڈ کراچی
مقامِ اشاعت ● ۷/۱۴ - E - ۷ ناظم آباد، کراچی ۱۸

بات

اس ماہ کاغذ کے سلسلے میں جتنی پریشانی اٹھانی پڑی اور جس قدر مشکلات پیش آئیں اُنہیں ترتیب دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ نیوز پرنٹ آرڈی نینس کو نافذ ہوئے ۲۳ مہینے ہو چکے ہیں لیکن اب تک کاغذ کی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور اب صورت یہ ہے کہ لاکھوں افراد کے پسندیدہ جاسوسی ڈائجسٹ میں منافع تو درکنار، اُلٹا نقصان ہو رہا ہے۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا اجرا جنوری ۱۹۷۱ء میں ہوا، پہلے ہی شمارے سے قیمت دو روپے رکھی گئی، اس وقت نیوز پرنٹ کا ایک رِم بیس روپے میں ملتا تھا جبکہ آجکل نیوز پرنٹ سرے سے دستیاب ہی نہیں ہے، آپ یقین کریں گے اس ماہ جاسوسی ڈائجسٹ کیلئے کاغذ میں نے پانچ روز کی دوڑ دھوپ کے بعد ۵۸ روپے رِم کے حساب سے خریدا ہے، کاغذ نہ ملنے کے باعث چار روز تک کاپیاں پریس جا نہ سکیں جاسوسی ڈائجسٹ کی بے پناہ مقبولیت اور اشاعت ڈھکی چھپی بات نہیں، اتنی بڑی اشاعت کے پرچے کیلئے کاغذ رِموں کے حساب سے نہیں ٹنوں کے حساب سے خریدا جاتا ہے، اور ٹنوں کے حساب سے آج کل کاغذ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، یہی وجہ ہے کہ پرچا اس ماہ قدرے تاخیر سے شائع ہو رہا ہے ــــ تو یہ تھی نیوز پرنٹ کی صورتحال، اب آیئے ٹائٹل کے کاغذ کی طرف ــــ جنوری ۱۹۷۱ء میں آرٹ پیپر دو سو روپے رِم ملتا تھا اور اب وہی آرٹ پیپر تین سو اسی روپے رِم مل رہا ہے، اس کے علاوہ جنوری ۱۹۷۱ء سے اب تک مصنفین کے معاوضوں میں دو سو فی صد اضافہ ہوا ہے، پہلے پرچہ آفسٹ پر چھپتا تھا جبکہ آجکل پرچہ فوٹو آفسٹ پر شائع ہو رہا ہے، جو سب سے زیادہ مہنگا طریقۂ طباعت ہے اور بھی ایسی بے شمار چیزیں ہیں جنکے داموں میں سو سے لے کر تین سو فیصد کا اضافہ ہوا ہے، ان سب باتوں کے باوجود جاسوسی ڈائجسٹ کی قیمت وہی دو روپے ہے۔

پچھلے دنوں تقریباً سبھی اخبارات نے قیمت میں پانچ پیسے کا اضافہ کیا تھا؟ اب آپ ہی بتلایئے پچیس پیسے کے اخبار پر پانچ پیسے کا اضافہ ہوا ہے، تو کیا دو روپے کے جاسوسی ڈائجسٹ پر پچاس پیسے کا اضافہ نہیں ہو سکتا؟ بالکل ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ پچاس پیسے کا اضافہ قارئین پر ایک بوجھ ہے، بہت سے لوگ اسکے متحمل نہیں ہو سکتے لہٰذا طے کیا گیا ہے کہ آئندہ ماہ سے قیمت میں پچیس پیسے کا اضافہ کر دیا جائے یعنی مئی کا شمارہ آپ کو ۲٫۲۵ روپے کا مل سکے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین ہماری مجبوریوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے قیمت میں پچیس پیسے کا اضافہ قبول فرمالیں گے۔

اس ماہ ارادہ قیمت بڑھانے کا نہیں تھا۔ ٹائٹل پہلے ہی چھپ گیا تھا۔ جس پر قیمت بھی دو روپے چھپ گئی تھی اس لئے مجبوراً قیمت دو روپے ہی رکھنا پڑی، صفحات ۱۶ کم ہو گئے ہیں، آئندہ ماہ سے صفحات وہی ۱۶۲، اور قیمت ۲/۲۵ ہو گی۔

یہ تو ہوا کاغذ کا دُکھڑا ــــ اب آیئے اس شمارے کی طرف ــــ
اِس ماہ انعام یافتہ کہانی ایک رات کا شہر ہے جو صفدر صدیقی نے لکھی ہے، یہ ایک انتہائی پُراسرار کہانی ہے دیکھا گیا ہے کہ انعام یافتہ کہانی کے سلسلے میں پُراسرار کہانیاں زیادہ پسند کی جاتی ہیں، ویسے ایڈونچر اور جرم و سزا کی کہانیاں بھی کچھ کم نہیں پسند کی جاتیں، دراصل انعام یافتہ کہانی ہی جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ ہے۔
سرورق کی اس ماہ تین کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں ــــ اِس بار کہانیاں کچھ کم ہیں اسکی وجہ صفحات میں کمی ہے، لیکن سب کی سب کہانیاں بہت اعلیٰ درجے کی ہیں۔
اس ماہ بھی بہت سے خطوط آئے ہیں اُن کا جواب میں فرداً فرداً دے رہا ہوں۔ قارئین مطمئن رہیں ــــ !

ایک رات شہر ما
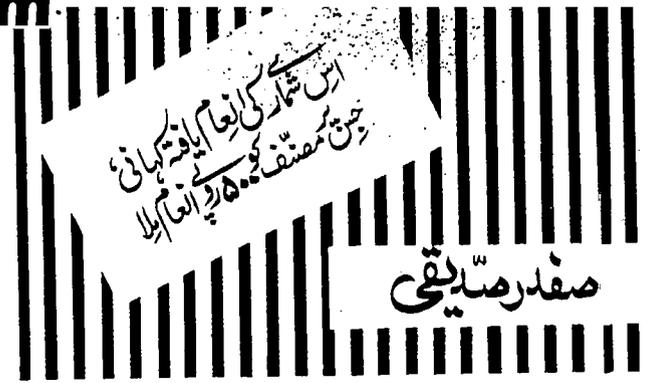
میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے چارج لینے کے ایک ہفتہ بعد وہاں کی میونسپل کمیٹی نے شہریوں کی جانب سے مجھے ایک استقبالیہ پارٹی دی جس میں سب سے پہلے میرا تعارف معززین شہر سے کرایا گیا' مختلف لوگوں سے ہاتھ ملاتا ہوا میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک میں نے اپنے سامنے اشرف کو کھڑا پایا جو بی اے تک میرا کلاس فیلو اور بہترین دوست رہ چکا تھا' اُس کے والد متوسط طبقے کے ترنس مین تھے' اشرف کی بڑی خواہش تھی کہ وہ بھی مزید تعلیم کیلئے میرے ساتھ انگلینڈ چلے اور شاید وہ اپنے والد کو رضامند کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا کہ اُسکے والد پر اُنہی دنوں فالج کا حملہ ہوا اور وہ تقریباً اپاہج ہو کر گھر میں بیٹھ رہے' اشرف اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اس لئے قدرتی طور پر اُسے انگلینڈ جانے کا پروگرام ختم کر کے باپ کی دوکان سنبھالنا پڑی میرے انگلینڈ پہنچنے کے بعد شروع شروع میں اُسکے خط پابندی سے آتے رہے میں جواب بھی دیتا رہا۔ مگر اشرف بڑا بلند ہمت نوجوان تھا جب اُس نے دیکھا کہ تقدیر نے اُسے معاشی جدوجہد میں ڈال ہی دیا ہے تو وہ خود کو اُسی میدان میں کامیاب ثابت کرنے اور کاروبار کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھانے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اُسکی بڑھتی ہوئی مصروفیت نے ہماری خط و کتابت کو بھی متاثر کیا۔ یہاں تک کہ سال ڈیڑھ سال بعد اُسکے خط آنا بالکل بند ہو گئے۔ میں بھی نمایاں پوزیشن سے کامیاب ہونے کی کوشش میں کچھ زیادہ ہی تعلیم حاصل کرنے میں منہمک رہا اور یوں تقریباً دو سال سے ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

یوں اُسے اپنے سامنے دیکھ کر میں خوشی سے اچھل پڑا' بڑی گرمجوشی سے ہم دونوں نے ہاتھ ملائے۔ ہمیشہ کی طرح اُس روز بھی اشرف

کے ہونٹوں پر ایک میٹھی مسکراہٹ موجود تھی، میں نے اُسے نظر بھر کر دیکھا۔ طالب علمی کے زمانے میں اُسے کالج کا ہیرو کہا جاتا تھا۔ سُرخ و سفید رنگ کشادہ پیشانی، سیاہ مسکراتی ہوئی آنکھیں، بھرا بھرا چہرہ مردانہ وجاہت کا بہترین نمونہ تھا، وہ اب بھی اتنا ہی خوبصورت نظر آرہا تھا، سوائے اس فرق کے کہ ذمہ داریوں کے بوجھ نے چہرے کے تاثرات میں کھلنڈرے پن کی جگہ کچھ سنجیدگی پیدا کردی تھی اس وقت زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہیں تھا میونسپلٹی کے صدر نے اُس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ شہر کی کلاتھ مرچنٹ ایسوسی ایشن کا چیئرمین ہے، میں نے چند رسمی فقرے کہے، اور تعارف کے بعد اُس سے تفصیلی ملاقات کی توقع کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ملاقاتوں کے بعد شہر کے مختلف اسکولوں سے آئے ہوئے بوائے اسکاؤٹس نے مارچ پاسٹ کیا، اُس سے فارغ ہو کر مجھے ڈائس پر جانا تھا، جہاں سپاسنامہ اور میری جوابی تقریر کے بعد عصرانے کی دعوت کا اہتمام تھا، مگر میں اشرف سے باتیں کرنے کیلئے بے چین تھا، میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، اشرف دوسرے لوگوں کے ساتھ جلسہ گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا اُسکے ہمراہ ایک خاتون بھی تھیں، مجھے فوراً خیال آیا کہ غالبًا اُس نے شادی کرلی ہے دوہرے اشتیاق کے ساتھ میں اُسکی طرف لپکا مجھے آتے دیکھ کر وہ رُک گیا اور ساتھ ہی اُسکی رفیق خاتون بھی، قریب پہنچنے پر میں نے پہلی مرتبہ اسکے چہرے پر نظر ڈالی اور مبہوت سا اُسکی طرف دیکھتا ہی رہ گیا، اتنا حسین اور دلکش چہرہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ہلکے کشمشی رنگ کی کامدار ساڑھی میں وہ کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق معلوم ہوتی تھی۔ ایک لمحہ کیلئے ہماری نظریں ملیں، اُن نظروں میں کوئی ایسی کیفیت تھی کہ میں نے اپنے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس کی، اور یہ کوئی خوشگوار تجربہ نہیں تھا، مجھے یوں لگا جیسے ان آنکھوں کے پیچھے عجیب پُراسرار گہرائیاں چھپی ہوں، ایسی گہرائیاں جن میں ڈوبنے والا کبھی نہیں اُبھر سکتا اور کسی انجانے خوف سے مجھے جھرجھری سی آگئی، میں نے جلدی سے اُسکی طرف سے نظریں ہٹالیں۔

اشرف مجھے اس طرح اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر کھل اُٹھا تھا ہم دونوں نے ایک دو منٹ گلے شکوؤں میں صرف کئے اور پھر جیسے اشرف کو اس خاتون کی موجودگی کا دفعتًا احساس ہوا ہو، وہ ایک شرمندہ مسکراہٹ کے ساتھ اُسکی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے بولا۔ "اِن سے ملو منصور، یہ ہیں عنقریب تمہاری ہونیوالی بھابھی اور میری منگیتر زرتاج۔ اور زرتاج یہ ہے میرا بہت ہی عزیز دوست منصور۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ ڈپٹی کمشنر بیگم شاید مجھے پہچاننے سے بھی انکار کردیگا۔ مگر یہ تو ذرا بھی نہیں بدلا۔"

"السلام علیکم بھابھی!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

زرتاج کے چہرے پر ہلکی سی زردی دوڑ گئی، وہ یوں پیچھے ہٹی جیسے اشرف کی آڑ میں چھپ جانا چاہتی ہو میرے لئے اُس کا یہ ردِعمل حیرت انگیز تھا۔ مگر میں نے اُسے خجالت پر محمول کیا۔

"ہائیں۔" اشرف نے آنکھیں پھاڑیں۔ "نہ گڈ آفٹر نون نہ ہاؤ ڈو یو ڈو، تم کیسے لندن پلٹ ہو کہ ابھی تک سلام علیکم نہیں چھوڑ سکے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم اب بھی وہ تعویذ سینے سے لگائے پھرتے ہو گے جو کالج میں تمہارے گلے کا ہار بنا رہتا تھا۔"

"وہ تعویذ نہیں ہے۔ عکسی قرآن مجید ہے جو ایک صفحے پر چھاپا گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں مجھ پر چوٹ کرنیکا حق نہیں پہنچتا جبکہ تمہاری ہونیوالی بیگم بے پردہ اور آزاد خیال ہونے کے باوجود اس طرح شرما رہی ہیں جیسے پُرانے زمانے کی لڑکیاں دیور جیٹھوں کو دیکھ کر شرمایا کرتی تھیں۔"

پیشتر اسکے کہ اشرف کچھ جواب دیتا کمیٹی کے صدر صاحب لپکتے ہوئے میرے پاس آئے۔ "آپ یہاں کھڑے ہیں، اور وہاں کارروائی شروع کرنے کے لئے آپ کا انتظار کیا جارہا ہے۔" اُنہوں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اور اُسی وقت مائکروفون پر اعلان کیا گیا۔ "خواتین و حضرات اب آپکے سامنے قاری محمد سعید صاحب تلاوت قرآن پاک فرمائینگے۔"

زرتاج نے چونک کر ڈائس کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں اشرف سے بولی۔ "آپ لوگ چلیے میں ابھی آتی ہوں۔" میں صدر صاحب کے ساتھ ڈائس کی جانب چلا۔ اشرف راستے میں اُس طرف گھوم گیا۔ جہاں مقتدر لوگوں اور اُنکی بیگمات کے لئے نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ تلاوت شروع ہو چکی تھی۔ مگر میرے ذہن میں زرتاج کے رویہ نے ایک کھٹک پیدا کردی تھی، اشرف کوئی مذہبی خیالات رکھنے والا نوجوان نہیں تھا، میں جانتا تھا، مگر وہ اپنے لئے کسی ایسی لڑکی کا انتخاب کریگا، جو سلام علیکم یا قرآن شریف کی تلاوت کو بھی ناگوار سمجھے اس پر مجھے حیرت تھی۔

مجھے ابھی اپنا عہدہ سنبھالے ہوئے ایک ماہ بھی نہیں گذرا تھا کہ گھر سے امی کے خطوط کا ایک تانتا سا بندھ گیا، میں اپنے والد کا اکلوتا بیٹا، بلکہ اکلوتی اولاد تھا اور امی کو بقول اُنکے اب زندگی میں میرے سر پر سہرا دیکھنے کے علاوہ کوئی اور آرزو نہیں رہ گئی تھی، وہ تو میرے انگلینڈ جانے

سے پہلے ہی اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں، خاص طور پر اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں میں ولایت سے کوئی میم اپنے ساتھ نہ لے آؤں جو کہ نہ صرف اس زمانے میں، بلکہ اُس دور میں بھی سمندر پار جانے والوں کا ایک طرہ امتیاز تھا، مگر میرے والد جو ہائی کورٹ کے جج رہ چکے تھے اور اب پنشن لے کر آرام کر رہے تھے، بڑے سلجھے ہوئے خیالات کے انسان تھے اُنہوں نے سختی سے اس کی مخالفت کی، اُن کا کہنا تھا کہ جب تک آدمی خود اپنا اور اپنے متعلقین کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہ ہو جائے اُسے شادی نہیں کرنی چاہیئے۔

مگر اب جبکہ میں انگلینڈ سے واپس ہی نہیں آچکا تھا، بلکہ مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ایک اچھے عہدے پر میرا تقرر بھی ہو گیا تھا تو وہ بھی، والدہ کے ہم خیال نظر آتے تھے اور امی کے خط میں دو چار سطریں خود بھی تاکید مکرر کے طور سے لکھ رہے تھے جن کا لب لباب یہ ہوتا تھا کہ اگر کسی وجہ سے نہیں تو کم از کم اس خیال سے مجھے شادی کر لینا چاہئے کہ نواب شہاب الدین آخر کب تک اپنی جوان بیٹی کو میرے انتظار میں بٹھائے رکھیں گے۔

میں اپنے والدین کی ناخلف اولاد نہیں تھا اور اب تک اُنکے ہر فیصلے کو بڑی سعادتمندی سے سر جھکا کر قبول کرتا چلا آیا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ اُنہوں نے بھی کبھی میری مرضی کے خلاف اپنا کوئی فیصلہ مجھ پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، خاص طور سے والد صاحب نے، مگر یہ شادی کا معاملہ ذرا مختلف تھا، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو ہر نوجوان کی طرح میرا بھی ایک آئیڈیل تھا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایسا نہیں تھا کہ اُسکی تلاش زمین کے بجائے آسمانوں میں کی جاتی، یا بقول ایک مزاح نگار کے مجھے ایک ساتھ کئی لڑکیوں سے شادی کرنا پڑتی۔ کیونکہ مطلوبہ صفات کسی ایک لڑکی میں جمع ہونا ناممکن تھیں۔ اس سلسلے میں میری سب سے پہلی خواہش تو یہ تھی کہ مجھے لڑکی سے ملنے اور اُسے تھوڑا بہت سمجھنے کا موقع دیا جائے (خواہ اُسکے سرپرستوں کی نگرانی میں ہی سہی) دوسرے یہ کہ اگر وہ کوئی چاند کا ٹکڑا یا زرخرید کنیز نہ بھی ہو تب بھی کم سے کم ہر طرف سے لڑکی تو نظر آئے اور اتنا تو ہو کہ شام کو تھکے ماندے دفتر سے لوٹتے ہوئے میاں کو یہ خطرہ لاحق نہ ہو کہ اب گھر جا کر باورچی خانہ کا منہ دیکھنا پڑیگا کیونکہ بیگم صاحبہ ٹامی یا ٹائیگر کو ساتھ لے کر کلب جا چکی ہونگی۔

غالبًا آپ کہیں گے کہ اس معیار پر کسی بھی اوسط گھرانے کی کوئی بھی اوسط لڑکی پوری اُتر سکتی تھی چنانچہ مجھے اپنے والدین کے انتخاب پر اعتماد کرتے ہوئے شادی کی حامی بھر لینا چاہئے تھی، مگر مصیبت یہ تھی کہ نواب شہاب الدین کا خاندان کوئی متوسط خاندان نہیں تھا اور مجھے خطرہ تھا کہ اُنکی صاحبزادی نیلوفر بھی کم سے کم میرے حق میں متوازن ثابت نہیں ہونگی، نواب صاحب اگرچہ والد صاحب کے بہترین دوستوں میں شامل تھے مگر میں چونکہ تعلیم کے سلسلے میں زیادہ گھر سے باہر رہا تھا اس لئے اُنسے یا اُنکے خاندان کے لوگوں سے زیادہ واقف نہیں تھا، صرف اتنا جانتا تھا کہ اُنکے آبا۔ واجداد ایران سے آئے تھے اور مغلوں کے آخری دور میں اُنہیں شہزاد نگر اور اسکے گردو پیش کئی سو مربع میل کا علاقہ بطور جاگیر دیا گیا تھا۔ اور دھام پور جہاں ہم لوگ رہتے تھے کبھی اُن کی جاگیر میں شامل تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہ جاگیر سمٹ کر چند گاؤں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، والد صاحب جب وکالت کیا کرتے تھے تو نواب شہاب الدین نے اُنہیں کئی مقدمات میں اپنا وکیل بنایا تھا جن سے دوستانہ تعلقات کی بنیاد پڑی جو اب ہوتے ہوتے اتنی مضبوط ہوگئی تھی کہ اُسے عزیزداری میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

میری ہچکچاہٹ کی اصل وجہ نواب صاحب کی خاندانی شرافت یا امارت نہیں تھی بلکہ مجھے وہ بناوٹی اور تکلف آمیز ماحول ناپسند تھا جو جاگیرداروں اور نوابوں کے محلات میں پایا جاتا ہے، میں سوچتا تھا کہ جو لڑکی اس ماحول میں پروان چڑھی ہو وہ ماڈرن سوسائٹی میں میرا ساتھ کیسے دے سکے گی نیلوفر کے نام کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک ایسی لڑکی کا تصور اُبھرتا تھا جو سر سے پیر تک زیورات میں لدی پھندی، زربفت اور کمخواب کا بھاری جوڑا پہنے گاؤ تکیئے کے سہارے تخت پر بیٹھی ہو، چاروں طرف خادمائیں اور کنیزیں اُسکے چشم و ابرو کے اشارے کی منتظر ہوں، وہ اُٹھ کر چلے تو دو خادمائیں اُسکے فرشی غرارے کے پائینچے سنبھالے ساتھ ساتھ چلیں، وہ بات کرے تو القاب و آداب سے مرصع گفتگو میں نفس مضمون تلاش کرنا مشکل ہوجائے۔

ابتدائی چند خطوط کے جوابات میں تو میں اس ذکر ہی کو ٹالتا رہا۔ لیکن جب تحریر کا انداز خفگی میں بدلنے لگا تو مجھے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑا، خط و کتابت میں بات اُلجھ جانے کا امکان تھا اس لئے میں نے امی کو لکھدیا کہ میں عنقریب کچھ دن کی رخصت لے کر آرہا ہوں اور یہ کہ وہ اطمینان رکھیں، میں اُنکے کسی حکم سے سرتابی کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا۔ اسکے ساتھ ہی میں نے ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست دیدی، تقرر ہوئے چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے، اجازت ملنا بعید دشوار تھا، مگر میں نے کسی نہ کسی طرح کوشش کر کے دس دن کی منظوری حاصل کرہی لی۔ اس دوران اشرف سے ایک طویل مدت کے بعد ملاقات ہونے کے باوجود تجدید تعلقات میں وہ سرگرمی مفقود تھی جس کا میں متمنی

گاڑی کا نسخہ تو کسی وقت آزمایا جا سکتا ہے اگر اُس وقت مجھے معلوم ہوتا کہ مستری صاحب رات کے ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے نہیں لوٹیں گے تو کبھی نہ رُکتا۔ بہر حال مستری صاحب خدا خدا کر کے گھر آئے۔ بہت افسوس ظاہر کیا ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنائی کہ نئی بیٹری تو نہیں ہے البتہ وہ میری بیٹری کو دو گھنٹے کے اندر فل چارج کر دیں گے۔ قصہ مختصر میں چلنے کے لئے فارغ پہنچا تھا، مگر جب وہاں سے روانہ ہوا تو سوا گیارہ بجے تھے۔ طبیعت بجد جھلائی ہوئی تھی موڈ آف ہو رہا تھا کئی بار سوچا کہ گھر لوٹ جاؤں۔ مگر کار جیسے خود بخود شہزاد نگر کی طرف اُڑی چلی جا رہی تھی اب سوچتا ہوں کہ اگر اس رات دھام پور واپس چلا گیا ہوتا تو شاید وہ پریشان کن حالات پیش نہ آتے جن سے بعد میں سابقہ پڑا، یا پیش آتے تو کم سے کم میں اُن کے مشاہدے سے بچ جاتا۔ مگر انسان مشیت کے ہاتھوں میں ایک بے بس کھلونے کی طرح ہے اور اُسے چار و ناچار وہ سب کچھ دیکھنا اور برداشت کرنا پڑتا ہے جو اسکی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اتنی وضاحت اور کر دوں کہ شہزاد نگر ایک چھوٹا سا شہر تھا جس کی آبادی اس وقت ایک لاکھ سے زیادہ نہیں تھی اور دریائے کاوری کے دائیں کنارے پر آباد تھا کہا جاتا تھا کہ دو سو سال قبل یہ شہر دریائے کاوری کے بائیں کنارے پر واقع تھا، مگر کسی وجہ سے اس وقت کے نواب کو اس سے نفرت ہو گئی اور انہوں نے شہر کے تمام باشندوں کو دریا کے دوسرے کنارے پر ایک نیا شہزاد نگر آباد کرنے کا حکم دیا اور جب سب لوگ دریا پار کر گئے تو اپنے ہاتھوں سے نہ صرف اپنی حویلی بلکہ تمام شہر کو آگ لگا دی۔ ایک مدت تک کاوری کے بائیں کنارے پر بنا ہوا یہ اُجاڑ شہر طرح طرح کی داستانوں کا عنوان بنا رہا۔ اب بھی اگرچہ بیشتر مکانات اور گلیوں کے کھنڈر ہموار زمین میں تبدیل ہو گئے تھے مگر نواب صاحب کی حویلی کے کھنڈرات ابھی باقی تھے۔

میں ابھی پُرانے شہزاد نگر سے دس میل کے فاصلے پر تھا، چاندنی رات میں سیمنٹ کی پختہ سڑک دور دور تک سنسان نظر آ رہی تھی، میں نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے نگاہ اُٹھائی تو کوئی دو سو گز کے فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک کار کھڑی دکھائی دی، میں حیران ہی ہو رہا تھا کہ رات کے پونے بارہ بجے یہ کار یہاں کیوں کھڑی ہے کہ اچانک کار کی آڑ سے ایک آدمی نکل کر سڑک کے درمیان آ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ اوپر اُٹھاتے ہوئے مجھے رُکنے کا اشارہ کرنے لگا اگرچہ اس علاقے میں کوئی ایسی واردات سننے میں نہیں آئی تھی کہ جس میں گزرنے والوں کو کسی بہانے سے روک کر لوٹنے

کی کوشش کی گئی ہو۔ مگر ظاہر ہے کہ اس کا امکان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا یوں بھی ایک سنسان اور غیر آباد علاقے میں آدھی رات کے وقت آدمی کے ذہن کو طرح طرح کے وہم پریشان کر سکتے ہیں میں سوچ رہا تھا کہ کار روکوں یا دائیں جانب کاٹ کر تیزی سے آگے نکل جاؤں کہ قریب پہنچنے پر کار کی ہیڈ لائٹس اس شخص کے چہرے پر پڑیں شکل کچھ جانی پہچانی سی محسوس ہوئی اور میں نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔

اور پھر آپ میری حیرت کا اندازہ نہیں کر سکتے جب کار رُکنے پر میں نے اشرف کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔

"ارے اشرف!" میں نے دروازہ کھول کر جلدی سے نیچے اُترتے ہوئے کہا۔ "تم اس وقت یہاں کیسے؟"

مجھے پہچان کر اشرف کے چہرے پر پہلے شدید حیرت اور پھر مسرت کے تاثرات ظاہر ہوئے۔ "واللہ کمال ہو گیا منصور بھائی!" وہ بے اختیار مجھ سے لپٹتے ہوئے بولا۔ "اب تک تو صرف سُنا ہی تھا کہ مصیبت کے وقت خدا اپنی رحمت کے فرشتوں کو زمین پر بھیجتا ہے۔ مگر اس وقت یقین آ گیا، میں آدھ گھنٹے سے اس ویران سڑک پر کھڑا ہوا کسی کار یا ٹرک کے آنے کی دُعائیں مانگ رہا تھا۔ لیکن یہ گمان تک نہ تھا کہ میری دُعا تمہاری شکل میں پوری ہو گی۔"

"مگر تمہاری تو آج شادی تھی، یہاں کیا....."

"شادی ہی کے نتیجہ میں تو یہاں موجود ہوں!" اشرف نے مسکراتے ہوئے میری بات کاٹی۔ "بات یہ ہے کہ تمہاری بھابھی ایک نواب خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور اُن کے خاندان کی صدیوں پُرانی روایت ہے کہ کوئی نوابزادی شادی کی پہلی رات اپنی آبائی حویلی سے باہر نہیں گذار سکتی۔ چنانچہ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ ہم شادی کے جملہ مراحل سے فرصت پاتے ہی سیدھے اُن کی خاندانی حویلی کی جانب روانہ ہو جائیں گے جو ان اطراف میں کہیں واقع ہے میں نے ٹرین سے سفر کا انتظام بھی کر لیا تھا، مگر جب اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ آگے کہیں مین لائن پر مال گاڑی کے چند ڈبے اُلٹ جانے کی وجہ سے ٹرین تین گھنٹے لیٹ ہے چونکہ کچھ خاص رسومات کی ادائیگی کے لئے ہمیں رات کے بارہ بجے تک لازمی حویلی پہنچنا تھا اور ٹرین کا انتظار کرتے تو ایک ڈیڑھ بجے سے پہلے نہ پہنچ سکتے تھے اس لئے کار سے سفر کرنے کا قصد کیا۔ میں نے ملازم سے کہہ دیا تھا کہ وہ پٹرول کے دو تین ٹین زاید رکھ دے مگر شاید وہ کمبخت بھول گیا یہاں پہنچ کر پٹرول ختم ہو گیا۔ میں نے ڈکی میں ٹین دیکھے تو وہ بھی خالی ہیں اور ابھی منزلِ مقصود تمہاری بھابھی کے کہنے کے مطابق کم از کم آٹھ میل دور ہے۔ مگر یہ بتاؤ کہ تم اس وقت کہاں جا رہے تھے۔؟"

"اب میں سمجھا کہ مشیت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں شہزاد نگر کے ارادے سے تین بجے گھر سے روانہ ہوا تھا اور عام حالات میں پانچ بجے تک پہنچ جاتا۔ مگر بیٹری خراب ہو گئی۔ اور اُسے دوبارہ چارج کرانے میں اتنی دیر لگ گئی اگر ایسا نہ ہوتا تو یا تو تمہیں پیدل مارچ کرنا پڑتا یا پھر تمام رات یہیں پڑے رہتے۔"

"واقعی اسے تقدیری معاملات ہی کہہ سکتے ہیں، بہر حال اب تم مل گئے ہو تو میری تمام پریشانی ختم ہو گئی ہے۔ اُمید ہے کہ تم ہمیں لفٹ دینے سے انکار نہیں کرو گے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو بھائی! تمہارے لئے تو جان بھی حاضر ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس علاقہ میں ایک پُرانی حویلی کے کھنڈر تو ضرور باقی ہیں۔ مگر کوئی حویلی نہیں ہے۔"

"اس بارے میں زرتاج ہی بہتر بتا سکتی ہیں، کیونکہ میں تو یہاں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔"

"اُفوہ! تمہاری باتوں میں تو مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ ابھی بھابھی زرتاج کو بھی شادی کی مبارکباد دینی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور اشرف کی کار کی طرف چل دیا۔ زرتاج جو کار میں اسی جانب بیٹھی ہوئی تھی جس طرف سے میں آ رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی جلدی سے دوسری کھڑکی کی طرف سمٹ گئی، مجھے ایک بار پھر اس بات کا احساس ہوا کہ وہ کسی نامعلوم وجہ سے مجھے پسند نہیں کرتی اور میری تمام گرمجوشی ٹھنڈی پڑ گئی ——— "شادی مبارک ہو بھابھی!" میں نے زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا اور کھڑکی میں جھک کر دیکھا۔ مجھے یہ دیکھ کر کچھ حیرت ہوئی کہ خلاف توقع اسکے چہرے پر ایک بشاش مگر شرمیلا تبسم کھیل رہا تھا۔ "شکریہ۔" اُس نے بڑی میٹھی آواز میں جواب دیا۔

اور مجھے اپنی غلط فہمی پر ندامت محسوس ہونے لگی یقیناً دولہناپے کی شرم نے اُسے دوسری طرف ہٹنے پر مجبور کیا ہو گا، اتنی دیر میں اشرف بھی قریب آ گیا تھا، اُس نے کار کے سامنے سے گھوم کر دوسری کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے زرتاج کو نیچے اُترنے میں مدد دی اور پھر سہارا دے کر میری کار تک لایا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میں نے اسٹیرنگ وہیل سنبھالتے ہوئے گھوم کر دیکھا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا بھابھی کہ اس علاقہ میں کوئی دوسری

حویلی بھی موجود ہے۔" میں نے کہا۔" دریا کے اس پار تو البتہ نواب شہاب الدین صاحب......"

"نہیں، نواب شہاب الدین سے ہمارا کوئی تعلق نہیں" زرتاج نے جلدی سے بات کاٹی۔

"تب اس پار تو ایک پرانی حویلی کے کھنڈرات ہی ہیں اور ان کے بارے میں بھی میں نے صرف سنا ہی ہے۔ کبھی جا کر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"آپ شاید پہلے کبھی اس طرف نہیں آئے؟"

"نہیں، لڑکپن میں دو تین مرتبہ آنے کا اتفاق تو ہوا ہے مگر وہ اتنی مدت پہلے کی بات ہے کہ کچھ زیادہ یاد نہیں اور اس وقت بھی دریا کے اس جانب گھومنے پھرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" زرتاج نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "آپ کار چلائیں، میں راستہ بتاتی جاؤنگی۔"

ہم تقریباً سات میل تک اس سڑک پر چلتے رہے، اس کے بعد زرتاج نے مجھے بائیں جانب ایک کچے راستہ پر مڑنے کے لئے کہا۔ یہ کچی سڑک بظاہر درختوں کے ایک جھنڈ میں جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی لیکن درختوں سے آگے نکلتے ہی میری آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دریائے کاویری کے اس طرف بھی کوئی بستی آباد ہے مگر اس وقت میری نظریں ایک چھوٹے سے قصبے کو دیکھ رہی تھیں جسکی پختہ سڑکوں پر پرانی وضع کی لالٹینوں کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں سڑکیں ظاہر ہے کہ رات کے اس حصے میں سنسان تھیں مگر کہیں کہیں بھونکتے ہوئے کتوں کی آوازیں اور کسی کسی مکان میں نظر آنیوالی روشنی قصبے میں زندگی کا ثبوت دے رہی تھی۔

"یہ کونسا قصبہ ہے بھابھی؟" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"اسے تاج نگر کہا جاتا ہے۔" زرتاج نے جواب دیا۔ "اب جو چوراہا آئے آپ اس پر دائیں ہاتھ کو مڑ جائیں، وہ سڑک سیدھی ہماری حویلی تک جاتی ہے۔" میں نے ایسا ہی کیا۔ کچھ راستہ خاموشی میں طے ہوا۔ اچانک زرتاج نے سوال کیا۔ "غالباً آپ شہزاد نگر میں نواب شہاب الدین کی حویلی جا رہے تھے؟"

"جی ہاں!" مجھے اس کے اس سوال پر کچھ تعجب سا ہوا۔

"اور شاید ان کی بیٹی نیلوفر سے آپکی شادی کی بات چیت ہو رہی ہے۔" زرتاج کا دوسرا سوال تھا۔

"آپ کی یہ بات بھی درست ہے" میں نے بڑی حیرت سے جواب دیا۔ "مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ میں نے تو اس سلسلے میں اشرف کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"اس طرح کی باتیں اگر ایک طرف سے معلوم نہ ہوں تو دوسری جانب سے بھی معلوم ہو سکتی ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ نواب صاحب اور انکے گھر والوں کو بہت قریب سے جانتی ہیں۔"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"تب تو آپ نے نیلوفر کو بھی دیکھا ہو گا۔" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"آپ اس سلسلے میں مجھ سے زیادہ سوالات نہ کریں۔" زرتاج نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ "کیونکہ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر پردہ پڑا رہنا ہی اچھا ہوتا ہے اور نہ میں پسند کروں گی کہ آپ نواب کے گھر کے کسی فرد سے میرا ذکر کریں۔ آپ اشرف کے دوست ہیں اور اس دوستی کے تعلق سے میں آپ کو مشورہ دیتی ہوں کہ آپ اس لڑکی سے شادی کا خیال ترک کر دیں، وہ ہرگز آپ کے قابل نہیں ہے۔"

"آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ عجیب مشورہ سن کر میری کیا حالت ہوئی ہو گی اور میں کس طرح اسکی تفصیل جاننے کے لئے بیتاب ہو گیا ہوں گا۔ مگر اس سے پیشتر کہ میں کوئی سوال کرتا، زرتاج ایک بار پھر بولی۔ "بس کار یہیں روک لیں حویلی آ گئی ہے۔"

"میں نے چونک کر نگاہ اٹھائی۔ تو واقعی ایک عالیشان حویلی جو رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہی تھی میرے سامنے موجود تھی۔ آراستہ پھاٹک کھلا ہوا تھا اور خادموں کی ایک بڑی تعداد صف بستہ اپنی نوابزادی اور اسکے شوہر کے استقبال کے لئے موجود تھی، ایک بوڑھے ملازم نے آگے بڑھ کر بڑے مودبانہ انداز میں کار کا دروازہ کھولا۔ پہلے زرتاج اور اشرف کار سے باہر اترے، تمام ملازمین نے بیک وقت جھک کر انہیں سلام کیا۔ زرتاج ایک شان بے نیازی سے میری طرف گھومی۔ "آپ واپس چلے جائیں گے یا میں راستہ بتانے کیلئے کسی کو آپکے ساتھ بھیجوں۔"

میں تعجب سے اسکی صورت دیکھتا رہ گیا۔ نہ شکریہ نہ چند منٹ ٹھہرنے کی درخواست، اور تو اور اب اسکے چہرے کی وہ میٹھی مسکراہٹ بھی ایک شاہانہ تیوریں بدل کر رہ گئی تھی، گویا اب تک کا تمام التفات صرف اسلئے تھا کہ اسے میری کار کی ضرورت تھی، مجھے اسکی خود غرضی پر افسوس ہوا۔ اور سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ اشرف بول اٹھا غالباً ابھی وہ اتنا بے مروت نہیں ہوا تھا جتنا زرتاج اسے بنانا چاہتی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو زرتاج!" اس نے کچھ خفگی کے ساتھ کہا۔ "منصور کے اس وقت واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اتنی حویلی اتنی تنگ بھی نہیں کہ میرا ایک دوست یہاں ایک رات نہ گزار سکے۔" اور یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔ "تم نے ہماری بڑی مدد کی منصور۔ لیکن یہ نہ بھی ہوتا تو میں تمہیں اس وقت نہ جانے دیتا۔ آدھی رات بیت چکی ہے اس وقت جا کر نواب صاحب کو بے آرام کرنا مناسب نہیں، یہیں رک جاؤ، صبح چلے جانا۔"

زرتاج کی آنکھوں میں غصے کی لہر چمک آئی، یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اب وہ ملازموں کو حکم دینے والی ہے کہ وہ مجھے اٹھا کر قصبے سے باہر پھینکدیں۔ مگر اس نے عین وقت پر خود کو سنبھال لیا دفعتاً اسکے چہرے کے تاثرات بدلے، وہ بڑے دلآویز انداز میں مسکرائی ــــ "ڈیر اشرف! مجھے اتنا بداخلاق مت سمجھو، میں بھی سمجھتی ہوں کہ منصور صاحب تمہارے دوست ہیں، انہوں نے ہماری مدد بھی کی ہے، دوستی اور احسانمندی کا تقاضہ ہے کہ وہ یہ رات ہی نہیں کچھ اور وقت بھی ہمارے ساتھ گزاریں۔ مگر میں مجبور ہوں۔ ہم یہاں اپنی صدیوں پرانی مقدس رسومات ادا کرنے آئے ہیں اور ان کی ایک لازمی شرط یہ ہے کہ حویلی میں ہمارے اہل خاندان کے علاوہ کسی اور فرد کو موجود نہیں ہونا چاہئے اور یہ بات میں تمہیں اچھی طرح بتا چکی ہوں کہ مجھے اپنی خاندانی روایات دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہیں، انکی ادائیگی کے بغیر میں تمہاری نہیں بن سکتی منصور صاحب یقیناً ہمارے مہمان بنیں گے۔ مگر آج کی رات نہیں۔" وہ میری طرف گھومی۔ "اگر میری کسی بات سے آپ کو دکھ پہنچا ہو تو معذرت خواہ ہوں اور درخواست کرتی ہوں کہ آپ کل سے ایک ہفتے تک جب تک ہمارا قیام اس حویلی میں رہے گا۔ ہمیں اپنی میزبانی کا موقع دیں۔"

اشرف اب بھی تذبذب میں تھا زرتاج نے بظاہر بڑے نرم الفاظ استعمال کئے تھے مگر اشرف ہی نہیں میں بھی انکے پیچھے چھپی ہوئی دھمکی کو محسوس کر رہا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر اشرف نے اپنی بات پر اصرار کیا تو وہ زرتاج کو حاصل نہیں کر سکے گا۔ میں نے دوست اور محبوبہ میں سے کسی ایک کے انتخاب کی آزمائش میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ "بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" میں جلدی سے بولا۔ "یوں بھی آج کی رات تمہاری اپنی رات ہونی چاہیے۔" میں مسکرایا۔ "میرا اس وقت واپس جانا ہی بہتر ہے"

"مگر وعدہ کرو کہ کل ضرور آؤ گے اور ایک ہفتہ ہمارے ساتھ رہو گے۔" اشرف نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"آنے کا وعدہ تو کر سکتا ہوں مگر تم جانتے ہو کہ میں پہلے ہی نواب صاحب کے یہاں مدعو ہوں اسلئے ٹھہرنے کے سلسلے میں کسی پروگرام پر ہم اس وقت نہیں کل بات کریں گے۔"

میں نے اشرف سے ہاتھ ملایا اور اپنی کار میں آ بیٹھا زرتاج تو کار کے چلتے ہی اشرف کا ہاتھ پکڑ کر اپنے خادموں کے جلو میں حویلی میں داخل ہو گئی مگر اس کا بوڑھا ملازم بڑی دیر تک پھاٹک کے پاس کھڑا ہوا مجھے جاتے دیکھتا رہا۔ میں وہاں سے چل تو دیا تھا۔ مگر میرا ارادہ ہرگز واپس جانے کا نہیں تھا۔ زرتاج کا طرز عمل مجھے شروع ہی سے مشکوک بنا چکا تھا اور اس وقت تو وہ بڑی پراسرار معلوم ہو رہی تھی، میں نہیں سمجھتا تھا کہ تاریخ کے کسی دور میں کسی بھی شاہی یا نوابی خاندان میں ایسی روایات رہی ہوں جنکی اہمیت اتنی زیادہ ہو جتنی زرتاج نے ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی، اس کا باتسلسل تنہا ہونا، اشرف کو بھی اسکے عزیزوں اور دوستوں سے الگ رکھنے کی کوشش کرنا، شادی کی پہلی رات ایک ایسی حویلی میں گزارنے کیلئے لانا جس کا کم سے کم مجھے کوئی علم نہیں تھا اور پھر روایات کیلئے "مقدس" کا لفظ استعمال کرتے ہوئے انہیں اتنی اہمیت دینا کہ اصل شادی بھی انکی عدم تعمیل سے خطرے میں پڑ سکتی ہو مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب اور غیر معمولی سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے میں ان "مقدس" رسومات کو ضرور دیکھونگا جنکے لئے زرتاج میرے دوست کی محبت بھی ٹھکرا سکتی ہے۔

دو فرلانگ آگے جا کر میں نے کار ایک تاریک گلی میں کھڑی کر دی، خود مکانات کی آڑ لیتا ہوا حویلی کی جانب لوٹ گیا پھاٹک بند تھا مگر یہ بات میں پہلے ہی نوٹ کر چکا تھا کہ حویلی کے چاروں طرف کھنچی ہوئی چہار دیواری جس میں پھاٹک لگا ہوا تھا زیادہ بلند نہیں تھی اور پھاٹک میں نکلی ہوئی موٹی موٹی کیلوں پر پیر رکھ کر اسکے اوپر چڑھا جا سکتا تھا چنانچہ مجھے دوسری جانب پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی، خوش قسمتی سے کوئی ملازم آس پاس موجود نہیں تھا اور میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر حویلی میں داخل ہو گیا۔ بارہ دری بالکل خالی نظر آ رہی تھی، کئی راہداریوں میں گھوم پھر کر میں نے مختلف کمروں میں آہٹ لینے کی کوشش کی مگر کہیں سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ آخر وہ سب کہاں غائب ہو گئے تھے۔

آہستہ آہستہ میں حویلی کے عقبی کمروں کی جانب بڑھا، ابھی راہداری میں چلتے ہوئے میں دائیں جانب گھومنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میں نے ایک کمرے سے زرتاج اور اسکے بوڑھے ملازم کو باہر نکلتے دیکھا وہ دونوں کسی طرف دیکھے بغیر چند قدم چل کر ایک دوسرے کمرے میں داخل

ہو گئے۔ میں نے چند لمحے کسی اور ملازم کے باہر آنے کے انتظار میں توقف کیا اور پھر تیزی سے لپک کر اس کمرے پر پہنچا جہاں سے وہ نکلے تھے کواڑ نیم وا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا اشرف ایک نہایت پُر تکلف کمرے میں مسہری پر آنکھیں بند کئے لیٹا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا اور اُس کمرے میں جھانکا۔ جس میں زرتاج اور بوڑھا ملازم گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کمرے کے وسط میں پتھر کا بنا ہوا قدیم وضع کا ایک بہت پُرانا آتشدان رکھا ہوا ہے اُس کے سامنے تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچی اور پانچ فٹ لمبی پتھر کی بنچ پڑی ہے جس پر پتھر ہی کے بنے ہوئے تین پیالے نظر آرہے تھے بوڑھا ملازم ایک طرف کھڑا تھا اور زرتاج الماری سے شیشے کی صراحی نما بوتل نکال کر بنچ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بوتل میں گہرے سبز رنگ کی کوئی سیال سی چیز نصف کے قریب بھری ہوئی تھی زرتاج نے وہ بوتل بھی بنچ پر رکھ دی جس سے مجھے خیال ہوا کہ وہ پیالے بھی غالباً الماری سے نکالے گئے ہیں، اتنی دور سے میں یہ دیکھنے سے قاصر تھا کہ وہ خالی ہیں یا اُن میں بھی کوئی چیز رکھی ہوئی ہے، بوتل رکھ کر زرتاج نے بوڑھے ملازم کی طرف دیکھا، ملازم مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ اور آتش دان کے دوسری جانب بنچ کے بالمقابل جا کر رُک گیا اُس نے دونوں ہاتھ دُعائیہ انداز میں سر سے اوپر بلند کئے اور میں نے اُسکے ہونٹوں کو اس طرح ہلتے دیکھا جیسے وہ منہ ہی منہ میں کچھ خاص الفاظ ادا کر رہا ہو۔ میں ابھی حیرت سے اُسکی ان حرکات کا کوئی مطلب اخذ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک آتش دان میں شعلے بھڑک اُٹھے، یہ شعلے اتنے بلند تھے کہ اُنہوں نے کچھ دیر کیلئے بوڑھے ملازم کو اپنی سُرخ چادر میں چھپا لیا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ اُن کی اونچائی کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ وہ چند انچ سے زیادہ نہیں رہ گئے، میں اُنہیں دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ دوسری طرف کھڑے ہوئے ملازم پر غور نہیں کر سکا، لیکن جب آگ نے مزید کم ہونا بند کر دیا اور شعلے مسلسل اسی بلندی کے ساتھ بھڑکتے رہے تو میں نے نگاہ اُٹھائی اور حیرت سے میری آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔

بوڑھے ملازم کی جگہ اب ایک انتہائی خوبصورت نوجوان شاہانہ لباس پہنے کھڑا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں کہ کہیں مجھے نظری دھوکا تو نہیں ہو رہا ہے، کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید ملازم کسی اور طرف موجود ہو اور اس خوبصورت نوجوان نے کمرے کے کسی اور دروازے سے نکل کر اُس کی جگہ لے لی ہو مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی بوڑھا غائب تھا اور اس دروازے کے علاوہ جس کے باہر میں کھڑا ہوا تھا کوئی اور دروازہ بھی کمرے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

نوجوان کی آنکھیں بند تھیں، ہاتھ سر سے اوپر اُٹھے ہوئے تھے اور گلے میں ایک لمبی سی سیاہ موتیوں کی مالا پڑی جھول رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اُس نے آنکھیں کھولیں، ہاتھ نیچے کئے اور گھوم کر زرتاج کی طرف دیکھا جو کسی سحر زدہ معمول کی طرح ٹکٹکی باندھے اُسے گھور رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ وہ جوان بجید حسین اور جاذب نظر ہے۔ مگر اُسکی خوبصورتی میں ایک طرح کی کرختگی چھپی ہوئی تھی۔ اُسکے گھومتے ہی زرتاج دونوں ہاتھ پھیلا کر بے اختیار آگے بڑھی اور نوجوان سے چمٹ گئی۔ میں اُسکی تیز سانسوں اور دبی ہوئی سسکاریوں کی آواز کمرے کے باہر بھی بخوبی سُن رہا تھا۔ وہ اُسے دیوانوں کی طرح چوم رہی تھی، پیار کر رہی تھی۔ اور یوں سمٹی جا رہی تھی جیسے اُسکے اندر سما جانا چاہتی ہو۔

"احمق مت بنو زرتاج!" نوجوان نے اُسے دھکا دے کر اپنے آپ سے دور کر دیا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ قربانی دیئے بغیر تم میرا قرب برداشت نہیں کر سکتیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" زرتاج نے ایک گہری سانس لے کر اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ سلسلہ کب تک چلتا رہیگا میں اس کھیل سے اُکتا چکی ہوں۔"

"کیوں، کیا تم یہ لازوال حسن و شباب پا کر مطمئن نہیں ہو؟"

"مگر میری تشنگی؟"

"میں نے تم پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی۔ تم جتنے کھلونوں سے چاہو اپنا دل بہلا سکتی ہو!"

"جان بوجھ کر انجان مت بنو۔ یہ کھلونے اگر میرے کام آسکتے تو مجھے تم سا اپنی روح کا سودا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" زرتاج نے تلخ لہجے میں کہا۔ "آخر کب تک مجھے ہر سال محبت کا یہ ڈھونگ رچانا پڑیگا؟"

"یہ بھی تمہیں کتنی ہی بار بتا چکا ہوں" نوجوان نے اپنے گلے سے مالا اُتارتے ہوئے جواب دیا۔ جب تک اس مالا میں ایک ہزار موتی نہیں پروئے جاتے تم یہ قربانیاں دیتی ہی رہو گی۔ ابھی تو اس میں دو سو سے کچھ اوپر ہی دانے آئے ہیں اور تم ابھی سے گھبرائی جا رہی ہو۔ بہرحال بیکار باتوں میں وقت ضائع مت کرو، یہ مالا لو اور اپنے ایک رات کے دولہا کے پاس جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری تلاش میں یہاں آنکلے ـــ اور تمہاری باتیں سُن لے۔"

میں انتہائی حیرت کے عالم میں ان دونوں کی گفتگو سُن رہا تھا مگر کوئی ایک بات بھی میرے پلّے نہیں پڑ رہی تھی زرتاج نوجوان کے ہاتھ سے مالا لے کر دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ قریب ہی ایک کمرہ اور تھا میں نے اُسکے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ اندر کی جانب کُھلتا چلا گیا۔ میں پھرتی سے کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر دیا۔ مگر اس طرح کہ ایک باریک جھری میرے دیکھنے کیلئے باقی رہے۔

زرتاج مالا گلے میں ڈالے کمرے سے باہر نکلی اور جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہوئے اشرف کے کمرے میں چلی گئی میرا خیال تھا کہ اسکے پیچھے وہ نوجوان بھی شاید ایک مرتبہ پھر بوڑھے ملازم کے روپ میں نمودار ہوگا۔ مگر چند منٹ تک کوئی باہر نہیں نکلا تو میں نے دبے پاؤں اپنی پناہ گاہ سے نکلکر اس کمرے میں جھانکا۔ آتش دان میں آگ بدستور دہک رہی تھی، بنچ پر تین پیالے اور صراحی بھی موجود تھی مگر اُس نوجوان کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

میں اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ اس حویلی میں کوئی شیطانی کھیل کھیلا جا رہا ہے جس کے نتیجہ میں میرے دوست اشرف کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے مگر اس کی نوعیت کیا ہے، زرتاج اصل میں کون ہے، وہ نوجوان کون تھا، وہ مالا کیسی تھی، زرتاج کس تشنگی کا ذکر کر رہی تھی اس نے اپنی روح کے بدلے کس قسم کا سودا کیا ہے؟ یہ ایسے سوالات تھے جن کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں راہداری میں کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کروں اور کس طرح اشرف کو اس خطرے سے آگاہ کر دوں جس میں اپنی حماقت سے اُس نے خود کو مبتلا کر لیا تھا کہ اچانک قدموں کی آہٹ سُنائی دی، میں ایک مرتبہ پھر اس کمرے میں آگیا۔ میں دروازے کی جھری میں سے دیکھ رہا تھا کہ زرتاج اشرف کا ہاتھ پکڑے باہر آئی، مالا اب اشرف کے گلے میں پڑی ہوئی تھی اور وہ یوں قدم اُٹھا رہا تھا جیسے عالم خواب میں چل رہا ہو۔ ایک نظر اُسکے چہرے کو دیکھنا میرے لئے کافی تھا، میں نے سمجھ لیا کہ وہ اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہے، یا تو زرتاج نے اُس پر جادو کر دیا ہے، یا پھر یہ مالا اُسے اسی لئے پہنائی گئی ہے کہ وہ کوئی مزاحمت نہ کر سکے۔ زرتاج اشرف کا ہاتھ پکڑے اُسے آتش دان والے کمرے میں لے گئی ان دونوں کے اندر جاتے ہی میں جلدی سے باہر نکلا زرتاج نے دروازہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، ایک کواڑ پورا کُھلا ہوا تھا اور دوسرا نیم وا تھا۔ میں دوسرے کواڑ کی آڑ میں کھڑا ہو گیا زرتاج اور اشرف پتھر کی بنچ کے پاس آتش دان کی طرف منہ کئے کھڑے تھے۔ "تم مجھ سے محبت کرتے ہو اشرف؟" زرتاج نے پوچھا۔

"اتنی کہ آج تک کسی نے کسی سے نہیں کی ہو گی!"

"مجھے حاصل کرنے کیلئے کیا کچھ کر سکتے ہو؟"

"اپنی زندگی بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

"کیا اپنی روح بھی میرے حوالے کر سکتے ہو؟"

"بڑی خوشی سے۔"

"قسم کھاتے ہو؟"

"ہاں میں قسم کھاتا ہوں۔"

"تو پھر آؤ، اس مقدس آگ کے سامنے جھک کر اپنے اس عہد کو دوہراؤ کہ میں تمہارے جسم اور تمہاری روح کی مالک ہوں۔"

وہ دونوں آتشدان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ اشرف نے زرتاج کے کہے ہوئے الفاظ دُہرائے، زرتاج نے صراحی میں بھرا ہوا سبز رنگ کا سیال دو پیالوں میں اُنڈیل لیا۔ ایک پیالہ خود لیا اور دوسرا اشرف کو دیا۔

"اسے پی جاؤ، یہ تمہیں مجھ سے قریب کر دیگا۔" وہ بولی۔

اشرف نے بلا تامل پیالہ منہ سے لگایا اور چند گھونٹوں میں خالی کر دیا۔ زرتاج نے اپنے حصے کا مشروب پیا اور پیالہ بنچ پر رکھتے ہوئے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا۔ پھر جو اس کا ہاتھ باہر نکلا تو اس میں خنجر دبا ہوا تھا، مجھے ایک دم سے احساس ہوا کہ اب وہ اُسے قتل کرنا چاہتی ہے، اور میں نے چاہا کہ زرتاج کے ہاتھ سے خنجر چھین لوں، پھر خواہ کچھ ہو۔ مگر میں نے قدم اُٹھانا چاہے تو یوں لگا جیسے اُنہیں زمین نے پکڑ لیا ہو، یا پھر خود میرے اندر حرکت کرنے کی طاقت نہ رہی ہو۔

"اپنا ہاتھ لاؤ اشرف! میں تمہارے خون سے تمہارے عہد پر مہر تصدیق ثبت کرنا چاہتی ہوں۔" زرتاج کہہ رہی تھی۔

میرے دیکھتے دیکھتے اس نے خنجر کی نوک سے اشرف کی دونوں کلائیوں کی شہ رگ کاٹ دی۔ اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر تیسرے پیالے پر اُلٹ دیا۔ اور دوسری کلائی کے زخم پر خود اپنا منہ رکھ دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرا دوست موت کے منہ میں جا رہا ہے، ابھی سے اُسکے سُرخ و سفید چہرے کا رنگ زرد پڑنے لگا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ خود کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کی مگر بے کار، میں اپنا ایک ہاتھ بھی ہلانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

چند لمحوں کے بعد زرتاج نے اپنا منہ اُٹھایا تو اس کے ہونٹ خون سے سُرخ ہو رہے تھے اس کے چہرے پر اتنی درندگی اور

سفاکی جھلک رہی تھی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اچانک اُس نے اپنا ہاتھ اشرف کے سینے کی طرف بڑھایا۔ گھبراہٹ اور خوف کے عالم میں مجھے کچھ اور نہیں سوجھا تو میں نے آیتہ الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ میری نظریں زرتاج کے ہاتھ پر جمی ہوئی تھیں اُس نے اشرف کے سینے سے ہاتھ اُٹھایا تو اس کی مٹھی بند تھی' مجھے محسوس ہوا جیسے اُس کی بند مٹھی میں کوئی شے تڑپ رہی ہے۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے اشرف کی گردن سے مالا اُتاری' مالا میں ڈوری کا بڑا حصہ موتیوں سے خالی تھا' زرتاج نے خالی ڈوری کو اپنی بند مٹھی میں پکڑ لیا اور پھر جو مٹھی کھولی تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک اور سیاہ موتی نظر آرہا ہے۔ اشرف پتھر کے کسی بے جان مجسّمے کی طرح دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا سر ڈھلک کر اسکے سینے سے آلگا تھا۔

اس درمیان میں میں پوری آیتہ الکرسی پڑھ چکا تھا۔ آخری سیت کے آخری الفاظ منہ سے نکلتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں کسی بندش سے آزاد ہوگیا ہوں۔ میں نے قدموں کو جنبش دی اور یہ دیکھ کر اچھل پڑا کہ اب وہ آگے بڑھ سکتے تھے میں بلا سوچے سمجھے کمرے میں دوڑتا چلا گیا۔ زرتاج نے میری طرف دیکھا' ایک لمحے کے لئے اُس کی آنکھوں میں حیرت اور پھر خوف کے ملے جلے تاثرات جھلکے۔ مالا اسکے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ مگر دوسرے لمحے اُس نے بنچ پر رکھا ہوا خنجر اُٹھا لیا اور ہاتھ بلند کئے میری طرف لپکی میں اب بھی آیتہ الکرسی پڑھ رہا تھا۔ اُس کے خنجر کی زد سے بچنے کے لئے میں نے پیچھے ہٹنا چاہا۔ مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی ابھی وہ میرے قریب بھی نہیں پہنچی تھی کہ اس طرح لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی جیسے کسی نے اُسے پوری طاقت سے دھکا دیدیا ہو' ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑا اور وہ پلٹ کر بے تحاشا بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میں اس کے پیچھے دوڑا' وہ حویلی کے عقبی حصّے کی طرف بھاگ رہی تھی اچانک راہداری ایک دیوار تک جا کر ختم ہوگئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب وہ بچ کر نہیں جا سکتی۔ لیکن اُس نے ایک اُبھری ہوئی اینٹ کو دبایا اور دفعتاً دیوار میں ایک خلا نمودار ہوگیا' وہ تیزی سے اُسکے اندر گھس گئی۔ میں دس پندرہ قدم پیچھے تھا' مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے پہنچنے تک وہ خفیہ دروازہ بند نہ ہو جائے لیکن زرتاج عجلت میں اُسے کھلا ہی چھوڑ گئی تھی میں بھی دوسرے لمحے بھاگتا ہوا اندر داخل ہو چکا تھا' آگے کچھ سیڑھیاں تھیں۔ میں گرتے گرتے بچا۔ سنبھل کر زینہ طے کیا' نیچے پہنچا تو ایک سرنگ نما راستہ میرے سامنے موجود تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک لالٹین ٹمٹما رہی تھی' نیم تاریکی میں حتی الامکان احتیاط سے

قدم اُٹھاتے ہوئے میں آگے بڑھا۔ چاروں طرف سے بند ہونے کے باوجود ہوا میں گھٹن کا احساس نہیں تھا بلکہ ایک طرح کی تازگی اور نمی محسوس ہو رہی تھی کوئی سو گز بھاگنے کے بعد سرنگ ختم ہوگئی اور مجھے ایک دروازہ نظر آیا جو نصف کے قریب کھلا ہوا تھا۔ میں جلدی سے باہر نکلا تو خود کو دریائے کاویری کے سامنے کھڑا پایا۔ مجھ سے چند قدم آگے زرتاج کھڑی ہوئی تھی اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر ایک دم سے دریا میں کود گئی۔ میں تیزی سے لپکا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھا۔ مگر دریا کی ہموار سطح پر تموج کا کوئی نشان تک نظر نہیں آیا۔

یہ یقین کرنے کے بعد کہ زرتاج سچ مچ دریا میں ڈوب گئی ہے میں اسی سرنگ نما راستے سے حویلی میں واپس آیا۔ آتشدان کے کمرے میں اشرف اُسی طرح پتھر کا بُت بنا ہوا۔ بنچ کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا۔ مگر آتشدان کی آگ بجھ چکی تھی' میں نے اشرف کو آواز دی' اُس نے کوئی جواب نہیں دیا میں نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا میرے ہاتھ لگتے ہی وہ ریت کے گھروندے کی طرح فرش پر بکھر گیا میں نے جھک کر اُسکی نبض اور پھر دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ مر چکا تھا گہری افسردگی کے ساتھ میں نے بنچ پر نظر ڈالی تینوں پیالے اور صراحی اُسی طرح رکھے ہوئے تھے' تیسرے پیالے میں اشرف کا جما ہوا خون کنارے تک بھرا تھا' فرش پر ایک جانب کالے موتیوں کی مالا پڑی تھی اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر زرتاج کا خنجر۔ میں نے مالا اُٹھا کر دیکھی اور پہلی مرتبہ نوٹ کیا کہ اس میں پڑے ہوئے موتی انسانی دل کی شکل کے ہیں اُنکی جسامت مٹر کے ایک بڑے دانے کے برابر تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ اشرف کی موت کے باوجود میرا پہلا فرض یہ ہے کہ میں شہزاد نگر جا کر وہاں کی پولیس کو ان واقعات کی اطلاع دوں۔ اگرچہ مجھے شک تھا کہ وہ لوگ میری اس داستان پر یقین کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں گے۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیا اشرف کی لاش یہیں چھوڑ جاؤں یا اپنے ساتھ شہزاد نگر لیجاؤں' شاید اسکے جسم میں خون داخل کر کے اور دل کی مصنوعی حرکت جاری کر کے اُسے زندگی کی طرف واپس لایا جاسکے۔ لیکن شہزاد نگر جیسے چھوٹے شہر میں یہ طبی سہولتیں ملنا ممکن نہیں تھا۔ پھر وقت اتنا گزر چکا تھا (شہزاد نگر پہنچنے میں اور تاخیر ہوتی) کہ اب کوئی علاج' و معالجہ اُسے زندہ نہیں کر سکتا تھا' اس کے علاوہ مجھے یاد آیا کہ پولیس لاش کا مقام واردات سے ہٹایا جانا پسند نہیں کرتی۔

میں کمرے سے باہر نکل آیا اس وقت مجھے قطعی احساس نہیں تھا کہ مالا میرے ہاتھ میں دبی ہوئی ہے' میں اپنی کار تک پہنچا' دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تو مالا نظر آئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس مجھ پر کوئی شہادت اِدھر سے اُدھر کرنے یا ناجائز طور پر اپنے قبضہ میں رکھنے کا الزام عائد کرے چنانچہ میں مالا اسی کمرے میں ڈالنے کی غرض سے واپس حویلی کی طرف چلا' ان پُراسرار واقعات میں میرا ذہن اس درجہ کھویا ہوا تھا کہ کار کی جانب آتے ہوئے مجھے اپنے گردو پیش کا کوئی احساس نہیں تھا اب جو میں نے گھوم کر نگاہ اُٹھائی تو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا' وہ راستے وہ روشنیاں' وہ آباد شہر سب کچھ چشم زدن میں غائب ہو چکا تھا۔ میں ایک کھلے میدان میں کھڑا تھا اور میرے ارد گرد اونچے نیچے ٹیلوں کے سوا اور کچھ چیز نہیں تھی' البتہ کچھ فاصلے پر ایک حویلی کے کھنڈرات ضرور نظر آرہے تھے میں بھاگ کر ان کھنڈرات میں پہنچا اور بڑی دیر تک اِدھر اُدھر تلاش کرتا رہا۔ مگر آتشدان کا کمرہ کیا۔ کمروں کے نشانات تک معدوم تھے مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ اشرف کی لاش کا بھی کوئی پتہ نہیں تھا۔

میں ڈگمگاتے قدموں سے بڑی مشکل سے کار تک آیا اور دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر لڑھک گیا' ان پے در پے واقعات نے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں بیکار کر دی تھیں' ذہن کسی گہری دھند میں لپٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا' میں نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر کیلئے بالکل خالی الذہن ہو کر لیٹ گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں کتنی دیر تک اسی طرح اگلی سیٹ پر لیٹا رہا آخر جب طبیعت کچھ پرسکون ہوئی تو میں نے سوچنا شروع کیا' میں اب پولیس کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ اپنے بیان کے ثبوت میں میرے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ پولیس میں رپورٹ کرنے کا مطلب اپنا مضحکہ اُڑوانے یا اپنے ذہنی توازن کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تو چونک سا گیا۔ میں اس سیاہ موتیوں والی مالا کو تو بھول ہی گیا تھا۔ پتہ نہیں اپنی کھوئی ہوئی کیفیت میں کس وقت اسے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا' اب جو سگریٹ کیس نکالا تو اسکے ساتھ مالا بھی چلی آئی' اگر میرے مشاہدات کوئی نظری فریب یا خواب تھے تو یہ مالا میرے پاس کہاں سے آسکتی تھی' زرتاج کے گزشتہ طرزِ عمل کی روشنی میں میں نے ان واقعات پر غور کیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ ضرور اُن کی تہہ میں کوئی پُراسرار حقیقت پوشیدہ ہے۔ مگر مصلحت یہی تھی کہ میں سردست اُن کے بارے میں خاموشی اختیار کر لوں میں نے مالا کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی' سگریٹ سلگا کر کار اسٹارٹ کی اور مین روڈ پر واپس آتے ہوئے شہزاد نگر کی جانب روانہ ہوگیا۔

[illegible] ٹھنے کا تھا۔ مگر نواب صاحب کی محبت اور شفقت آمیز اصرار نے ایک ہفتہ سے پہلے رخصت ہونے کی اجازت نہیں دی' اُن کی حویلی بلاشبہ ایک قدیم طرز کی عمارت تھی مگر اُنہوں نے اس کے بڑے حصہ میں جزوی تبدیلیاں کر کے اُسے ایک کوٹھی کی شکل دیدی تھی حویلی میں نواب صاحب' اُنکی بیگم اور تین بچوں کے علاوہ ملازموں کی خاصی تعداد رہتی تھی' بچوں میں نیلوفر سب سے بڑی تھی اس سے چھوٹا ایک لڑکا تھا آفتاب' جو مقامی کالج میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا اور اس سے چھوٹی بارہ تیرہ سال کی ایک اور لڑکی ثریا تھی' سب لوگ ایک ہی دن میں مجھ سے اتنے مانوس ہوگئے کہ میں ابھی سے اُن کے گھر کا ایک فرد معلوم ہونے لگا تھا۔ اُن کا طرزِ زندگی اور حویلی کا ماحول جیسا کہ میرا اندازہ تھا نوابی یا جاگیردارانہ قطعی ثابت نہیں ہوا۔ وہ بالکل ہمارے گھر کی طرح ایک ایسا خاندان معلوم ہوتا تھا جس میں مشرقیت کی روح برقرار رکھتے ہوئے جدید طرز کی زندگی کو اپنانے کی کوشش کی گئی تھی نیلوفر کی شکل و صورت کے بارے میں مجھے یہ بدگمانی تو کبھی نہیں تھی کہ وہ کوئی بدصورت لڑکی ہوگی لیکن آفتاب اور ثریا کو دیکھنے کے بعد میں نے اس بارے میں بھی بڑی اچھی رائے قائم کی تھی اور جب تک حویلی میں رہا دل میں ایک دبا دبا سا اشتیاق محسوس کرتا رہا کہ کاش کبھی نیلوفر کی ایک ہلکی سی جھلک ہی نظر آجائے بہ حیثیت مجموعی ان لوگوں کے درمیان ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس اہم معاملہ میں بھی میرے والدین کا فیصلہ جو انہوں نے چاہا تو بہتر ہی ثابت ہوگا۔

اس رات میں تقریباً ڈھائی بجے حویلی پہنچا تھا ظاہر تھا کہ میں نواب صاحب کو زرتاج اور اشرف کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتا تھا اس لئے میں نے رانی باغ کے غدر کی کو بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا البتہ دوسرے دن اور اسکے بعد ہر دن روزانہ صبح اخبار کے ایک ایک کالم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا کہ شاید اس میں اشرف اور زرتاج کے بارے میں کوئی خبر شائع ہوئی ہو۔ مگر کوئی بڑی خبر نظر آنا تو در کنار کہیں ایک کالمی سُرخی بھی دکھائی نہیں دی۔ میں حیران تھا کہ اگر اس رات تاج نگر کی حویلی میں پیش آنے والے واقعات حقیقت تھے (جس کا اب مجھے یقین ہوگیا تھا) تو پھر جمشید آباد میں اشرف کی اتنی معمولی حیثیت تو نہیں تھی کہ اُسکی اور زرتاج کی پُراسرار گمشدگی کا کوئی ردعمل ہی ظاہر نہ ہو آخر کافی سوچنے پر یہ بات سمجھ میں آئی کہ ممکن ہے اسکی وجہ یہ ہو کہ چونکہ وہ دونوں گھر سے ہنی مون منانے نکلے تھے' اسلئے ہفتہ عشرہ تک اُن کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملنے پر کسی کو فکر اور پریشانی نہیں ہو سکتی مالا کو میں نے حفاظت سے اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیا تھا تقریباً ہر رات کو سونے سے پہلے میں اُسے نکال کر دیکھتا اور پھر بڑی دیر تک ان پُراسرار واقعات کے متعلق سوچتا رہتا جن کے نتیجے

میں وہ میرے قبضہ میں آئی تھی اُسے چھوتے ہوئے مجھے ایک عجیب سی بے چینی اور دل گرفتگی کا احساس ہوتا، میں نے زرتاج کی مٹھی میں کوئی چیز پھڑپھڑاتے دیکھی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ اشرف کا دل تھا جسے زرتاج نے کسی پُراسرار عمل کے ذریعہ اُسکے سینے سے نکال لیا اور پھر وہی دل ایک اور سیاہ موتی بن کر اس مالا میں پرو دیا گیا تھا، میں سوچتا کہ اگر اس مالا کے تمام موتی کسی نہ کسی انسان کے دل ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ زرتاج اب تک دو سو تیرہ نوجوانوں کو قربان کر چکی ہے (مالا میں دو سو تیرہ موتی تھے)

جب تک میں شہزاد نگر میں رہا، دو تین مرتبہ سیر کے بہانے دریائے کاویری کے دوسرے کنارے پُرانے شہزاد نگر کے کھنڈرات میں بھی گیا مگر وہاں مجھے اس رات کے واقعات کی کوئی اور شہادت نہ مل سکی، حویلی کے کھنڈرات اپنی ہیئت اتنی زیادہ تبدیل کر چکے تھے کہ اُنہیں دیکھ کر یہ اندازہ بھی لگانا ناممکن تھا کہ یہ اسی حویلی کے کھنڈرات ہو سکتے ہیں یا نہیں جسے میں نے اس رات دیکھا تھا، مختلف لوگوں سے پوچھنے پر اس بات کی بھی تصدیق نہ ہو سکی کہ یہاں کبھی تاج نگر کا کوئی شہر آباد تھا لیکن اسکے باوجود مجھے یقین تھا کہ میں نے جس آباد بستی کو دیکھا تھا وہ اسی مقام پر تھی، ایک دن باتوں باتوں میں میں نے نواب صاحب سے بھی تاج نگر کے بارے میں سوال کیا، وہ نام سُن کر کچھ چونکے ضرور لیکن اس بات سے اُنہوں نے بھی انکار کیا کہ دریائے کاویری کے اُس کنارے پر کبھی اس نام کی کوئی بستی موجود تھی۔

ایک ہفتہ بعد میں دھام پور واپس آگیا، امی اور ابا جان کو اپنے تاثرات سے آگاہ کیا اور اُنکے اصرار کے باوجود رخصت ختم ہونے سے دو دن قبل ہی جمشید آباد چلا گیا۔ جہاں تک شادی کا سوال تھا میں نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے مگر اتنی مہلت ضرور چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں اپنے طور پر کچھ انتظامات کر سکوں، مجھے ابا جان کی مالی حیثیت کا علم تھا، ہم لوگ زیادہ مالدار تو کبھی بھی نہیں رہے تھے پھر بھی جو تھوڑا بہت بینک بیلنس اور جائیداد تھی وہ میرے انگلینڈ جانے اور وہاں کے تعلیمی اخراجات کے سلسلے میں ختم ہو چکی تھی اور ابا جان کے پاس ایک رہائشی مکان اور پنشن کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا ان حالات میں میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری شادی کے سلسلے میں مزید زیر بار ہوں میری خواہش تھی کہ میں اپنی تنخواہ سے اتنی رقم پس انداز کر لوں جو گھر کی درستگی کچھ فرنیچر اور سامان آرائش کی خرید اور پھر شادی کے اخراجات کیلئے کافی ہو سکے۔ امی تو بضد تھیں کہ خواہ کچھ بھی کرنا پڑے لیکن وہ بہو جلد گھر لے آئیں

زیادہ انتظار نہیں کر سکتیں مگر ابا جان صورت حال کو سمجھ رہے تھے اُنہوں نے امی کو بھی قائل کر لیا کہ اگر نواب کی بیٹی لانا چاہتی ہو تو لڑکے کو اُس کے شایان شان انتظام کرنے دو۔

جمشید آباد پہنچتے ہی میں سیدھا اشرف کے گھر گیا میرا اندازہ تھا کہ اشرف خواہ کتنی ہی طویل مدت تک ہنی مون منانے کا پروگرام بنا کر گھر سے کیوں نہ چلا ہو لیکن اُسکی والدہ اور دوسرے عزیز یقیناً اب تک اُسکی جانب سے کوئی اطلاع نہ ملنے پر بیحد پریشان اور فکرمند ہوں گے۔ لیکن مجھے تعجب ہوا جب میں نے اُس کے دونوں چھوٹے بھائیوں کو بڑے اطمینان سے گھر کے سامنے لان میں بیڈمنٹن کھیلتے دیکھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ خود اشرف کے بقول اُسکی والدہ اس شادی کے حق میں نہیں تھیں کہیں ایسا تو نہیں کہ اُنکی مخالفت اتنی زیادہ بڑھ گئی ہو کہ اشرف نے شادی کا انتظام اپنے گھر کے بجائے زرتاج کے گھر کیا ہو، پھر مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اگر اشرف جمشید آباد سے کار کے ذریعہ روانہ ہوا تھا تو اُسے پُرانے شہزاد نگر تک پہنچنے کے لئے کم سے کم آٹھ گھنٹے کا وقت درکار تھا، دوسرے الفاظ میں اُسے سہ پہر تین چار بجے کے قریب روانہ ہونا پڑا ہو گا اور اپنے گھر سے شادی ہونے کی صورت میں وہ نو دس بجے سے قبل نہیں چل سکتا تھا ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اسکے گھر والوں کو اُسکی گمشدگی سے متعلق کوئی پریشانی لاحق نہیں ہو سکتی تھی، بہرحال میں نے آگے بڑھ کر اُسکے چھوٹے بھائی اکرم کو آواز دی، وہ اپنا کھیل چھوڑ کر ریکٹ ہاتھ میں لئے بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔

"ارے منصور بھائی! آپ؟" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "بھائی جان سے ملنے آئے ہوں گے، مگر وہ تو......" اُسی وقت ایک کار گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ اکرم نے گھوم کر اُسکی طرف دیکھا۔ "لیجئے وہ آگئے۔" اُس نے کہا۔

میں ایک ساتھ پلٹا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ میرے سامنے اشرف کار سے مسکراتا ہوا اُتر رہا تھا۔۔۔ وہی اشرف جس کی لاش میں تاج نگر کی حویلی میں دیکھ چکا تھا۔

میں اتنا حیرت زدہ تھا کہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکا۔ خود اشرف کو ہی میرے پاس آنا پڑا۔

"آپ تو اس طرح مجھے گھور رہے ہیں جیسے میں کوئی انسان نہیں بھوت ہوں۔" اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔۔۔ "آپ شہزاد نگر سے کب واپس آئے؟"

"آج دوپہر۔" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

اُسے مجسم اپنے سامنے دیکھنے اور چھونے کے باوجود مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ مچ اشرف ہے یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں اور اگر یہ حقیقت ہے تو وہ پھر کیا تھا جو میں نے حویلی میں دیکھا تھا۔

"آئیے اندر چل کر باتیں کریں۔" اشرف نے میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ کوٹ اتار کر کپڑوں کی الماری میں لٹکایا اور پھر ایک دوسری الماری سے وہسکی، سوڈے کی بوتلیں اور دو گلاس نکال کر صوفے پر میرے قریب آ بیٹھا، بوتلیں اور گلاس اس نے سامنے پڑی ہوئی چھوٹی میز پر رکھ دیئے میں تعجب سے اُسکی ان حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اُس نے شراب پینا شروع کر دی ہے۔

"آپ سوڈا ملانا پسند کرتے ہیں یا نہیں؟" اُس نے بوتل اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"میں شراب نہیں پیتا۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اور مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ تم نے پینا شروع کر دی ہے۔"

"حیرت ہے، آپ ڈپٹی کمشنر ہو کر ایسی باتیں کر رہے ہیں۔" اشرف نے سوڈا ملی ہوئی وہسکی کا گلاس تیار کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں، کیا شراب نوشی بھی ڈپٹی کمشنری کے فرائض میں شامل ہے؟"

"کم سے کم آجکل کی سوسائٹی میں تو ایسا ہی سمجھا جاتا ہے" اشرف نے کہا۔ "بہرحال چھوڑیئے اس ذکر کو، یہ بتایئے کہ آپ کی شادی کا کیا رہا۔ کب تک ہو رہی ہے؟"

"بات چیت تقریباً طے ہو چکی ہے۔ مگر شادی اگلے سال ہو گی۔"

"کیوں؟"

"متعدد وجوہات ہیں، پھر کبھی بتاؤں گا۔ تم کب...."

"اچھا یہ تو بتا دیجئے۔" اشرف نے بات کاٹ دی "کہ کہاں ہاتھ مارا ہے؟"

میں نے چونک کر اُسکی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ میں تمہیں بتا تو چکا ہوں۔" میں آہستہ سے بولا اور پھر اُسکی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم اپنے ہنی مون سے کب واپس آئے؟"

"ہنی مون سے؟" اشرف نے تعجب سے دہرایا۔ مگر پھر دوسرے لمحے اُسکے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی، یہاں تک کہ وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ میں اُسکی صورت دیکھ رہا تھا۔ "یہ لطیفہ بھی خوب رہا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "مگر ظاہر ہے آپ کو کیا معلوم ہو سکتا تھا، آپ تو دھام پور گئے ہوئے تھے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"بھائی صاحب میری شادی نہیں ہو سکی۔" اشرف نے جواب دیا۔ "میں نے اپنی امی جان کو منانے کی بہت کوشش کی۔ مگر اُنہوں نے صاف کہہ دیا کہ اگر تو نے زرتاج سے شادی کی تو تمام عمر تیرا منہ نہ دیکھوں گی، میں نے سوچا کہ بیویاں تو بہت مل جائیں گی مگر میں اپنی ماں کو کہاں سے لاؤں گا؛ چنانچہ میں نے شادی نہیں کی۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا "تم دونوں مجھے ہفتے کے دن شہزاد نگر کے راستے میں ملے تھے اور خود تم نے بتایا تھا کہ زرتاج سے شادی کرنے کے بعد ہنی مون منانے جا رہے ہو۔"

"تم دونوں، سے کیا مُراد ہے؟"

"تم اور زرتاج!"

"زرتاج ملی ہو گی۔" اُس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ اُسی دن سے غائب ہے۔"

"نہیں اُسکے ساتھ تم بھی تھے۔"

"آپ کو دھوکا ہوا ہے منصور بھائی!" اشرف نے کہا "میرا خیال ہے کہ زرتاج نے میرے انکار سے مشتعل ہو کر کسی اور سے شادی کر لی ہے، وہ دونوں آپ کو ملے ہوں گے، مگر چونکہ آپ کے ذہن میں زرتاج کے ساتھ میرا نام وابستہ تھا اس لئے اُسکے ساتھی پر آپ کو میرا شبہ ہوا۔"

"اگر میں اُنہیں صرف گزرتے ہوئے دیکھتا تو ایک حد تک تمہاری بات مانی جا سکتی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں نے تم سے بات کی تھی اور کافی دیر تک تمہارے ساتھ رہا تھا!"

"پھر تو ضرور آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے۔" اشرف نے جواب دیا۔ "آپ کسی سے بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ میں ایک دن کیلئے بھی جمشید آباد سے باہر نہیں گیا اور نہ زرتاج سے میری شادی ہوئی ہے۔"

اب میں اس بات کا کیا جواب دیتا، خود اشرف کا زندہ ہونا ہی میری سمجھ سے باہر تھا، ایک مرتبہ پھر میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہونے لگا کہ آیا واقعی وہ سب کچھ خواب ہی تو نہیں تھا۔ مگر وہ خواب تھا تو اس مالا کی میرے پاس موجودگی کا کیا جواز تھا، میرا ذہن بُری طرح

اُلجھ گیا تھا۔ اس گفتگو کے بعد میں نے اشرف کو یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ میں تاج نگر کی حویلی میں اُسکی لاش دیکھ چکا ہوں اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا ادھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد میں اُس سے رخصت ہو کر گھر چلا آیا۔

دن گزرتے گئے اور اس درمیان میں میں نے بڑی شدت سے یہ بات محسوس کی کہ اشرف اب وہ پہلے جیسا اشرف نہیں معلوم ہوتا۔ وہ ایک دم بدل گیا تھا، شراب پیتے تو میں اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا جلد ہی اُسکی رنگین مزاجی کی کچھ اور داستانیں بھی میرے کانوں تک پہنچنے لگیں، جب میں نیا نیا جمشید آباد آیا تھا تو مجھے دوسرے لوگوں نے بھی بتایا تھا اور خود اشرف نے بھی اُس کا اظہار کیا تھا کہ اُس نے اپنی موجودہ پوزیشن محنت اور ایمانداری سے کام کر کے حاصل کی تھی لیکن اب جو اطلاعات مجھے اسکے بارے میں مل رہی تھیں وہ اس سے بالکل مختلف بلکہ متضاد تھیں، وہ نہ صرف سٹہ کھیلنے لگا تھا بلکہ بلیک مارکیٹنگ، اسمگلنگ اور شہر کے غنڈوں اور بدمعاشوں کی سرپرستی کے سلسلے میں بھی اُس کا نام میرے سامنے لیا جانے لگا، میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ مجھ سے بھی لڑ بیٹھا اور اُسکے بعد ملنا جلنا قطعی ترک کر دیا۔

سول انتظامیہ اور پولیس کے لوگ جانتے تھے کہ وہ میرا دوست ہے اس لئے دبی زبان سے شکایت کرنے کے علاوہ کسی نے اُسکے خلاف تحقیقات کرنے کی ہمت نہیں کی مگر جب اُسکی چیرہ دستیاں حد سے زیادہ بڑھ گئیں اور شہر میں ہونیوالے ہر بڑے جرم کے سلسلے میں اُس کا نام لیا جانے لگا، تو میں نے خود ایس پی کو حکم دیدیا کہ اگر آپ کو کسی بھی سلسلے میں اشرف کے خلاف کوئی ثبوت ملتا ہے تو اس کا خیال نہ کریں کہ وہ میرا دوست ہے، اور قانون کے مطابق کارروائی کریں اتنی مدت میں کافی غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ یہ وہ اشرف ہرگز نہیں ہے جسے میں جانتا تھا اور جو میرا دوست تھا، وہ اشرف اس رات تاج نگر کی حویلی میں شیطان کی قربانگاہ پر قتل کر دیا گیا اور اُسکی لاش اسی لئے غائب ہوئی تھی کہ ابلیس کی کوئی ذریت اُسکی جگہ لے سکے۔

اُنہی دنوں ایک غریب اسکول ماسٹر کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا اور تین دن بعد اُسکی لاش شہر کے باہر کھیتوں میں اس حال میں پڑی پائی گئی کہ ایک نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ ہوس پرستوں نے بڑی درندگی کے ساتھ بے آبرو کرنے کے بعد اس کا گلا گھونٹ دیا ہے، اغوا کے سلسلے میں جس غنڈے پر شبہ کیا جا رہا تھا وہ اشرف کا خاص آدمی تھا، مجھے اس انسانیت سوز واقعہ پر طیش آ گیا اور میں نے اشرف کے خلاف تحقیقات کی ہدایات جاری کر دیں۔ مگر تحقیقات شروع ہوتے ہی یہ بات ظاہر ہونے لگی کہ کوئی ایک فرد بھی اشرف کے خلاف زبان کھولنے پر تیار نہیں ہے پولیس کے پاس غیر مصدقہ اطلاعات کے علاوہ کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔

ایک طرف یہ حالات تھے اور دوسری طرف میرا گھر بھی کچھ عجیب و غریب سرگرمیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مجھے حکومت کی جانب سے رہائش کے لیئے ایک کوٹھی ملی ہوئی تھی جس میں ایک بوڑھی ملازمہ اور ایک ملازم لڑکا ساتھ رہتا تھا، ملازمہ کھانے پکانے کی ذمہ دار تھی اور لڑکا کوٹھی کی صفائی ستھرائی اور باہر کے متفرق کام کیا کرتا تھا، میں صبح دفتر جاتے ہوئے اپنے بیڈ روم اور نجی کمرے کو مقفل کر جاتا تھا۔ لیکن اسکے باوجود میں نے شام کو کئی مرتبہ گھر آنے کے بعد محسوس کیا کہ جیسے میرے کمرے اور بیڈ روم کو چھیڑا گیا ہے ـــــ میں نے ملازمہ اور لڑکے سے اس بارے میں باز پرس کی مگر وہ قسم کھاتے تھے کہ میری عدم موجودگی میں انہوں نے کبھی میرے کسی کمرے میں قدم نہیں رکھا۔

ایک دن مجھے صبح ہی کسی ضروری کام سے باہر جانا پڑا میں اتنی عجلت میں تھا کہ ناشتے کے بعد ملازمہ کے برتن لیجانے کا بھی انتظار نہیں کیا اور کمرہ بند کر کے چلا گیا۔ واپس لوٹا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ برتن کمرے میں موجود نہیں ہیں، ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ کہیں میری یادداشت تو غلطی پر نہیں ہے، ملازمہ برتن لے جا چکی ہو اور مجھے یہی خیال رہا ہو کہ وہ ابھی نہیں لے گئی ہے، اچانک ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے اُسکی طرف دیکھا وہ کسی حد تک گھبرائی ہوئی اور خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ ”رحیمن بوا!“ میں نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”تم یہاں سے چائے کے جھوٹے برتن اُٹھا کر لے گئی ہو؟“

”ہاں سرکار لے گئی ہوں۔“ ملازمہ نے جواب دیا۔

میری موجودگی میں یا میرے جانے کے بعد؟“ میرا دوسرا سوال تھا۔

”آپکے جانے کے بعد۔“

”مگر کیسے؟ کمرے کا دروازہ تو میں بند کر گیا تھا“ میں نے کہا۔ رحیمن بوا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”مجھے تو کھلا ہوا ملا تھا سرکار!“ اُس نے بتایا۔

”تعجب ہے۔“ تم کہتی ہو کھلا ہوا تھا حالانکہ میں نے ابھی دفتر سے واپس آکر دیکھا تو مقفل تھا۔“ میں نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

”ویسے تم اس وقت میرے پاس کیوں آئی تھیں؟“

”میرا حساب کر دیں سرکار! میں جانا چاہتی ہوں۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں، اس گھر میں پتہ نہیں کون گھسا ہوا ہے، اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“

میں سگریٹ سلگا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“ میں نے ایک کش لیتے ہوئے کہا۔ ”کون گھسا ہوا ہے اس گھر میں؟“

”خدا ہی بہتر جانتا ہے سرکار!“ رحیمن بوا نے جواب دیا۔ ”آپ کہتے ہیں کہ تالا ڈال کر گئے تھے، مگر مجھے دروازہ کھلا ملا۔ آپکے دفتر جانے کے بعد میں چائے کے برتن اُٹھانے آئی تھی، کمرے میں قدم رکھا تو یوں لگا جیسے یہاں کوئی موجود ہے، میں نے اُسے اپنا وہم سمجھا اور میز سے ٹرے اُٹھا کر واپس جانے لگی لیکن ابھی ایک ہی قدم چلی تھی کہ نظریں آپ کی لکھنے کی میز کی طرف اُٹھ گئیں، اُسکی نچلی دراز آپ سے آپ باہر کیطرف کھل رہی تھی چائے کی ٹرے میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ میں نے گھبرا کر کلمہ پڑھا تو دراز ایک جھٹکے سے بند ہو گئی اور ہوا کا ایک جھونکا سا میرے قریب سے گزرتا ہوا کھڑکی تک گیا۔ کھڑکی آپ سے آپ کھلی اور پھر بند ہو گئی۔ میں ڈر کر ایسی بھاگی کہ پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔“

”میں حیرت سے رحیمن بوا کی طرف دیکھ رہا تھا“ تمہیں وہم ہوا ہوگا۔“ میں نے اُسے تسلی دینا چاہی مگر اُس نے میری بات کاٹ دی۔

”نہیں سرکار! آپ بھی کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ کوئی آپ کی چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتا رہتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں آپ بھی یہ گھر چھوڑ دیں، یہاں ضرور کسی جن بھوت نے بسیرا کر لیا ہے۔“

جن بھوت کے الفاظ سنتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ خیالات کی رَو ایک دم تاج نگر کی حویلی کے پُراسرار واقعات کی طرف منتقل ہو گئی۔ میں نے رحیمن بوا کو تو دم دلاسا دے کر ٹالا۔ اور اُسکے جاتے ہی الماری کھولی جس کے ایک خفیہ خانے میں سیاہ موتیوں کی مالا رکھی ہوئی تھی، دھام پور سے واپس آنے کے بعد میں نے اُسے ایک دن بھی نکال کر نہیں دیکھا تھا۔ مالا خانے میں موجود تھی، میں نے اُسے اُٹھا کر دیکھا میں سوچ رہا تھا کہ اگر میرے کمروں کی تلاشی لینے والی زرتاج یا وہ پُراسرار نوجوان تھا اور اگر اُسے یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو کر بھی کسی جگہ آ جا سکے تو پھر اُسے یہ کیوں نہ معلوم ہو سکا کہ مالا اس الماری میں رکھی ہوئی ہے۔ کیوں وہ اتنے دن سے اُسکی تلاش میں بھٹک رہی ہے، کیوں اُس نے الماری کھول کر مالا نہیں نکال لی۔ اس کا جواب بھی مجھے فوراً ہی مل گیا۔ الماری کے سب سے اوپری خانے میں جزدان میں لپٹا ہوا قرآن مجید رکھا تھا، جسے میں روزانہ صبح تلاوت کرنیکے بعد احتیاط سے وہیں رکھ دیا کرتا تھا، میں آیۃ الکرسی کے ورد کا اثر دیکھ چکا تھا۔ میں نے سوچا ضرور یہی بات ہوگی، قرآن مجید کی وجہ سے زرتاج کا شیطانی علم اس الماری کا احاطہ کرنے سے قاصر تھا، نہ صرف یہ کہ وہ اُسے ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی، بلکہ اُس کے اندر رکھی ہوئی چیزوں سے بھی لاعلم تھی، مالا ابھی تک میرے ہاتھ میں ہی تھی اور میں اُسے واپس خانے میں رکھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مجھے اپنے قریب کسی وجود کا احساس ہوا تیزی سے گھوم کر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں کمرے میں اکیلا کھڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے مالا اُسی خانے میں رکھدی اور الماری کو مقفل کر دیا۔

اس بات کو دو تین دن ہی گزرے تھے کہ میں ایک روز خلافِ معمول دوپہر ہی کو دفتر سے کوٹھی واپس آ گیا گیرج عقبی حصے میں بنا ہوا تھا گیرج میں کار کھڑی کرنے کے بعد بجائے اسکے کہ میں گھوم کر بیرونی دروازے سے اندر جاتا، پچھلے دروازے سے اپنے کمرے میں پہنچا تو رحیمن بوا الماری کھولے کھڑی تھی، اُس الماری میں میرے کپڑے اور دوسری چیزیں رکھی تھیں، مجھے بڑا تعجب ہوا کہ آخر وہ کیا تلاش کر رہی ہے اور یہ کہ اُس نے الماری کیسے کھولی۔

”کیا دیکھ رہی ہو رحیمن بوا؟“ میں نے پوچھا، وہ بغیر کسی پریشانی کے میری طرف گھومی۔

”اچھا ہوا سرکار کہ آپ خود ہی آ گئے مجھے نہیں مل رہا ہے وہ خانہ، جہاں مالا رکھی ہے، آپ خود ہی نکال کر دیدیں۔“

”کیسی مالا ـــ؟“ میں چونک پڑا۔ ”تم سے کس نے مالا نکالنے کو کہا ہے۔؟“

”سرکار وہ ڈرائنگ روم میں آپکے دوست آئے بیٹھے ہیں نا؟ اُنکے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے“ رحیمن بوا نے جواب دیا۔ ”کہہ رہے تھے کہ اُس لڑکی نے آپ کو کوئی مالا ٹھیک کرانے کیلیئے دی تھی۔“

”کون دوست، اشرف؟“

”جی ہاں۔“

”مگر تم نے الماری کیسے کھولی؟“

”سرکار وہ آپسے چابی لے کر آئے تھے نا!“

”مجھ سے!“

”جی وہ تو یہی بتا رہے تھے کہ وہ لوگ پہلے آپکے دفتر

گئے تھے، آپ نے اُن سے کہا کہ مالا گھر پر الماری میں رکھی ہے اور ساتھ ہی الماری کی چابی بھی دیدی کہ مجھے دے کر مالا نکلوالیں۔"

"کہاں ہے وہ چابی؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔ رحیمن بوا نے جلدی سے الماری کا قفل والا پٹ دیکھا اور اُسکی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"میں نے تالے ہی میں لگی چھوڑ دی تھی"۔ وہ مُنہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"اشرف اور وہ لڑکی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں؟" میں نے دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"اچھا تو تم الماری بند کردو اور اس کمرے میں ٹھہرو" میں نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ مگر ڈرائنگ روم بالکل خالی تھا۔ نہ اشرف کا پتہ تھا، نہ زرتاج کا (مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکی زرتاج ہی ہوگی) کوٹھی سے باہر جاکر دیکھا، وہ دونوں غائب ہو چکے تھے۔

اس واقعہ کے بعد میں مالا کی حفاظت کے سلسلے میں اور زیادہ محتاط ہو گیا۔ رحیمن بوا اور لڑکے کو سختی کے ساتھ ہدایت کردی کہ میرے پیچھے خواہ کوئی آئے اور مالا یا کوئی اور چیز الماری سے نکالنے کیلئے کہے تو وہ ہرگز اُسکی بات نہ مانیں اور فوراً مجھے دفتر فون کردیں، کئی دن تک مجھے ان دونوں کی جانب سے کسی اور کوشش کا انتظار رہا لیکن کوئی غیر معمولی بات پیش نہیں آئی کمروں کی چیزوں کی اُلٹ پلٹ بھی ختم ہو چکی تھی، رحیمن بوا کو بھی پھر کبھی کوئی انوکھا تجربہ نہیں ہوا اور وہ کچھ مطمئن سی ہو گئی کہ اس کے بعد پھر اُس نے کبھی ملازمت چھوڑنے کا ذکر نہیں کیا۔ اس بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ اب زرتاج کو مالا کی جگہ معلوم ہو چکی ہے اور وہ اُسکی تلاش میں سرگرداں رہنے کی بجائے کسی کو واسطہ بنا کر مالا حاصل کرنا چاہتی ہے ۔۔ ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ میں نے ایک رات کو بڑا عجیب و غریب خواب دیکھا۔ کہ میں اپنے بیڈ روم میں بستر پر لیٹا ہوا ہوں، اچانک کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک بہت نورانی صورت بزرگ اندر داخل ہوتے ہیں، میں اُنہیں دیکھ کر جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ آپ کون ہیں وہ جواب دیتے ہیں کہ خدا کے مقرب بندے اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے، مگر یہ کہ وہ دُنیا سے شیطان اور اُسکی ذریت کو ختم کرنے کی مہم میں مصروف ہیں۔ اُنہیں اپنے علم سے معلوم ہوا ہے کہ زرتاج نامی ایک عورت ابلیس سے معاہدہ کر کے خلق خدا کو بہکا رہی ہے، یہ عورت ہر سال دُنیا کے کسی بھی حصے سے ایک نوجوان کو اپنے حسن و شباب کے جال میں پھانس کر اُسکی روح شیطان کے حوالے کر دیتی ہے اور پھر وہ نوجوان جب تک زندہ رہتا ہے، بذات خود شیطان کا ایک ایجنٹ بن کر بُرائیوں کے فروغ میں مدد دیتا ہے، بزرگ نے مزید بتایا کہ زرتاج کے پاس ایک مالا تھی جسے وہ اس نوجوان کے گلے میں ڈال کر اُسے شیطان کا غلام بناتی تھی اور یہ کہ اُنہیں اپنے علم سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اتفاق سے وہ مالا میرے ہاتھ لگ گئی ہے، اُنہوں نے کہا کہ تم اس مالا کی خاطر خواہ حفاظت نہیں کر سکتے، پھر یہ کہ اگر تمہیں کوئی حادثہ پیش آجائے تو زرتاج کسی بھی حیلے بہانے سے مالا دوبارہ حاصل کر لے گی اس لئے بہتر ہوگا کہ تم اس مالا کو مجھے دیدو۔"

میں اس پر آمادگی کا اظہار کرتا ہوں اور بزرگ کو ساتھ لیکر اپنے کمرے میں جاتا ہوں تاکہ الماری سے مالا نکال کر اُنہیں دیدوں۔ بزرگ میرے پیچھے کھڑے تھے، میں الماری کھول رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ اُسکے شیشے پر پڑتی ہے اور ایک لمحے کیلئے مجھے یوں نظر آتا ہے کہ جیسے میرے پیچھے وہ بزرگ نہیں بلکہ زرتاج کا ساتھی نوجوان کھڑا ہو۔ میں تیزی سے گھوم کر دیکھتا ہوں تو حسب سابق بزرگ ہی کو کھڑا پاتا ہوں مگر میرے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہو جاتا ہے اور میں بزرگ سے کہتا ہوں کہ آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں چابی لیجئے اور خود ہی الماری کو کھول کر اُسکے خانے سے مالا نکال لیجئے۔ یہ سنتے ہی بزرگ کے چہرے پر غصہ چھا جاتا ہے، وہ کڑک کر کہتے ہیں کہ کیا تو نے ہمیں اپنا غلام سمجھ رکھا ہے ہم مالا نہیں نکالیں گے۔ تو خود نکال کر دے، مگر میں اڑ جاتا ہوں کہ نہیں اب تو آپ ہی نکالیں گے۔ بزرگ آگ برساتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورتے ہیں کہتے ہیں کہ اس گستاخی کا نتیجہ تیرے حق میں اچھا نہیں ہوگا اور پھر غائب ہو جاتے ہیں میں اپنے بیڈ روم میں واپس جا رہا ہوتا ہوں کہ کسی چیز سے ٹھوکر لگ کر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو راہداری میں کھڑا پایا، خواب کے تمام واقعات میرے ذہن میں تازہ تھے اور میرے لئے یہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا کہ زرتاج اب اپنی دوسری کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد خود مجھے تنویمی کیفیت میں مبتلا کر کے میرے ذریعہ سے مالا واپس لینا چاہتی ہے، اس کا ثبوت بھی دوسری رات کو مل گیا جب میں نے ایک دوسرا خواب دیکھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس مرتبہ زرتاج خود آئی اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اُس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر میں نے اُسے مالا نہیں دی تو وہ میری زندگی کو جہنم بنا دے گی اسی کے ساتھ اُس نے

مجھے لالچ بھی دیا کہ اگر میں اُسے مالا دیدوں تو وہ میرے قدموں میں زر و جواہر کے انبار لگا دیگی۔ اس کے بعد وہ مجھے غور کرنے کی مہلت دے کر یہ چلی گئی کہ کل اسی وقت پھر آئے گی اور اگر مجھے اپنی اور اپنے عزیزوں کی سلامتی عزیز ہے تو مالا الماری سے نکال کر اُسے دینے کیلئے تیار رکھوں۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ اگر وہ اسی طرح رات کو میرے کمرے میں داخل ہو کر مجھے ہپناٹائز کرتی رہی تو ہوشیار اور محتاط رہنے کے باوجود یہ عین ممکن تھا کہ میں اس حد تک اُسکے اثر میں آجاؤں کہ بے خبری کے عالم میں مالا اُس کے حوالے کردوں، عالم بیداری میں تو میں اُس کے شیطانی علم سے خود کو محفوظ رکھ سکتا تھا مگر سوتے میں میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا، اُس سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ممکن تھی اور وہ یہ کہ میں کسی طرح اپنے بیڈ روم میں اُسے داخل ہونے سے روک دوں۔ چنانچہ دوسرے دن میں نے یہ کیا کہ چار پانچ کاغذوں پر آیۃ الکرسی آعوذ اور لاحول لکھ کر کمرے کے تمام دروازوں اور کھڑکیوں پر چسپاں کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور اُس دن کے بعد مجھے کسی اور خواب نے پریشان نہیں کیا۔

کئی ہفتے گزر گئے اور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں کچھ مطمئن سا ہو گیا کہ شاید آزرتاج نے مایوس ہو کر میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے، دوسری طرف اشرف کے خلاف پولیس کی تحقیقات بھی جاری تھی۔ مگر تمام دوڑ دھوپ کے باوجود کوئی ثبوت نہیں مل رہا تھا۔ جس بدمعاش نے لڑکی کو اغوا کیا تھا، سلطانی گواہ بنائے جانے کے لالچ کے باوجود اُس نے اشرف کے بارے میں ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا اور یہی کہتا رہا کہ اُس نے خود لڑکی کو اغوا کیا تھا اور وہ خود ہی اُسکی موت کا ذمہ دار بھی ہے مجبوراً اسی پر مقدمہ چلایا گیا اور عدالت نے اُسے عمر قید با مشقت کی سزا سنا دی، بظاہر معاملہ ختم ہو گیا لیکن میں نے سی آئی ڈی کو ہدایت کردی تھی کہ وہ مسلسل اشرف کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھے اور کسی بھی طرح کوئی ایسا ثبوت حاصل کرے کہ جسے عدالت میں پیش کر کے اُسے سزا دلائی جاسکے۔

غالباً اتوار کی رات تھی میں ایک نیم سرکاری تقریب میں شرکت کے بعد ساڑھے بارہ بجے کے قریب کوٹھی واپس پہنچا۔ رحیمن بوا اور لڑکے سے کہہ گیا تھا کہ وہ میرے آنے کا انتظار نہ کریں اور بیرونی دروازہ مقفل کر کے سو جائیں ان دونوں کو میں نے کوٹھی کے عقبی حصے میں ایک کمرہ دیدیا تھا، بیرونی دروازے میں مخفی قفل لگا ہوا تھا۔ اسلئے اُسے اندر یا باہر دونوں جانب سے بند کیا یا کھولا جاسکتا تھا۔ میری یہ عادت تھی کہ سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ اوولٹین ڈال کر ضرور پیا کرتا تھا اُس رات بھی رحیمن نے تھرمس میں گرم دودھ بھر کر کمرے میں رکھ دیا تھا۔ مگر میں دعوت میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کھا گیا تھا۔ طبیعت میں کچھ گرانی سی تھی۔ میں نے دودھ پینے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور لباس تبدیل کر کے سونے کے لئے لیٹ گیا لیکن کافی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد بھی نیند نہیں آئی، سینے پر جلن محسوس ہو رہی تھی، میں نے سوچا کہ اُٹھ کر فروٹ سالٹ کا ایک گلاس پی لوں، شاید اُس سے کچھ تسکین ہو۔ ابھی اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ راہداری میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی آہستہ سے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر دیکھا کہ ایک شخص میرے نجی کمرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں پھرتی سے پلنگ کے قریب آیا تکیہ کے نیچے سے ریوالور نکالا اور بیڈ روم سے باہر آگیا اتنی دیر میں وہ شخص کمرے میں گھس چکا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ اُس نے اطمینان سے بجلی روشن کی اور سیدھا میری الماری کی جانب چلا اُس نے سیاہ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور ڈیل ڈول میں اشرف سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا تھا اور نہ زرتاج کا ساتھی نوجوان ہی معلوم ہوتا تھا اس امکان کو بھی جلد ہی رد کرنا پڑا کہ یہ زرتاج کا ساتھی ہے اور کسی اور شخص کے بھیس میں آیا ہے کیونکہ وہ خواہ کسی بھی صورت میں آتا اگر اس سے قبل اس کے لئے کلام پاک کی موجودگی کی وجہ سے الماری کھولنا ناممکن تھا تو آج بھی وہ اُسے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے زیادہ اغلب بات یہی تھی کہ یہ کوئی چور ہو۔ لیکن چور اتنی بیباکی سے تو کسی گھر میں داخل نہیں ہوا کرتے،

میں نے صرف اتنی دیر انتظار کیا کہ وہ الماری کو ہاتھ لگاتا ہے یا نہیں، پھر جیسے ہی اُس نے اپنی جیب سے کوئی خاص اوزار نکال کر الماری کا قفل کھولنے کی کوشش کی، میں دبنگ آواز میں بولا۔ "خبردار! اگر ذرا بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا"

وہ یوں اُچھلا جیسے کسی نے غیر متوقع طور پر اُسکے چابک رسید کر دیا ہو، گھوم کر میری طرف دیکھا اُس کے چہرے پر شدید حیرت کے تاثرات نمایاں تھے گویا اُسے اس وقت میری آمد کی بعید ترین توقع بھی نہیں تھی۔

"کون ہو تم! اور یہاں کیا کرنے آئے تھے؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ میری آواز سُن کر وہ چونکا اور پھر بغیر اسکی پرواہ کئے کہ میرے ہاتھ میں ریوالور موجود ہے کھڑکی کی طرف جَست لگائی، میں نے

بلاتامل اُسکے پیروں کا نشانہ لیتے ہوئے فائر کر دیا گولی اُسکی بائیں پنڈلی پر لگی اور وہ فرش پر لڑھک گیا مگر فوراً ہی سنبھل کر زخمی ہونے کے باوجود اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"اب اگر تم نے بھاگنے کا ارادہ کیا تو دوسری گولی تمہارے سینے پر پڑیگی۔" میں نے دھمکی دی۔ وہ سہم کر رہ گیا اور جلدی سے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کر دیئے۔

"خدا کی قسم ڈپٹی صاحب! اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں کبھی خواب میں بھی آپ کی کوٹھی میں چوری کی نیت سے آنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، مگر مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ بے خبر سو رہے ہوں گے۔"

"تم مجھے جانتے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کو اس شہر میں کون نہیں جانتا۔"

"تم سے کس نے کہا تھا کہ میں سو رہا ہوں گا!"

"اُسی نے جس نے مجھے پانچہزار روپے کا لالچ دیکر چوری کرنے بھیجا تھا۔"

"بہت خوب، اب تم اپنا جرم کسی اور کے سر منڈھنے کی کوشش کر رہے ہو!" میں نے ترش لہجے میں کہا۔ "سب جانتے ہیں کہ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں اور زیورات یا نقد روپیہ جیسی کوئی چیز میری کوٹھی میں نہیں ہو سکتی پھر کون ایسا احمق ہوگا جو اپنی جیب سے پانچہزار روپے خرچ کر کے تمہیں چوری کیلئے بھیجے گا۔ اور بھلا تمہیں اس نے کیا چیز چرا کر لانے کیلئے کہا تھا؟"

"مالا۔ ڈپٹی صاحب!" اُس شخص نے فوراً جواب دیا۔ "اُس نے کہا تھا کہ اس کمرے کی الماری میں ایک کالے موتیوں کی مالا رکھی ہے وہ میں نکال کر اُسے لا دوں۔"

ظاہر ہے مجھے چونک پڑنا چاہیئے تھا تو اب زرتاج نے یہ ترکیب سوچی تھی، کوئی شک نہیں کہ اگر اتفاق سے میں جاگ نہ رہا ہوتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔ "اس بات سے تمہارا کیا مطلب تھا کہ میں بے خبر سو رہا ہونگا؟" میں نے سوال کیا۔

"اُس نے بتایا تھا کہ آپ ہر رات کو دودھ پینے کے عادی ہیں اور آج کی رات اُس نے آپ کے دودھ میں بے ہوشی کی دوا ملا دی ہے، نوکر سب پچھلے کمرے میں سوتے ہیں اسلئے میں بلا کسی خدشے کے اطمینان سے جاؤں اور مالا نکال لاؤں۔ کوئی روکنے والا موجود نہیں ہوگا!"

"ہوں" میں نے گردن ہلائی۔ "اور یہ سب باتیں تمہیں ایک عورت نے بتائی تھیں؟" مجھے معلوم تھا کہ اس کا جواب کیا ہوگا۔ پھر بھی میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" اُس شخص نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

اس واقعہ کے بعد اب میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں کم سے کم رات کے وقت وہ مالا اپنے تکیئے کے نیچے رکھ کر سوؤں اور کمرے کے تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند کر دوں میں نے یہی کیا، جاڑوں کا موسم شروع ہو چکا تھا اس لئے مجھے بند کمرے میں سونے میں کوئی خاص پریشانی بھی نہیں ہوئی، دن گزرتے گئے، زرتاج یا تو ہمت ہار بیٹھی تھی یا کسی اور منصوبے کی پلاننگ میں مصروف تھی کہ پھر کوئی غیر معمولی بات پیش نہیں آئی (جیسا کہ بعد میں مجھے پتہ چلا، میرا دوسرا اندازہ ہی درست تھا)

سال ختم ہونے کے قریب تھا اور ایک مرتبہ پھر امی نے جلد جلد خط لکھنا شروع کر دیئے تھے، میں اپنے بیشتر انتظامات مکمل کر چکا تھا اور اب امی کو ٹالنے کے لئے میرے پاس کوئی عذر نہیں تھا بلکہ صاف صاف کیوں نہ کہہ دوں کہ خود بھی نیلوفر کو اپنانے کی خواہش دل میں پیدا ہو چکی تھی اس لئے امی کو لکھدیا کہ آپ کوئی مناسب تاریخ مقرر کر کے مجھے اطلاع دیدیں تاکہ میں اسی حساب سے چھٹی کی درخواست دے سکوں۔ ایک ہفتے بعد مجھے اُن کا جواب مل گیا کہ شادی کے لئے شعبان کی سترہ تاریخ مقرر کی گئی ہے اور یہ کہ کم از کم دو ماہ کی چھٹی لے کر آنا ورنہ میں نیلوفر کو تمہارے ساتھ ہرگز نہ جانے دونگی۔

"میں نے تین ماہ کیلئے درخواست دی اور بڑی مشکل سے ڈیڑھ ماہ کی چھٹی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا، ظاہر ہے کہ میں مالا کو کوٹھی میں نہیں چھوڑ سکتا تھا، اسلئے اپنے مختصر سامان اور مالا کے ساتھ دھامپور روانہ ہو گیا۔ اب میں یہاں شادی کی تفصیلات میں آپ کا وقت ضائع نہیں کرونگا اسلئے تمام غیر ضروری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے تحریر کا سلسلہ وہاں سے جوڑتا ہوں، جہاں سے واقعات کا تعلق اس داستان سے شروع ہوتا ہے، مالا اپنے ساتھ لے جاتے ہوئے مجھے اس بات کی بڑی فکر تھی کہ دھام پور یا شہزادنگر میں خاطر خواہ طریقہ پر اس کی حفاظت نہیں کر سکوں گا۔ نہ صرف اس لئے کہ وہاں اپنی حسب منشا حفاظتی اقدامات کرنا مشکل تھے بلکہ اس لئے کہ وہاں شادی کے ہنگامے میں ذہن دوسری باتوں کی طرف اتنا متوجہ ہوگا کہ ہر وقت اس کا خیال رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر سچ پوچھئے تو میں اس جھگڑے سے کچھ تنگ بھی آ چکا تھا۔ آخر مالا مجھے اپنے پاس رکھنے سے فائدہ بھی کیا تھا۔ زرتاج کے ہاتھ آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اشرف خود پر ہاتھ ڈالنے کا کوئی موقع نہیں دے رہا تھا میں جانتا تھا کہ زرتاج اور اسکا ساتھی میرے دوست کے قاتل ہیں مگر کوئی ایسی صورت سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ میں ان سے اشرف اور نہ جانے کتنے بیگناہ نوجوانوں کو قتل کرنے کا انتقام لے سکوں، صرف یہ ہی ایک خیال تھا کہ شاید مالا اپنے قبضے میں رکھکر میں زرتاج کو مزید خونریزی اور لوگوں کو شیطان کی ذریت بنانے سے باز رکھ سکوں لیکن یہ بھی طے تھا کہ دھام پور میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہاں تک کہ شادی کا دن آ گیا اور امی بڑی شان سے اپنے بیٹے کی برات لیکر شہزادنگر پہونچ گئیں۔

نکاح بڑی سادگی کے ساتھ انجام پذیر ہوا پھر مجھے کچھ اندرونِ خانہ رسموں کے لئے حویلی میں لیجایا گیا۔ دلچسپ فقرے بازی، ذومعنی جملوں اور مترنم قہقہوں کے درمیان آرسی مصحف کی رسم شروع ہوئی۔ مجھے ایک کمرے میں لیجایا گیا جہاں پرانی طرز کی دو مسہریاں سفید براق چادروں کے ساتھ بچھی ہوئی تھیں۔ پتہ نہیں کوئی صاحبہ تھیں جنہوں نے ایک مسہری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بیٹھنے کے لئے کہا اور میں نے بلا تامل ان کا ہاتھ پکڑ کر مسہری پر دھکیل دیا۔ اِدھر وہ مسہری پر گریں، اُدھر پڑی ہوئی چادر انہیں اپنے اندر سمیٹتی ہوئی فرش سے جا لگی، چاروں طرف سے قہقہے بلند ہوئے اور وہ صاحبہ کچھ کھسیانی ہو کر مسہری کے نیچے سے نکلیں اور مجھے گھورتی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں۔ مجھے پہلے ہی اس شرارت کا اندازہ تھا اور چادر کے خفیف سے جھول نے بتا دیا تھا کہ مسہری بنی ہوئی نہیں ہے بلکہ مجھے دھوکہ دینے کیلئے اس پر لوہی چادر تان دی گئی ہے۔ "بہت ہوشیار ہیں آپ" ثریا نے میرے کان میں سرگوشی کی "چلئے اب دوسری مسہری پر بیٹھ جایئے۔"

اگرچہ اب مزید فریب کا امکان کم تھا لیکن میں نے ازراہِ احتیاط بیٹھنے سے پہلے چادر کا کونہ اٹھا کر اپنا اطمینان کر لیا۔ کچھ دیر کے بعد میرے سامنے ایک گٹھری کو لا کر رکھا گیا اور ہم دونوں پر ایک ریشمی چادر ڈال دی گئی۔ ثریا نے میرے اور اس گٹھری کے درمیان ایک آئینہ رکھ دیا پھر ایک بزرگ خاتون نے اس گٹھری کو کھولنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ وہ نیلوفر ہے، چاروں طرف سے میرے کانوں میں مختلف مشورے پہنچ رہے تھے، کہ جب دلہن کا گھونگھٹ اٹھا کر آئینہ میں چہرہ دکھایا جائے تو مجھے کیا کرنا چاہیئے، مگر میں ان مشوروں سے بے نیاز آئینہ کو ایسے زاویے سے جمانے کی فکر میں تھا کہ جس سے نیلوفر کی دلفریب صورت زیادہ سے زیادہ واضح طور پر دیکھ سکوں۔ تھوڑی کشمکش کے بعد ان بزرگ خاتون نے دلہن کا گھونگھٹ اُلٹ دیا اور میں نے آئینے میں ایک ماہِ زرنگار کو طلوع ہوتے دیکھا۔ عکس

ظاہر ہے کہ اُلٹا تھا اس لئے ابتدائی چند ثانیوں میں مجھے اس کے خدوخال کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکا مگر جیسے ہی میں اسے اچھی طرح دیکھنے میں کامیاب ہوا مجھے ایک دھچکہ سا لگا۔ دل ایک لمحہ کیلئے دھڑکنا بھول گیا میری نظروں کے سامنے آئینہ میں زرتاج کا چہرہ جھانک رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آرہی تھیں، حلق خشک ہوا جارہا تھا اور ذہن جیسے قطعی ماؤف ہوکر رہ گیا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ یہ کیفیت مجھ پر کتنی دیر تک طاری رہی اور اس درمیان میرے گردوپیش میں کیا کچھ ہوتا رہا مگر کچھ اوسان بحال ہونے پر میں نے آنکھیں کھولیں تو آرسی مصحف کی رسم ختم ہوچکی تھی اور میرے اوپر سے چادر ہٹائی جارہی تھی۔ پہلی بات جو میرے منہ سے نکلی اور ایک گلاس پانی کی درخواست کی۔

"معلوم ہوتا ہے دلہن کو دیکھ کر ہوش و حواس اُڑ گئے ہیں۔" کسی نے فقرہ چست کیا۔

"اری بہن، دولہا میاں تو سچ مچ بیہوش ہوئے جارہے ہیں۔" کوئی اور شوخ میری گرتی ہوئی حالت دیکھ کر حیرت سے بولی۔ امی بھی شاید کہیں قریب ہی تھیں، جلدی سے آگے بڑھ کر آئیں۔

"کیا بات ہے بیٹے؟" انہوں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

اتنی دیر میں کسی نے میرے ہاتھ میں پانی کا گلاس پکڑا دیا تھا میں نے آنکھیں بند کرکے اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا، دل کچھ ٹھہرا۔ امی مسلسل میری طبیعت کے بارے میں پوچھ رہی تھیں، اب میں انہیں کیا بتاتا کہ میں کیا دیکھ چکا ہوں۔ میں کچھ سکون سے اس معاملہ پر غور کرنا چاہتا تھا چنانچہ خود کو سنبھال کر زبردستی مسکراتے ہوئے انہیں جواب دیا کہ ٹھیک ہوں باقی رسمیں کسی نہ کسی طرح پوری کرکے میں حویلی سے اس طرح باہر نکلا جیسے کوئی قیدی جو ایک طویل مدت کی سزا کاٹ کر رہا ہوا ہو۔

دل کو یقین نہیں آرہا تھا کہ میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ درست ہوسکتا ہے۔ وسوسے اور اندیشے سر اٹھا رہے تھے زرتاج نے خود کو ایک نوابی خاندان سے بتایا تھا وہ اشرف کو پرانے شہزاد نگر لے کر آئی تھی اور پھر اس واقعہ کے بعد اس مکان سے غائب ہوگئی تھی جہاں وہ اپنے بوڑھے ملازم کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ تمام باتیں اس جانب اشارہ کر رہی تھیں کہ نواب شہاب الدین کی بیٹی نیلوفر بھی زرتاج ہوسکتی ہے، یہ ممکن تھا کہ وہ دوہری زندگی گزار رہی ہو۔ نواب صاحب کی حویلی میں نیلوفر اور حویلی سے باہر زرتاج۔ مگر میرا ذہن اس حل کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ امی نے بتایا تھا کہ نیلوفر نہ صرف تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار اور ہنرمند ہے بلکہ اسے دین سے بھی بیحد لگاؤ ہے اور پابندی سے نماز پڑھتی ہے اور زرتاج خواہ کسی حیثیت میں ہوتی نماز کے قریب نہیں جاسکتی تھی۔ پھر مجھے یہ بھی یاد آیا کہ زرتاج نے مجھے نیلوفر سے شادی نہ کرنے کی تاکید کی تھی اور اسے میرے حق میں منحوس بتایا تھا۔ اس کے بھی دو پہلو ہوسکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ خود نیلوفر تھی اور اپنا بھید کھل جانے کی وجہ سے مجھے خود سے دور رکھنا چاہتی تھی اور دوسرے یہ کہ مجھ سے نفرت کی بنا پر وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں نیلوفر جیسی لڑکی کو حاصل کرسکوں۔

میرا ذہن اسی کشمکش میں مبتلا تھا اور یہ فیصلہ کرنا بڑا دشوار تھا کہ میں کیا سمجھوں اور کیا نہ سمجھوں لیکن ایک بات طے تھی۔ اگر نیلوفر ہی زرتاج تھی تو میں ایسی شیطان صفت لڑکی کو اپنی شریکِ زندگی بنانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ آرسی مصحف کے وقت میں نے اسے ایک پل کیلئے دیکھا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ اس کی صورت زرتاج سے کچھ ملتی ہو اور میں چونکہ زرتاج کو دیکھ چکا تھا اس لئے ایک نظر ڈالتے ہی اسے زرتاج سمجھ لیا ہو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مجھے نیلوفر سے متنفر کرنے کے لئے خود زرتاج اپنی مافوق الفطری طاقت کے ذریعہ آئینے میں نمودار ہوگئی ہو۔ کونسی بات درست ہے اس کا فیصلہ اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک میں نیلوفر کو اچھی طرح نہ دیکھ لوں۔ چنانچہ میں نے سردست خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا ہمارا پروگرام زیادہ رات ہونے سے پہلے ہی واپس دھام پور پہنچ جانے کا تھا اس لئے رخصتی میں کچھ عجلت سے کام لیا گیا اور ہم لوگ نیلوفر کو ساتھ لیکر مغرب کے فوراً بعد شہزاد نگر سے بذریعہ کار روانہ ہوئے اور نو بجے تک دھام پور آگئے۔ یہاں بھی بہت سی رسمیں ہوئیں ہنسی مذاق ہوا چھیڑ چھاڑ کی گئی قہقہے لگے۔ یہاں تک کہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے امی نے چپکے سے میرے کان میں آکر بتایا کہ دلہن کو حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا ہے اور میں اپنے دوستوں کو رخصت کرکے وہاں جاسکتا ہوں۔

میں نے دھڑکتے دل سے اس سجے سجائے کمرے میں قدم رکھا جہاں پھولوں کی سیج پر نیلوفر دلہن بنی بیٹھی تھی۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے ایک آیت الکرسی، درود اور کئی قرآنی آیات پڑھیں شیطان اور اس کی ذریت سے اللہ کی پناہ مانگی پھر عمامہ اور شیروانی اتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے سیج پر نیلوفر کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ رسم کے مطابق مجھے اس کی صورت دیکھنے سے پہلے منہ دکھائی کی انگوٹھی پہنانا تھی۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ مناسب فقرے سوچنے کی کوشش کی تاکہ گفتگو کی ابتدا کی جاسکے مگر لاکھ سوچنے پر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ چند لمحہ اس کشمکش میں

گنوانے کے بعد آخر میں نے ایکدم سے چادر میں چھپا ہوا اس کا ہاتھ پکڑ لیا، آہستہ سے اپنی طرف کھینچا اور بڑے غور سے اس دستِ نازک و سیمیں کو دیکھنے لگا۔ دل کو ایک اطمینان سا ہوا۔ میں زرتاج کے ہاتھ اور اس کی انگلیوں کے بڑے بڑے نکیلے ناخون بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ چھوٹا سا حسین و ملائم ہاتھ زرتاج کا نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے انگوٹھی پہنائی اور پھر لجاتی، شرماتی نیلوفر کے چہرے پر پڑا ہوا گھونگھٹ اٹھا دیا۔

جھومر ٹیکے اور بڑی سی نتھ کے پیچھے افشاں کے نور سے جگمگاتا ہوا ایک ایسا چہرہ میری نظروں کے سامنے تھا جس نے فرشتوں جیسی معصومیت اور حوروں جیسا حسن پایا تھا۔ میرا پورا وجود ایک ناقابلِ بیان مسرت کے احساس سے جھوم اٹھا وہ تمام اندیشے جنہوں نے میرے دل و دماغ کو پریشان کر رکھا تھا پل بھر میں غائب ہوگئے میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"پروردگار تیرا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے۔"

میری نیلوفر زرتاج نہیں تھی اور نہ اس سے کوئی مشابہت رکھتی تھی۔ یہ خوفناک اندیشہ دل سے دور ہوتے ہی میری تمام ہچکچاہٹ اور تذبذب ختم ہوگیا۔ میں نے باتیں شروع کردیں اور جو کچھ میرے دل میں آیا کہتا چلا گیا۔ نیلوفر چپکے چپکے مسکراتی رہی یہاں تک کہ اس کا حجاب بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا اور جلد ہی ہم بڑی بے تکلفی سے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ پیار و محبت کی ان باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا، اچانک نیلوفر نے ایک انگڑائی لیتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا اور اپنا نرم و نازک ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیا۔

"اب سو جائیے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "کچھ وقت کا بھی اندازہ ہے، دو بج چکے ہیں۔"

آنکھیں نیند کے خمار سے بھاری تھیں مگر کس کمبخت کا جی سونے کو چاہ رہا تھا، اس کا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھا رہا اور میں بدستور باتیں کرتا رہا۔ پتہ نہیں کب یونہی باتیں کرتے کرتے مجھے نیند آگئی اور پھر میں نے ایک خواب دیکھا۔

میں نے دیکھا کہ میں پھولوں کی سیج پر نیلوفر کے پہلو میں لیٹا ہوا ہوں اس کا حنائی ہاتھ کسی معطر پھول کی طرح میری آنکھوں پر رکھا ہوا ہے، میں اگرچہ سویا نہیں ہوں مگر ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہونے لگی ہے، اچانک میں نے محسوس کیا کہ نیلوفر نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ میرے چہرے سے ہٹا کر مجھے غور سے دیکھا، جیسے یہ اطمینان

کرنا چاہتی ہو کہ میں جاگ رہا ہوں یا سو گیا ہوں عجیب بات تھی کہ آنکھیں بند ہونے کے باوجود میں اُسکی حرکات و سکنات کو اس طرح دیکھ رہا تھا، جیسے میری آنکھیں واقعتاً کھلی ہوں، وہ کچھ دیر تک مجھے دیکھتی رہی، پھر بہت ہی آہستہ سے مسہری سے نیچے اُتر گئی۔

میں نے کپڑے تبدیل کرتے کے وقت مالا اپنی جیب سے نکال کر الماری کے ایک خانے میں ڈال دی تھی اور پھر بعد میں گلے میں لٹکا ہوا حمائل شریف بھی کھول کر سرہانے میز پر رکھ دیا تھا۔ نیلوفر مسہری سے اُٹھ کر الماری کی طرف چلی قریب پہنچکر اسکے پٹ کھولے اور کچھ تلاش کرنے لگی. مجھے حیرت تھی کہ آخر وہ اس وقت الماری میں کیا دیکھ رہی ہے مگر یہ حیرت جلد ہی خوف میں بدل گئی کیونکہ میں نے دیکھا کہ اُسکے ہاتھوں میں سیاہ موتیوں کی مالا نظر آرہی ہے، جو اس نے میرے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے گلے میں پہن لی میرے دل میں دبے ہوئے اندیشے ایک ایک کرکے اُبھرنے لگے، ظاہر تھا کہ اس مالا سے صرف ایک ہی ہستی کو دلچسپی ہو سکتی تھی اور نیلوفر وہ ہستی نہیں تھی، مالا پہننے کے باوجود وہ الماری سے نہیں ہٹی۔ بلکہ جُھک کر اُسکے نچلے خانوں میں رکھے ہوئے ملبوسات اُٹھا اُٹھا کر ایک طرف ڈالنے لگی۔ پھر کوئی وزنی سی چیز نکال کر میری طرف گھومی اور میرے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہوگئی، یہ بلاشبہ زرتاج تھی، میں اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا مگر اُسی طرح آنکھیں بند کئے پلکوں کی اوٹ سے اُسکی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا اور جب میں نے اسکے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو سارے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ وہ پیتھر کے تین پیالے اُٹھائے ہوئے تھی۔

پیالے اُس نے کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی ایک چھوٹی میز پر رکھ دئے، دوبارہ الماری تک گئی اور اس مرتبہ صراحی نکال کر لائی جس میں سبز رنگ کا مشروب بھرا ہوا تھا، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں کے سامنے تاج نگر کی حویلی کا منظر گھوم گیا۔ کیا آج وہ پھر کسی قربانی کی تیاری کر رہی تھی، رہا سہا شک اس وقت دور ہو گیا جب وہ تیسری مرتبہ الماری سے خنجر نکال کر لائی، یہ وہی خنجر تھا جسے میں اشرف کی نبضوں میں ڈوبتے دیکھ چکا تھا۔

اور جیسے بجلی سی چمک جائے، آن واحد میں زرتاج کا پورا منصوبہ میرے ذہن میں واضح ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ زرتاج اور نیلوفر ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں، اس سے قطع نظر کہ ایسا شروع سے ہی چلا آرہا تھا یا نہیں، یہ بات طے تھی کہ میں جسے شہزاد نگر سے اپنی دولہن بنا کر لایا تھا وہ زرتاج ہی تھی، اس نے کچھ دیر کیلئے اپنے آپ کو ایک معصوم و حسین لڑکی کے روپ میں تبدیل کر کے مجھے بہ آسانی اپنے فریب میں پھانس لیا اب تک مالا حاصل کرنے کی اُسکی تمام کوششیں کلام الٰہی کی برکت سے ناکام ہوتی رہی تھیں اُسنے کئی تجربے کرنے کے بعد جب یہ دیکھ لیا کہ وہ اس طرح مجھ سے مالا نہیں چھین سکے گی تو ایک ایسا راستہ اختیار کیا جس میں سو فیصد کامیابی کا امکان تھا اس نے سوچا اور درست سوچا کہ حجلۂ عروسی ہی ایک ایسی جگہ ہو سکتی ہے جہاں وہ چند گھنٹوں کیلئے مجھے کلام الٰہی کے تحفظ سے محروم کر سکتی ہے اور ایسا ہی ہوا میں نہ صرف حمائل شریف اپنے گلے سے اُتار کر رکھ چکا تھا بلکہ ایسی حالت میں بھی نہیں تھا کہ اُسے اُٹھا کر دوبارہ پہن لیتا۔

وہ خنجر ہاتھ میں لئے مسہری کے قریب آئی میں اب اپنی نباٹ جاری نہیں رکھ سکتا تھا، چنانچہ میں نے اپنی آنکھیں کھولدیں۔ مجھے بیدار دیکھ کر اُس کے چہرے پر ایک بے رحمانہ تبسم اُبھرا۔

"اچھا ہوا کہ تم جاگ گئے" وہ بولی۔ "میں سوتے ہوئے دشمن پر وار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تم نے نہ صرف مجھے حد سے زیادہ پریشان کیا ہے بلکہ میری دائمی زندگی اور اس ایک مقصد کو بھی خطرے میں ڈالدیا ہے جس کی خاطر میں نے اپنے ایمان اور ضمیر کا سودا کیا ہے، جانتے ہو قربانی کی گھڑی قریب آتی جا رہی تھی صرف تین دن باقی رہ گئے تھے۔ اگر یہ مالا مجھے نہ ملتی یا اتفاقاً تمہارے ہاتھ سے ٹوٹ جاتی تو میں اپنے حُسن و شباب سمیت جل کر راکھ ہو جاتی۔"

"جب تمہیں مالا مل ہی گئی ہے تو اب میرے درپے کیوں ہو؟" میں نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ!"

"کیوں کیا مرنے سے ڈر لگتا ہے؟"

"نہیں۔ مگر میں ایسی موت مرنا نہیں چاہتا۔ جس کے بعد میرے جسم سے دُنیا میں شیطان کے مشن کو پورا کرنے کا کام لیا جائے"

"مگر اب یہ موت تمہارا مقدر بن چکی ہے"۔ زرتاج نے خنجر اُٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے مالا گم کرنے کی یہ سزا دی گئی تھی کہ اس مرتبہ ایک کے بجائے دو قربانیاں پیش کرنا پڑیں گی۔ وقت اتنا کم ہے کہ دو احمق اور دین سے بیگانہ لوگوں کو تلاش نہیں کر سکتی۔ تمہیں قتل کر کے مجھے دوہرا فائدہ ہوگا۔ قربانی بھی ادا ہو جائے گی اور میرا جذبۂ انتقام بھی سکون پا جائے گا"۔

"لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ میں اپنی روح پر تمہارا اختیار تسلیم کروں"۔ میں نے دفعتاً ایک نئے خیال کے زیر اثر کہا "اور یہ بات قیامت تک ممکن نہیں ہو سکتی"۔

"گھبراؤ نہیں۔ صراحی میں بھرے ہوئے آب حیات کا

ایک ہی گھونٹ تمہاری زبان سے میری مرضی کے مطابق الفاظ اگلوا سکتا ہے۔" زرتاج نے کہا اور پھر خنجر کی نوک میری گردن پر رکھتے ہوئے بولی۔ "اٹھو اور جیسا میں کہتی ہوں کرتے جاؤ ورنہ میرے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ اس خنجر کو تمہاری شہ رگ میں اُتار سکتا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ وہ محض دھمکی دے رہی ہے، وہ مجھے اس وقت تک قتل نہیں کر سکتی جب تک میں صراحی کا مشروب نہ پی لوں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اُسکی کلائی پر ہاتھ ڈال کر خنجر چھین لوں یا ایک دم اُٹھ کر اس کے گلے میں لٹکی ہوئی مالا نکال لوں کہ اُس نے میرے تذبذب کا اندازہ لگاتے ہوئے خنجر کی نوک پر دباؤ میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا۔ مجھے ایک تیز چبھن سی محسوس ہوئی اور بے اختیار میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

چیختے ہی میری آنکھ کھل گئی لیکن اگر میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا تو بیداری کا منظر بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھا زرتاج مجھے خشمگین نظروں سے گھور رہی تھی اور خنجر کی نوک میری گردن میں بُری طرح چُبھ رہی تھی، یہ بات کہ وہی نیلوفر بھی تھی اس عروسی لباس سے ثابت تھی جو اس وقت اُس نے پہن رکھا تھا۔ "اُٹھتے ہو یا میں تمہارا کام تمام کر دوں۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

میں نے یوں ظاہر کیا کہ جیسے میں اُسکی دھمکی سے بُری طرح خوف زدہ ہو گیا ہوں، کانپتے ہوئے مسہری سے نیچے اُترا، ڈگمگاتے قدموں سے اس میز تک آیا جس پر پیالے اور صراحی رکھی ہوئی تھی۔ "اب اس صراحی سے تھوڑا سا آبِ حیات اس پیالے میں انڈیلو۔" زرتاج نے حکم دیا۔

میں نے صراحی اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ بُری طرح کپکپا رہا تھا، صراحی پکڑی تو وہ بھی اس کپکپاہٹ کا شکار ہو گئی اور اس انداز سے جیسے اب گری اور اب گری، زرتاج جلدی سے اُسے سنبھالنے کیلئے جھکی۔ میں اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ جیسے ہی اس کا سر میرے قریب آیا میں نے جھپٹ کر مالا اُسکی گردن سے اُتار لی اور اس سے قبل کہ وہ اس اچانک صدمے سے سنبھل سکے سرہانے رکھی ہوئی میز سے حمائل شریف اُٹھایا اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سب سے پہلے اپنے پڑھنے کے کمرے میں گیا، کتابوں کی الماری کھول کر مالا اُسکے اندر رکھی اور پھر اُسے دوبارہ مقفل کر کے حمائل شریف اسکے ہینڈل میں لٹکا دیا۔ پھر اُسی طرح بھاگتے ہوئے امّی کے کمرے کا رُخ کیا اور زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

✻

امّی فوراً ہی گھبرا کر باہر آئیں۔ "کیا بات ہے منصور! کیا ہوا میرے بیٹے!" اُنہوں نے پریشانی سے پوچھا۔

"میں اس عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔" میں نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب تک کے واقعات نے میرے ذہن و اعصاب کو بُری طرح جھنجھوڑ دیا تھا اور مجھے خود احساس نہیں تھا کہ میں اس وقت کس لہجے میں بات کر رہا ہوں۔ "وہ عورت نہیں، کوئی چڑیل ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو بیٹے!" امّی حیرت سے میرا منہ تک رہی تھیں۔

"ہاں امّی! اس نے مجھے قتل کرنا چاہا تھا۔۔۔!" میں چیخ کر بولا۔ اتنی دیر میں ابا جان بھی گاؤن پہنتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ اُنہوں نے جو یہ الفاظ سُنے تو سناٹے میں آ گئے، امّی جان بھی یوں کھڑی تھیں جیسے اُنہیں سکتہ ہو گیا ہو۔

"آپ اسے صبح ہوتے ہی شہزاد نگر بھجوا دیں میں اس گھر میں اس ڈائن کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا میں اسے طلاق.....

امّی ایک دم جیسے ہوش میں آ گئیں اور اُنہوں نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "سوچ سمجھ کر بات منہ سے نکالو بیٹے!" اُنہوں نے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے"

"نہیں امّی! میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا ہے" میں نے بدستور چیختے ہوئے جواب دیا۔ "آپ جسے اپنی بہو بنا کر لائی ہیں اُس کا اصلی نام نیلوفر نہیں زرتاج ہے۔ وہ ایک چڑیل ہے جس کا کام شیطان کے کیلئے انسانوں کی قربانیاں دینا ہے۔ وہ اس سے قبل دو سو تیرہ نوجوانوں کے ساتھ شادی کر کے اُنہیں موت کے گھاٹ اُتار چکی ہے، آپ خود جا کر کمرے میں دیکھ لیں۔ وہ ابھی خنجر تانے کھڑی ہو گی۔"

امّی ایک لفظ کہے بغیر حجلہ عروسی کی طرف چل دیں، ابا جان اُن کے ساتھ ساتھ تھے مگر میں وہیں کھڑا رہا۔ ابا جان فوراً ہی واپس آ گئے۔۔۔ "نیلوفر تو بے ہوش پڑی ہے منصور! اور وہاں کوئی دوسری عورت نہیں ہے۔"

"وہی تو زرتاج ہے ابا جان!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹے"۔ ابا جان نے نفی میں سر ہلایا۔

"شاید تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے، وہ نیلوفر ہے۔"

میں لپک کر کمرے میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے میری نظر چھوٹی میز پر پڑی۔ مگر اب وہاں سے پیالے اور صراحی غائب ہو چکے تھے۔ مسہری پر کوئی عروسی جوڑا پہنے بے سدھ پڑا ہوا تھا اور امّی جان اُسے پنکھا جھل رہی تھیں، میں تیزی سے آگے بڑھا بلاشبہ وہ نیلوفر تھی، وہی حسین و معصوم چہرہ جسے میں نے گھونگھٹ اُٹھانے کے بعد دیکھا تھا مگر میں مطمئن نہیں تھا۔ "اس نے آپ کو دکھانے کیلئے اپنی صورت تبدیل کر لی ہے امّی! مگر میں جانتا ہوں کہ یہ زرتاج ہے۔" میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

دوسری صبح امّی اور ابا جان نے ہر چند مجھے سمجھانے کی کوشش کی، امّی نے نیلوفر کے بارے میں بتایا کہ اُسے اس واقعہ کا کوئی علم نہیں ہے اور نہ اُس نے (خدانخواستہ) تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ نیلوفر کو یہ بات سُن کر ہی اتنا صدمہ ہوا ہے کہ اُسکے آنسو نہیں تھم رہے ہیں، جب سے برابر روئے جا رہی ہے اور یہ کہ تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا تھا۔ مگر میں اپنی بات پر مصر رہا۔ یہی کہتا رہا کہ وہ نیلوفر نہیں، زرتاج ہے، اور نیلوفر بھی ہے تو اس نے یہ روپ محض دوسروں کو دھوکا دینے کے لئے اختیار کیا ہے۔ میں نے امّی کو اپنے گلے پر لگا ہوا زخم بھی دکھایا اور پوچھا کہ اگر آپ کے خیال میں میں نے کوئی خواب دیکھا تھا تو میرے گلے پر یہ زخم کہاں سے آیا۔

زخم دیکھ کر امّی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

"میں کیسے یقین کر لوں منصور کہ وہ معصوم لڑکی کوئی چڑیل، یا ڈائن ہو سکتی ہے۔ مجھے تو کوئی بزرگ تمہاری شادی سے پہلے بشارت دیتے رہے ہیں کہ میں ضرور نیلوفر کو تمہاری دولہن بنا کر لاؤں۔"

میں نے چونک کر امّی کی طرف دیکھا، ایک دم سے ذہن میں ان بزرگ کا چہرہ اُبھرا جنہیں میں خواب میں دیکھ چکا تھا اور میں نے بلا سوچے امّی کے سامنے اُن کا حلیہ بیان کر دیا۔

"کیا اُن بزرگ کا حلیہ بھی یہی تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بالکل یہی تھا۔" امّی حیران ہو کر بولیں۔

"تو مجھے اور بھی یقین ہو گیا ہے امّی! کہ یہ شادی زرتاج کی سازش سے ہوئی ہے۔" میں نے جوش کے ساتھ کہا۔ "وہ کوئی بزرگ نہیں تھا، زرتاج کا ساتھی تھا اور میرا اندازہ ہے کہ وہ ضرور شیطان ہی ہو گا۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" امّی اُلجھ کر بولیں "میں صرف اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ تم کسی شدید غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ نیلوفر کبھی ایسی نہیں ہو سکتی جیسا تم خیال کر رہے ہو۔"

"وہ جنت کی حور سہی، مگر میں اُسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا آپ ابھی اسے اُسکے باپ کے گھر پہنچا دیں۔" میں نے جواب دیا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

امّی اور ابا جان میں کوئی کانفرنس ہوئی اور پھر ابا جان کار لے کر کہیں چلے گئے۔ میں نے رات ہی غسل کر کے حمائل دوبارہ گلے میں پہن لیا تھا اور مالا بھی میری جیب میں رکھی تھی، اُن کے جانے کے بعد میں بڑی دیر تک اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا ان واقعات پر غور کرتا رہا معًا مجھے احساس ہوا کہ کہیں ابا جان نواب صاحب کو لانے شہزاد نگر تو نہیں گئے ہیں۔ نواب صاحب کیلئے میرے دل میں بڑا احترام تھا، مجھے پہلی مرتبہ خیال آیا کہ نیلوفر زرتاج ہو یا نہ ہو مگر موجودہ صورت حال ابا جان کے ساتھ نواب صاحب کے لئے بھی غم و افسوس کا باعث ہو سکتی ہے ابا جان اور نواب صاحب کی برسوں پرانی دوستی میں فرق آ سکتا ہے۔ اُن کے تعلقات خراب ہو سکتے ہیں اور میں بہرحال یہ نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے دھام پور میں تو رہنا نہیں ہے، میری بلا سے نیلوفر شہزاد نگر واپس جائے یا نہ جائے، امّی اُسے شوق سے اپنے پاس رکھیں۔ میں خود ہی اس گھر سے چلا جاتا ہوں۔

اور یہ فیصلہ کر کے میں نے جلدی جلدی اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اگر ابا جان نواب صاحب کو لینے گئے ہیں تو میں اُنکے آنے سے پہلے ہی یہاں سے چلا جاؤں۔ جمشید آباد کے لئے کوئی ٹرین سہ پہر سے پہلے روانہ نہیں ہوتی تھی مگر تین چار گھنٹے تو اسٹیشن پر بھی گزارے جا سکتے تھے۔ سوٹ کیس بند کر کے اُٹھا ہی تھا کہ میں نے نیلوفر کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا اُسکے حسین چہرے پر گہری افسردگی چھائی ہوئی تھی، آنکھیں روتے روتے سُرخ ہو گئی تھیں شہابی رنگ میں زردی جھلکنے لگی تھی، اُس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور میرے دل پر جیسے گھونسا سا لگا۔ بخدا اگر یہ زرتاج تھی تو میں نہیں جانتا تھا کہ اسکی آنکھوں میں مظلومیت کا اتنا گہرا تاثر کیونکر پیدا ہو سکا۔

"آپ کہیں جا رہے ہیں؟" اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں میں جمشید آباد واپس جا رہا ہوں۔" میں نے ترش لہجہ میں جواب دیا۔

"مجھے چھوڑ کر؟"

"ظاہر ہے کہ رات جو کچھ ہو چکا ہے اُسکے بعد میں تمہیں ساتھ رکھ کر ہر لمحہ اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔"

"آپ کو یقین ہے کہ میں..... میں اس حرکت کا تصور بھی کر سکتی ہوں جس کا الزام آپ مجھ پر لگا رہے ہیں۔" نیلوفر کی آواز بھر آئی۔

"تمہارے خنجر سے پہنچے ہوئے اس زخم کے بعد بھی شک کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔" میں نے گلے پر بندھی ہوئی پٹی دکھائی۔

"میری ایک درخواست قبول کریں گے۔۔؟"

"کیا ___؟"

"زحمت نہ ہو تو رات کے واقعات تفصیل سے بتائیں۔ آپ کو مجھ پر زرتاج کا شبہ کیوں ہوا؟ آپ اُسے کیسے جانتے ہیں اور اُسے آپ نے کہاں دیکھا تھا؟"

"تم تو اس طرح پوچھ رہی ہو جیسے بالکل ہی انجان ہو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تھوڑی دیر کیلئے مجھے انجان ہی تصور کرلیں۔"

میں نے اُسکی گہری سیاہ آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور وہاں مجھے محبت اور خلوص کے علاوہ اور کوئی جذبہ نظر نہیں آیا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی کہ ذہنی طور پر اُس سے متنفر ہونے کے باوجود میں نے اپنے دل کو اُسکی طرف جھکتے ہوئے محسوس کیا۔ اور اسی کیفیت نے مجھے رات کی گزری ہوئی داستان دُہرانے پر مجبور کر دیا۔

نیلوفر گہری توجہ سے میری باتیں سنتی رہی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ رفتہ رفتہ اُسکے چہرے کی زردی کم ہوتی جارہی تھی ___ "مجھے بھی کسی ایسی ہی بات کا شبہ تھا۔" میرے خاموش ہونے پر وہ بولی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپکے طرزِ عمل کی بنیاد ایک غلط فہمی ہے، ورنہ میں تو جیتے جی مرجاتی۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ زرتاج نے وہ مالا حاصل کرنے اور ساتھ ہی انتقاماً آپکے دل میں میری طرف سے نفرت پیدا کرنے کے لئے یہ چال چلی تھی۔" ایک دم سے دوزانو ہوتے ہوئے اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا ___ "میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں زرتاج نہیں آپ کی کنیز نیلوفر ہوں۔ زرتاج ہمارے خاندان کی ایک نواب زادی تھی جس نے دو سو سال پہلے ہوس میں اندھی ہو کر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا تھا ___"

"کیا ___ !!" میں نے چونک کر نیلوفر کی طرف دیکھا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے میرے بیٹے!" دروازے سے ایک آواز آئی!

میں نے تیزی سے گھوم کر دیکھا معلوم نہیں کس وقت اباجان نواب صاحب کو ساتھ لے کر کمرے میں آچکے تھے، شاید اُنہوں نے میری بیشتر کہانی بھی سُن لی تھی اس وقت مجھ سے مخاطب ہونیوالے نواب صاحب ہی تھے۔ اُنہیں دیکھتے ہی نیلوفر کے چہرے پر شرم کی گہری سُرخی نمایاں ہوئی، وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی دوپٹے کا آنچل درست کرتے ہوئے سر جھکا کر اُنہیں سلام کیا۔

نواب صاحب نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دُعا دی۔ اور میری طرف دیکھا۔

"یہ کوئی خوشگوار داستان نہیں ہے بیٹے! مگر مجھے تمہاری غلط فہمی دور کرنے کیلئے اُسے بیان کرنا ہی پڑیگا۔" اُنہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا ___ "آج سے دو سو سال پہلے ریاست شہزاد نگر پر نواب مہتاب الدین حکمران تھے اُس وقت ہمارے خاندان کو یہ ریاست ملے دو پشتیں گزر چکی تھیں نواب مہتاب الدین کی ایک ہی بیٹی تھی، جس کا نام زرتاج تھا۔ دہلی کی مغلیہ سلطنت کی عنان فرخ سیر کے ہاتھوں میں تھی اور ملک کے بیشتر حصّوں میں بغاوت کے آثار نمایاں تھے، خاص طور سے مرہٹے بہت پریشان کر رہے تھے، نواب مہتاب الدین اپنی فوج کے بڑے حصّے کے ساتھ مختلف مہموں میں شہنشاہ کے ہمرکاب رہنے کی وجہ سے زیادہ تر ریاست سے باہر رہا کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ زرتاج کی تربیت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی صحبت میں پروان چڑھنے والی نواب زادی راہ راست سے بھٹک گئی، وہ جتنی حسین اور خوبصورت تھی اُس سے کہیں زیادہ آوارہ مزاج اور نفس پرست بن گئی، کہتے ہیں کہ اُسکی ہوس اتنی زیادہ بڑھ گئی تھی کہ اُس نے پوری ریاست میں اپنے مخبر چھوڑ رکھے تھے۔ جو تندرست و توانا نوجوانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے تھے کوئی شب ایسی نہیں گزرتی تھی جب اُسکی خوابگاہ میں کوئی اجنبی نوجوان باریاب نہ ہوتا ہو، زرتاج اپنی آوارگیوں کو چھپانے کے لئے بڑی رازداری سے کام لیتی تھی، مگر تابکے ___ آخر یہ خبریں نواب مہتاب الدین کے کانوں تک بھی پہنچ ہی گئیں، اگر وہ اُس وقت ریاست میں ہوتے تو شاید اُسی لمحے تلوار کھینچ کر اُس ننگ خاندان کی گردن اُڑا دیتے۔

مگر جب غصّہ ٹھنڈا ہوا تو اُنہوں نے خاندان کو بدنامی اور رُسوائی سے بچانے کیلئے یہ بہتر سمجھا کہ زرتاج کی فوراً شادی کر دی جائے بات ابھی حویلی سے باہر نہیں پھیلی تھی۔ کئی ریاستوں کے نواب اور اُمراء اُسکے خواہش مند تھے مگر نواب صاحب نے ایک پنج ہزاری امیر سکندر بخت کے حق میں فیصلہ کیا۔ سکندر بخت بہت شریف خاندان سے تھا اور خود بھی نہایت جری اور شریف النفس تھا ایک طرف شادی کے انتظامات شروع ہوئے اور دوسری طرف نواب صاحب نے زرتاج پر کڑی نگرانی قائم کر دی تاکہ وہ آئندہ کوئی آوارگی اختیار نہ کرسکے۔

شادی کی خبر سُنتے ہی دور دور سے جوہری قیمتی زیورات لے کر نواب صاحب کے دربار میں آنے لگے۔ اُن ہی میں ایک جوہری ہامان بھی تھا۔ وہ نہایت حسین، اور تنومند نوجوان اور مذہباً آتش پرست

تھا۔ زرتاج، کڑی نگرانی کی وجہ سے کھل کھیلنے سے مجبور تھی، اور ہوس کی بڑھتی ہوئی طلب سے دن رات بے چین رہنے لگی تھی۔ ہامان نے دوسرے قیمتی زیورات اور بیش قیمت جواہرات کے ساتھ ہی ایک سیاہ موتیوں کی مالا بھی پیش کی۔ قاعدہ یہ تھا کہ جتنے زیورات آتے نوابصاحب پسند کرنے کیلئے زرتاج کو بھجوا دیا کرتے تھے، وہ مالا بھی زرتاج تک پہنچی اور جیسے ہی اُس نے اُسے اُٹھا کر گلے میں ڈالا اُس کا تمام اضطراب اور بے چینی ایک دم ختم ہوگئی، اُسے تجسس ہوا کہ یہ مالا کونسا جوہری لیکر آیا ہے اُس نے ہامان کو بُلایا اور دیکھتے ہی اُس پر فریفتہ ہوگئی اور عجیب بات یہ تھی کہ نواب صاحب کی کڑی نگرانی کے باوجود وہ ہامان سے چھپ چھپ کر ملتی رہی اور کسی کو اُسکی خبر نہ ہوسکی، یہاں تک کہ شادی کا دن بھی آگیا۔

سکندر بخت کے ساتھ اُسکی شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ اور نواب مہتاب الدین نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر اُنہیں معلوم نہیں تھا کہ زرتاج نے ہامان کے ساتھ سازش کر کے اُسی رات فرار ہونے کا منصوبہ بنایا ہے، نواب صاحب نے بیٹی اور داماد کو ایک ہفتے تک اپنی حویلی میں ہی قیام کرنے کیلئے کہا تھا، رات کے بارہ بجے تھے، نواب صاحب ابھی اپنے کمرۂ خاص میں پہنچے ہی تھے کہ ایک شور بلند ہوا، وہ گھبرا کر باہر نکلے، شور حویلی کے اُس حصّے میں ہو رہا تھا، جہاں سکندر بخت اور زرتاج کے لئے حجلۂ عروسی تیار کیا گیا تھا۔ فوراً ہی ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔ اُس نے بتایا کہ سکندر بخت قتل کر دیئے گئے ہیں اور زرتاج ہامان کے ساتھ حویلی کے خفیہ راستے سے دریا کی جانب فرار ہوگئی ہے۔ نیز سکندر بخت کے دستے کے سپاہی اُس کا تعاقب کر رہے ہیں۔

حفاظتی دستے کے سپاہی جلد ہی واپس آگئے اور اُن کے بیان کے مطابق زرتاج ہامان کے ساتھ دریائے کاویری میں کود کر غرقاب ہوگئی۔ اُن ہی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب سکندر بخت حجلۂ عروسی میں داخل ہوئے تو اُسکے دس پانچ منٹ بعد ہی ایک چیخ سُنائی دی ___ حفاظتی دستے کے سپاہی جو باہر پہرے پر موجود تھے، دریافت حال کے لئے آگے بڑھے ہی تھے کہ اُنہوں نے زرتاج کو ایک نوجوان کا ہاتھ پکڑے حجلۂ عروسی سے باہر نکل کر راہداری میں بھاگتے دیکھا، ایک سپاہی کمرے میں داخل ہوا تو اُس نے سکندر بخت کو مردہ پایا، اُن کی دونوں کلائیاں کٹی ہوئی تھیں، اُس نے جلدی سے یہ خبر دوسرے سپاہیوں کو دی اور وہ سب زرتاج کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔

نواب صاحب فوراً حجلۂ عروسی کی طرف لپکے، مگر وہاں ایک اور حیرت انگیز منظر اُن کا منتظر تھا۔ سکندر بخت کی لاش غائب ہوچکی تھی۔ نواب صاحب نے اُسی وقت دریا میں جال ڈلوا دیئے مگر دوسرے دن صبح تک تمام دریا کھنگال لینے کے باوجود نہ زرتاج کا کوئی پتہ چل سکا۔ نہ ہامان کا! بات جنگل کی آگ کی طرح پوری ریاست میں پھیل گئی سکندر بخت کے عزیز و اقارب ایک بڑی فوج لیکر ریاست پر چڑھ آئے اُن کا خیال تھا کہ نواب صاحب نے سازش کر کے سکندر بخت کو قتل کرایا ہے نواب مہتاب الدین انکے سامنے ہرگز اپنی صفائی پیش نہیں کر سکتے تھے اگر یہ خبر سُنکر ایک خدا رسیدہ بزرگ وہاں نہ پہنچ جاتے اُنہوں نے ساری داستان سُنی اور گہری افسردگی کے ساتھ بتایا کہ وہ جوہری ہامان نہیں خود شیطان تھا زرتاج کی ہوس نے اُسے شیطان کے قابو میں کر دیا تھا، وہ اس مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں کوئی انسان اُسے مطمئن نہیں کر سکتا تھا اُس نے اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کیلئے شیطان سے اپنی روح کا سودا کر لیا۔

بزرگ نے خدشہ ظاہر کیا کہ زرتاج جو کہ ڈوب کر بھی نہیں مری ہے شیطان کی خوشنودی اور اُس کا قرب حاصل کرنے کیلئے شاید اس بات پر مجبور کی جائے کہ وہ اپنے ذریعہ خدا کے دوسرے بندوں کو پھانس کر شیطان کے حوالے کرتی رہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ یہ کھیل آئندہ بھی اِسی حویلی میں کھیلا جاتا رہے، ممکن تھا کہ اس توجیہہ سے سکندر بخت کے عزیزوں کی تسلی نہ ہوتی مگر اُنہی دنوں یہ اُڑتی ہوئی خبر ملی کہ سکندر بخت زندہ ہے اور سلطان دہلی سے باغی ہو کر مرہٹوں سے جا ملا ہے بعد میں اس خبر کی تصدیق بھی ہوگئی۔ مگر یہ راز پھر بھی نہ کھل سکا کہ اگر وہ مرگیا تھا تو زندہ کیسے ہوگیا۔ اور اگر محض زخمی تھا تو اُسے کون اور کب اس حالت میں حویلی سے نکال کر لے گیا، یہ بات بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ سلطان کا وفادار ہونے کے باوجود باغی کیوں ہوگیا۔ بہرحال وہ اپنی فوجیں لے کر واپس چلے گئے۔ نواب مہتاب الدین نے اس منحوس حویلی کو تباہ کرنے کا حکم دیدیا۔ اور پھر دریا کے دوسرے کنارے پر نئے شہزاد نگر کی بنیاد ڈالی، اُن کا خیال تھا کہ اگر ان بزرگ کا اندیشہ درست ہے تو شاید اس طرح وہ شیطانی کھیل ختم ہو جائے گا مگر تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہوسکا اور زرتاج اب بھی خدا کے بندوں کو بہکانے میں مصروف ہے۔"

میں حیرت سے نواب صاحب کی یہ باتیں سن رہا تھا بہت سی باتیں جو پہلے میری سمجھ میں نہیں آئی تھیں اب آہستہ آہستہ واضح ہوتی جارہی تھیں۔

"اگر آپ سچ کہہ رہے ہیں۔" میں اُن کے خاموش ہونے کے بعد جوش کے ساتھ بولا۔ "تو بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ زرتاج

انسانوں کو شیطان کا آلۂ کار بنا رہی ہے بلکہ اُن کی قربانی دینے کیلئے وہ اب بھی پُرانے شہزادنگر کی حویلی ہی کو استعمال کر رہی ہے۔"

اور اس کے بعد میں نے تاج نگر اور اُسکی حویلی میں پیش آنے ہوئے تمام واقعات بھی نواب صاحب کو سُنا دئیے۔" وہ اپنی شیطانی طاقت سے ہر سال ایک مخصوص رات کو اس تباہ شدہ شہر کو اُسکی سابقہ حالت پر واپس لے آتی ہے۔" میں نے آخر میں کہا۔ "حویلی میں کچھ مقدس اور مخصوص رسموں کی ادائیگی کے بہانے نوجوانوں کو پھانس پھانس کر وہاں لاتی ہے اور اُنکی روح پر اختیار حاصل کر کے اُنہیں شیطان کا غلام بنا دیتی ہے، اس کے بعد اگرچہ وہ شخص مرتا نہیں مگر جب تک زندہ رہتا ہے دُنیا میں شیطان کے مشن کی تکمیل کا آلۂ کار بنا رہتا ہے، غالبًا یہی معاملہ سکندر رخیت کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" نواب صاحب نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے منہ سے تاج نگر کا نام سُن کر مجھے حیرت ضرور ہوئی تھی مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ اس معمولی سوال کے پیچھے اتنی افسوسناک داستان چھُپی ہوئی ہے۔"

"اگر یہ سب کچھ درست ہے۔" میں نے پھر کہا۔ "تو خود زرتاج کے اپنے کہنے کے مطابق وہ پرسوں ایک اور نوجوان کو وہاں قربانی کے لئے لانے والی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمیں اس نوجوان کو بچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔"

"مگر کس طرح ــــ؟" ابا جان نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"اس کا کچھ کچھ اندازہ مجھے ہوتا جا رہا ہے۔" میں نے جیب سے مالا نکالتے ہوئے جواب دیا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اس مالا کا ان تمام واقعات سے گہرا تعلق ہے اگر اُسے توڑ دیا جائے تو ممکن ہے کہ یہ طلسم بھی ٹوٹ جائے۔"

"تو یہ کام تو اب بھی ہو سکتا ہے۔" ابا جان نے کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔" میں نے نیلوفر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر دل و دماغ میں بیٹھا ہوا وہم دور کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ میں ایک ہی وقت میں زرتاج اور نیلوفر کو علیحدہ علیحدہ شخصیت کے روپ میں دیکھ لوں۔"

❁

تیسری رات کو ہمیں دھام پور سے روانہ ہونے میں تاخیر ہو گئی، وجہ یہ تھی کہ جب امی کو یہ سب باتیں معلوم ہوئیں تو وہ کسی طرح نیلوفر کو ہمارے ساتھ بھیجنے پر آمادہ نہ تھیں، بڑی دیر تک اُنہیں سمجھانے اور منانے کے بعد جب ہم لوگ (میں، نواب صاحب، ابا جان اور نیلوفر) گھر سے چلے تو انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ کار چلانے کے باوجود بارہ بجکر پانچ منٹ پر پُرانے شہزادنگر پہنچ سکے۔ مین روڈ سے دیکھنے پر وہ علاقہ بالکل سنسان اور غیر آباد نظر آتا تھا۔ مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ مگر جیسے ہی میں نے کار اس کچی سڑک پر موڑی اور درختوں کے جھنڈ سے آگے نکلا تو میرے سامنے ایک مرتبہ پھر اب سے ایک سال پہلے کی رات کا منظر درپیش تھا۔ زرتاج کا تاج نگر آج پھر اُسی طرح جگمگا رہا تھا۔ ہم جلد ہی حویلی پہنچ گئے۔ میں نے مالا جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لی تھی۔

میں نے حویلی کی چار دیواری پھاند کر اُس کا پھاٹک کھول دیا اور پھر ہم سب حویلی کی طرف بڑھے، میرا رُخ اُسی آتشدان والے کمرے کی طرف تھا، دروازہ بند تھا، مگر میں نے ایک لات ماری تو دھماکے کے ساتھ کھُل گیا۔ اندر کمرے میں بعینہ وہی داستان دہرائی جا رہی تھی، زرتاج کسی غیر ملکی نوجوان کو صراحی کا مشروب پیش کر رہی تھی، مجھے تعجب ہوا کہ وہ مالا کے بغیر اپنی قربانی کیسے پوری کر سکے گی مگر یہ ایسی باتیں سوچنے کا وقت نہیں تھا، دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی زرتاج نے پلٹ کر دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی ــــ "تو تم آ گئے؟" اُس نے کہا۔

"گویا تم کو میری آمد کی توقع تھی۔؟" مجھے کچھ اور تعجب ہوا۔

"ہاں، مجھے بتایا گیا تھا کہ تم آ رہے ہو!" زرتاج نے جواب دیا۔ "تم نے مجھے مصیبت میں ڈالدیا تھا، مگر بڑی منت سماجت کے بعد میرا آقا مجھے ایک اور موقع دینے کیلئے آمادہ ہو گیا ہے، مجھے تمہاری قربانی بطور سزا اور اس نوجوان کی قربانی اس عہد کے سلسلے میں ادا کرنی تھی۔ مگر اب اس نوجوان کی قربانی سزا کے حساب میں ہو گی جس کے لئے مالا کی ضرورت نہیں، اسکے بعد اگر تم نے مالا نہیں دی تو یہی کمرہ تم سب لوگوں کا مقبرہ بن جائے گا۔ پھر جب تم بھوک، پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دوگے تو مالا حاصل کرنے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئیگی۔"

اِن الفاظ کے ساتھ ہی کمرے کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُسے کھولنا چاہا، مگر وہ پتھر کی دیوار کی طرح جام تھا، ابا جان اور نواب صاحب پریشان نظر آ رہے تھے۔ نیلوفر بھی سہمی ہوئی کھڑی تھی، زرتاج نے ایک قہقہہ لگایا اور خنجر تان کر اُس نوجوان کی طرف بڑھنے لگی جو فرش پر پتھر کی بنچ کے سامنے دوزانو بیٹھا ہوا کسی مجسّمے کی طرح ساکت و جامد تھا۔

"ٹھہر جاؤ زرتاج!" میں نے مالا لہراتے ہوئے کہا۔ "میں آج تمہاری شیطنت کا خاتمہ کرنے آیا ہوں۔ تم یہ مالا دیکھ رہی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں یہ مالا توڑ دوں تو تمہارا یہ طلسم ابھی بکھر جائے گا۔"

زرتاج کا چمکتا ہوا چہرہ ایک دم فق ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میں نے مالا دونوں مٹھیوں میں پکڑ کر کھینچنی شروع کی اور زرتاج خنجر پھینک کر ایک دم میرے قدموں میں آ گری، وہ رو رہی تھی، گڑگڑا رہی تھی، رحم کی التجائیں کر رہی تھی دنیا بھر کی دولت، زر و جواہر اور ابدی زندگی حاصل کرنے کے لئے مجھے طرح طرح کی ترغیبات دے رہی تھی، ایک لمحہ کیلئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مالا میرے ہاتھوں سے پھسل کر گرنے لگی ہے۔ مگر اسی وقت میری نظریں نیلوفر کے حسین و معصوم چہرے پر پڑیں، دل کو ایک عجیب سی تقویت کا احساس ہوا۔ اور میں نے ایک زوردار جھٹکے سے مالا توڑ دی۔ ایک دم سے چاروں طرف گھُپ اندھیرا چھا گیا۔ تیز ہواؤں کے جھکّڑ چلنے لگے اور اس گہری تاریکی میں یوں سُنائی دیا جیسے ہزاروں بدروحیں ایک ساتھ بین کر رہی ہوں۔ پھر ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی، میں نے کسی کو اپنے بدن سے لپٹتے محسوس کیا۔ مہکتی ہوئی خوشبو نے مجھے بتایا کہ وہ نیلوفر ہے میں نے بے اختیار اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ بیسیوں کے چاند کی روشنی بھی پتہ نہیں کہاں غائب ہو چکی تھی، یہ صورت حال کم و بیش پانچ منٹ باقی رہی پھر آہستہ آہستہ ماحول پُرسکون ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ پھیکی چاندنی میں پُرانی حویلی کے کھنڈرات چاروں طرف پھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے، میرے سامنے چند قدم کے فاصلے پر وہ غیر ملکی نوجوان بے ہوش پڑا تھا اور اس کے بالکل قریب جلی ہوئی راکھ یوں پھیلی تھی کہ زمین پر ایک جسم کا خاکہ سا بن گیا تھا۔

❁

اس کے بعد صرف اتنا ہی اور کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اس نوجوان کو دھام پور لے آئے، دوسری صبح اُسے ہوش آ گیا اور جب اُسے تمام حالات کا پتہ چلا تو وہ بڑی احسانمندی کے ساتھ ہمارا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

نیلوفر سے میری بدگمانی دور ہو چکی تھی۔ اور اب اس راز کو راز ہی رہنے دیجئے کہ اس رات جب اُسے اور مجھے تنہا ہونے کا موقع ملا تو میں نے اُس سے کس طرح معافی مانگی اور اُس نے کس انداز میں معاف کیا۔ ایک خاص بات جو ہمیں دوسرے دن کے اخبارات سے معلوم ہوئی یہ تھی کہ جس رات زرتاج اپنے انجام کو پہنچی تھی اُسی رات اشرف بھی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ وہ اپنی گرفتاری کے خوف سے کہیں روپوش ہو گیا ہے، یا پھر کسی دور دراز کے ملک میں فرار ہو گیا ہے تاکہ وہاں ایک بار پھر اپنے ہتھکنڈے شروع کر سکے۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ اب کبھی اپنا شیطانی کاروبار شروع نہیں کر سکے گا۔

اپنی شادی کی سالگرہ منانے کے بعد میں اور نیلوفر دو تین سال تک پُرانے شہزادنگر جاتے رہے مگر وہ شہر خموشاں، جو سال میں صرف ایک رات کیلئے آباد ہوا کرتا تھا، پھر کبھی اپنی پُراسرار روشنیوں کے ساتھ جگمگاتا ہوا نظر نہیں آیا۔ اور میں اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ دو سو سال بعد ہی سہی۔ مگر اس شیطانی چکر کا سلسلہ تو ختم ہوا جسے ایک آوارہ مزاج نواب زادی کی بہکی ہوئی ہوس نے شروع کیا تھا۔

☼

میری! اس کہانی کا مقام مشرق کے وہ فسوں کار صحرا اور نخلستان ہیں جہاں کے مشقت آزما شب و روز پر نادیدہ اسرار کی دھندلائی ہوئی چادریں چھائی رہتی ہیں اور جہاں ہر طرف قرونِ اولیٰ و وسطیٰ کی پُر جلال اور ماورائی قوتیں حکمراں ہیں
اس کہانی نے جس قصبے سے جنم لیا وہ جبرین کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس قبیلے کے بسنے والے صحرائی قزاق عقیدے کے اعتبار سے آتش پرست اور اپنی صدیوں پرانی روایات کو سینوں میں چھپائے، مقدس آگ کے سائے میں روپوشی کی زندگی گزار رہے ہیں بیرونی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں اور اسی سبب سے ان کی رسوم و روایات میں اوہام پرستی کے نت نئے رنگ نظر آتے ہیں۔

اس کہانی کے اہم کرداروں میں جبرین کا طویل قامت، کشادہ بدن، مہیب صورت، پُرعزم، سخت گیر اور توانا سردار جوبا بھی شامل ہے اور نخلستان میں رہنے والا پُراسرار بوڑھا ماننی بھی!

ماننی جبرین کے واحد آتش کدے کا مقدس پروہت تھا اور عموماً بستی سے باہر لہلہاتے ہوئے نخلستان میں تنہا رہتا تھا۔ وہ جسمانی اعتبار سے نحیف مگر ذہنی اعتبار سے بڑا کا تیز تھا ـــــ بینائی سے محروم ہونے کے باوجود وہ جسموں سے اٹھنے والی مخصوص بُو کے ذریعے ہر انسان اور جانور کو بخوبی پہچان لیتا تھا۔ جبرین والے اور ان کا سردار جوبا تک ماننی اور اس کی پُراسرار قوتوں سے بُری طرح خائف رہتے تھے وہ بستی میں جدھر بھی نکل جاتا لوگوں کی گردنوں کا نخوت آمیز تناؤ فروتنی میں ڈھل جاتا۔ تیر کھوں آوازوں میں دھاڑنے والے بے رحم لڑاکا منمناتی ہوئی آوازوں میں اس نحیف و ناتواں بوڑھے کو تعظیم پیش کرتے نظر آتے جیسے ان کی روحیں ہمیشہ سے ماننی کی غلام ہوں۔

میں مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے ایک کارواں کے ہمراہ اس صحرا سے گزرتے ہوئے قزاقوں کا شکار ہو گیا سارا قافلہ خاک و خون میں نہلا دیا گیا اور مجھے جبرین کے ایک لاولد چرواہے نے جوبا کی اجازت سے منہ بولا بیٹا بنا لیا۔
جبرین کے قزاقوں میں پروان چڑھنے کے باوجود میں کبھی اس

مشرق کی فسوں خیز فضاؤں کی اجنبی داستان

تیسری قسط ○ اقلیم علیم

پیشے کو پسند نہ کر سکا میرے دل و دماغ میں اپنے آبائی پیشے سنگتراشی کی محبت رچی ہوئی تھی میں نے کسی نہ کسی طرح جوبا سے نخلستان میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی اور وہاں چوری چھپے سنگتراشی کی مشق کرنے لگا جو جبرین والوں کے نزدیک گناہ تھی!
پھر ماننی کو اپنی پُراسرار قوتوں کے ذریعے میرے شوق کا علم ہو گیا اور اس نے مجھے نوید دی کہ آسمانوں سے مجھے سرعام سنگتراشی کی اجازت مل چکی ہے۔ میں نے نخلستان میں پہلا مجسمہ تراشا جو غیر ارادی طور پر سردار جوبا کی جوان لڑکی زینو سے مشابہہ تھا۔ زینو بچپن سے میرے ساتھ کھیلی تھی اور میں اسے پسند بھی کرتا تھا مگر ماننی نے جوبا کی برہمی کے اندیشے سے وہ مجسمہ ریت میں دفن کرا دیا اس کی دانست میں اپنی بیٹی کے لئے پانچ سو قیراط سونے کی امید رکھنے والا جوبا کبھی یہ پسند نہ کرتا کہ جبرین کے ایک مفلوک الحال چرواہے کا بیٹا زینو سے چپکے چپکے محبت کرتا رہے۔
پھر ایک روز میں نے ماننی کے خیمے پر قرونِ اولیٰ کی طرز کی شہزادیوں کے لباس اور طلائی تاج میں ملبوس ایک حسین اور پُرشکوہ شہزادی کو دیکھا۔ ماننی نے مجھے للکارا اور میں بدحواس ہو کر بستی میں جا پہنچا مجھ پر تیز بخار اور ہذیان کی کیفیت کئی دن طاری رہی۔ اس دوران میں میرا منہ بولا باپ اونٹ کی پشت سے گر کر ہلاک ہو گیا۔
جوبا نے مجھے بستی میں سنگتراشی کی اجازت دینے سے سختی سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نخلستان میں ہی اپنا شوق پورا کر سکتا ہوں مگر مجھے تنہی کے تصور ہی سے وحشت ہونے لگی تھی میں نخلستان کا رخ نہ کر سکا۔
اسی کرب کے دوران میں مجھے علم ہوا کہ جوبا کی بیٹی زینو میری محبت میں گرفتار ہے لیکن میں اپنے دل میں اس کے لئے پسند سے بڑھ کر کوئی جذبہ محسوس نہ کر سکا اسی روز بستی میں مال غنیمت کے ساتھ لائی ہوئی ترکیوں کی آبروریزی پر ہاتھ ڈالنے کے وحشیانہ مظاہروں سے میں بل کر رہ گیا میری ماں نے جب روایات کے

خلاف میرے منہ سے جوبا کے خلاف باغیانہ باتیں سنیں تو فرطِ خوف سے اس کے دل کی دھڑکنیں خاموش ہوگئیں۔

اسی رات خواب میں مجھے مانینی کے خیمے والی حسین شہزادی نظر آئی۔ میں عالمِ خواب میں بنتِ نیل سے محوِ تکلم ہی تھا کہ اذیت سے آنکھ کھل گئی۔ نیم اندھا مانینی اپنی آہنی شام والی چھڑی سے مجھے پیٹ رہا تھا۔

وہ بنتِ نیل کی بو سونگھتا نخلستان سے میرے خیمے تک پہنچا تھا اور مجھے اس جرم کی سزا دینا چاہتا تھا کہ میں نے اس کی ایک باندی کو خواب میں دیکھنے کی جسارت کی تھی۔

مجھے خاصا زدوکوب کرنے کے بعد وہ بنتِ نیل کے بارے میں زبان بند رکھنے کا دھمکی آمیز حکم دیتا واپس لوٹ گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد مجھے علم ہوا کہ میری منہ بولی ماں پچھلی شب مر چکی ہے جھونپڑے پر سُرخ پرچم بلند ہوتے ہی جبرین والے تعزیت کے لئے میرے جھونپڑے پر آنے لگے اسی ہجوم کے عقب میں مجھے بنتِ نیل کا مسکراتا ہوا دعوت انگیز چہرہ نظر آیا اور میں دیوانہ وار اس کے پیچھے ہو لیا۔

میں محبت کے لازوال جذبے سے سرشار ہانپتا کانپتا اس کے تعاقب میں نخلستان تک پہنچا اور وہاں درختوں کے کنج میں اس نے اپنی کہانی سنائی۔

وہ وادیٔ نیل کے ایک حکمراں کی اکلوتی بیٹی تھی، طوسیہ اس کا نام تھا اور وہ مسلک کے اعتبار سے صنم پرست تھی۔ اس کے جری باپ نے دور دور کے علاقے قوت کے زور سے سر کیے اور آگ کو پوجنے والوں کو دل کھول کر خون میں نہلایا۔ اس کا یقین تھا کہ آگ بدی ہے اور اس کے پجاری ہرگز نیک نہیں ہو سکتے اس کے خوف سے بہت سے قبیلے بے سروسامانی کے عالم میں صحرا کی بے کراں وسعتوں میں روپوش ہوگئے۔ ان ہی میں جبرین والوں کا قبیلہ تھا جبرین والوں کے پروہت نے روپوشی کے بعد اپنی ذلت کا انتقام لینے کے لئے پراسرار قوتوں کے سہارے وادیٔ نیل کے اس حکمراں کی عزت پر وار کیا طوسیہ کی روح اس کے بدن سے روٹھ کر اس مجوسی پروہت کی قید میں آگئی اور اس کا بے جان بدن ایک دیو ہیکل صندلی معبد میں رکھ دیا گیا۔ اس طرح طوسیہ کی روح صدیوں سے نسل در نسل جبرین کے پروہتوں کی قید میں چلی آرہی تھی۔ اس کی رہائی اسی روز ممکن تھی جب اس کا راز عام ہو کر پروہت کے علاوہ جبرین کے ہر باسی کو معلوم ہو جاتا۔ ایسی صورت میں وہ دوبارہ اپنے جسم میں لوٹ سکتی تھی۔ میں نے اس کی کہانی عام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ گھبرا گئی اس طرح وہ تو ضرور آزاد ہو جاتی لیکن مانینی شکست کے بعد مجھے زندہ نہ چھوڑتا جبکہ وہ میری محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔

وہ صنم پرست تھی اور میں صنم تراش ۔۔۔ میں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں طوسیہ کے لئے محبت محسوس کی! اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ سردار جوبا کی لڑکی زینو مجھے پسند ضرور تھی لیکن مجھے اس سے محبت ہرگز نہیں تھی۔

نخلستان کی رومان افروز تنہائی میں میں نے طوسیہ کے کاکل و رخسار میں عجب طمانیت محسوس کی۔ وہ خود صرف ایک روح تھی اور مجھ سے ملاپ کے لئے اس نے سردار جوبا کی اکلوتی لڑکی، زینو کا پیکر چرایا ہوا تھا۔ زینو کے خدوخال وقتی طور پر طوسیہ کے نقوش میں ڈھل چکے تھے اور زینو اس سے لاعلم تھی۔

پھر اچانک مانینی اور جوبا وہاں آپہنچے اور مجھے طوسیہ کی جگہ زینو لیٹی ہوئی نظر آئی۔ مانینی اپنی پراسرار قوتوں کے سہارے فضاؤں میں رچی ہوئی بو سونگھ کر ساری کہانی سمجھ گیا لیکن طوسیہ کا نام نہ لے سکا۔ ادھر جوبا کو یقین ہو گیا کہ میں نے زینو کو گمراہ کر دیا ہے۔

جوبا نے طیش کے عالم میں زینو کو عاق کر دیا، میں نے اسے اپنی زرخرید کنیز بنا لیا اور پھر جوبا کے ایک غلام کی نگرانی میں قید کر دیا گیا تاکہ چاند کی آخری شب کو اس کی کنیزیں مجھے مقدس الاؤ پر الٹا لٹکا کر ہلاک کر سکیں۔

زینو جوبا کی چہیتی بیٹی تھی۔ شام کو جوبا نے مجھ کو فرار کی سنسنی خیز پیشکش کی۔ اس کے اور مانینی کے درمیان تفرقہ کی خلیج حائل تھی۔ جوبا کا منصوبہ یہ تھا کہ میں عاطیس دیوتا کا ایک بت تراشوں جسے کسی طرح مانینی کے خیمے پر پہنچا دیا جائے پھر جبرین والوں کو بہکا دیا جائے کہ مانینی چھپ چھپ کر پتھر کو پوجتا ہے، لوگ مشتعل ہو کر مانینی کے ٹکڑے اڑا دیتے اور جبرین پر جوبا کی گرفت مضبوط ہو جاتی اس خدمت کے صلے میں وہ مجھے اپنی بیٹی زینو اور او زاروں سمیت رہا کرنے کو تیار تھا جبکہ مجھے مانینی کی موت میں طوسیہ کی نجات نظر آرہی تھی،

میں نے اپنے خیمے میں عاطیس دیوتا کا بت تراشنا شروع کر دیا ادھر خبیث مانینی کے چند حربوں نے سردار جوبا کو بوکھلا کر رکھ دیا اور وہ اپنی سازش سے کنارہ کش ہو گیا مگر میں نے جان پر کھیل کر مجسمہ تیار کر ہی لیا۔

مجسمہ تیار کرنے کے بعد میں نے کسی نہ کسی طرح جوبا کے گونگے اور بہرے غلام، طالبس کو آمادہ کر لیا کہ وہ عاطیس دیوتا کا مجسمہ مانینی کے خیمے پر پہنچا دے گا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں ایک ایک پل گن رہا تھا کہ اچانک سردار جوبا آندھی اور طوفان بن کر میرے پاس آپہنچا اور سخت الفاظ میں طالبس کے بارے میں بازپرس شروع کر دی اور جب اسے پتہ چلا کہ طالبس خفیہ منصوبے پر گیا ہوا ہے تو وہ اوہام پرست شہ زور بوکھلا گیا اس نے مجھ پر بدعہدی کا الزام لگایا اور طالبس پر نحوست کے سایوں کا تصور اسے پریشان کرنے لگا۔

اس دوران میں گونگا اور بہرا غلام، طالبس انتہائی اذیت کے عالم میں وہاں آپہنچا۔ اس کی آنکھوں میں لرزا دینے والی ویرانی ناچ رہی تھی، اس کا داہنا ہاتھ کہنی کے جوڑ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کے زخم سے خون کے فوارے بہہ رہے تھے اور وہ بائیں ہاتھ میں اپنی داہنی کلائی اٹھائے چیخ چیخ کر ہذیانی قہقہے لگا رہا تھا ۔۔۔؟

سردار

جوبا کا قوی ہیکل اور سیاہ فام غلام، طالبس اپنی داہنی کلائی اپنے بائیں ہاتھ میں اٹھائے مشعل کے سامنے ہذیانی انداز میں چیخیں مار مار کر اچھل رہا تھا۔ اس گونگے اور بہرے غلام کے چہرے کے نقوش اذیت سے بگڑے ہوئے تھے اور اس کی بے معنی آوازوں میں لرزا دینے والی دہشت ناچ رہی تھی۔ اس کی داہنی کلائی کے ٹوٹے ہوئے جوڑ پر کہنی سے گہرے سُرخ خون کی لکیریں بہہ بہہ کر اس خیمے کے فرش کو لہو کا غسل دے رہی تھیں اور سردار جوبا کی دہکتی ہوئی غضبناک نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس اوہام پرست مجوسی کا چہرہ انجانی قوتوں کی دہشت سے بھی متاثر تھا۔ غصے اور خوف کے اس امتزاج نے اُس کے کرخت نقوش میں ناقابلِ بیان ڈراؤنا پن پیدا کر دیا تھا۔ "تو نے مجھ سے کھلی ہوئی بدعہدی کی ہے حسین!" وہ مجھ سے چند قدم دُور ٹھہر کر ہیجان آمیز آواز میں بولا۔

"بدعہدی نہیں سردار!" میں خوفزدہ آواز میں بولا "طالبس میرا تراشا ہوا دیوتا کا مجسمہ مانینی کے خیمے میں پہنچا آیا ہے یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔"

"میں نہیں مان سکتا"۔ جوبا اپنی مٹھیاں بھینچ کر غرایا "تو نے اپنی ساری عمر جبرین میں گزاری ہے اور تو خوب جانتا ہے کہ رات کی سیاہی میں کھلے آسمان کے نیچے نکلنے والوں پر نحوست کے سائے منڈلانے لگتے ہیں۔ طالبس اندھیرا پھیلنے کے بعد یہاں سے نکلا تھا اور تو دیکھ رہا ہے کہ اس کا داہنا بازو کسی نے بیدردی کے ساتھ کہنی کے جوڑ پر سے توڑ دیا ہے، طالبس تکلیف اور اذیت سے پاگل ہو چکا ہے!"

خوف سے میرے دل کی دھڑکنیں سست پڑنے لگیں اور میں اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "طالبس نخلستان تک پہنچ گیا تھا، مانینی اپنے خیمے سے غائب تھا۔ وہ مجسمہ ۔۔۔۔!"

طالبس کی ایک بھیانک چیخ سے فضا لرز اٹھی اور میری بات ادھوری رہ گئی۔ طالبس بوجھل اور بہکے ہوئے قدموں سے ناچتا ہوا تیزی سے میرے قریب آیا اور اپنی دہشت سے پتھرائی ہوئی سُرخ آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر اُس نے اپنا ٹوٹا ہوا بازو میرے پھٹے ہوئے گریبان میں پھنسا دیا اور ہذیانی قہقہے لگاتا ہوا پھرتی کے ساتھ میرے خیمے سے باہر کھلی فضا میں نکل گیا۔

طالبس کے ٹوٹے ہوئے خون آلود بازو پر نظر پڑتے ہی میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ طالبس کا وہ بازو واقعی درندگی کے ساتھ توڑا گیا تھا۔

میں نے بے اختیار اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ ٹوٹے ہوئے پتھروں کا وہ ڈھیر کچی زمین پر پڑا میرا منہ چڑا رہا تھا جسے چھیل چھیل کر میں نے پتھریلی چٹان میں سے، جوبا کی مرضی کے مطابق ایک دیوتا کا پیکر اُبھارا تھا۔

سردار جوبا چند منٹ تک پھٹی پھٹی نگاہوں سے طالبس کے خون میں نہائے ہوئے بے جان بازو کو دیکھتا رہا۔ باہر کی فضا میں گونجتے ہوئے طالبس کے ڈراؤنے قہقہے آہستہ آہستہ فاصلے پر معدوم ہوتے جارہے تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے جہنم کے عذاب میں مبتلا بے شمار روحیں ہواؤں کے دوش پر نوحہ کناں ہوں۔

"یہ دیکھ!" سردار جوبا پُرجوش آواز میں یہ کہہ کر تیزی کے ساتھ طالبس کے بے جان بازو کی طرف جھپٹا اور اُسے اُٹھا کر پُرجوش آواز میں بولا۔ "اس بازو پر نیزے کی نوک سے ایک نشان بنا ہوا ہے۔ مقدس آگ کی قسم یہ مانینی کا نشان ہے۔ جس سے جبرین میں میرے سوا کوئی واقف نہیں۔ طالبس مانینی کے ہاتھوں اس حال کو پہنچا ہے۔ میں نہیں مان سکتا، ہرگز نہیں مان سکتا کہ طالبس نے وہ مجسمہ مانینی کے خیمے پر پہنچا دیا ہے!"

یہ انکشاف میرے لئے لرزہ خیز تھا۔ میری نگاہیں بے اختیار نیچے جھکتی چلی گئیں۔

"تو نے مجھے تباہ کر دیا ہے حسین!" سردار جوبا میرے شانے جھنجھوڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اگر طالبس دن کی روشنی میں یہ کام کرتا تو شاید مانینی کے ہاتھوں برباد نہ ہوتا۔ وہ راتوں میں آزاد پھرنے والی بدروحوں کی نحوست کا شکار ہوا ہے۔ مانینی پُراسرار قوتوں کا حکمراں ہے۔ نادیدہ روحیں اُس کی غلام ہیں۔ نخلستان میں اُس کے خیمے پر روشن سائے ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ اس سے ٹکرانے والوں کو روئے زمین پر کہیں پناہ نہیں ملتی۔ تو اپنے آخری سانسوں پر ہے مگر مانینی میری زندگی کو قابلِ رحم بنا دے گا میں پاگل اونٹ کی طرح صحرا میں بلبلاتا پھروں گا اور مانینی بدروحوں کی طرح پاتال میں بھی میرے پیچھے لگا رہے گا میرا انجام بہت بُرا ہو گا بس ذرا ہی دیر میں مانینی میری بُو سونگھتا، یہاں پہنچنے والا ہے!" جبرین کا وہ شہ زور سردار اوہام کے بھنور میں پھنس کر کسی چوہے کی طرح سراسیمہ نظر آرہا تھا۔ اُس کی شجاعت بُزدلی میں ڈھل چکی تھی اُس کی چمکیلی آنکھوں میں غیر یقینی مستقبل کی تشویش اور بے رونقی نے ڈیرے ڈال دیئے تھے اور وہ طالبس کی کلائی پر کندہ، مانینی کے مخصوص نشان کو یوں گھور رہا تھا جیسے صحرا کی تاریک راتوں میں نظر آنے والا کوئی ڈراؤنا خواب حقیقت بن کر اس خون میں نہائی ہوئی کلائی میں سرایت کر گیا ہے۔

"تیر کمان سے نکل چکا ہے سردار!" میں نے کچھ دیر سکوت کے بعد دھیمی آواز میں کہا" اگر تم سچ کہتے ہو تو میرا تراشا ہوا مجسمہ بھی اب مانینی کے

قبضے میں ہوگا، ہمیں اس صورتِ حال سے نمٹنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیئے۔"

"تدبیر۔ اور تیرے ساتھ!" جوبا نے خوف اور حقارت سے میری جانب دیکھا" اب میں تجھے خوب سمجھ چکا ہوں حسین! تیری تیرہ بختی اب ثابت ہو چکی ہے، جس زمین پر تیرا سایہ پڑ جائے وہاں تو شاید سبزہ کبھی نہیں اُگ سکے گا۔ مانینی کے ساتھ ہی اب میں تجھ سے اور تیری رفاقت سے ڈرنے لگا ہوں"۔

جوبا کے ان بے رحمانہ الفاظ پر میں تڑپ اُٹھا۔ وہ الفاظ کی سیاہی میرے چہرے پر مل رہا تھا۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن میرے لب کانپ کر رہ گئے۔

"میں جا رہا ہوں" جوبا میرے چہرے پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے بولا" اب تیرا حشر مانینی کے ہاتھوں ہی ہوگا۔ مجھے زینو کی بھی پرواہ نہیں۔ جبرین کی چوپال میں بیٹھ کر اپنی آبرو لٹانا اس کا مقدر بن چکا ہے میں روایات سے بغاوت کرکے ذلیل اور رسوا نہیں ہونا چاہتا۔ شراب اور کنیزیں مجھے بلا رہی ہیں..... میں جا رہا ہوں!"

وہ چلا گیا اور میں اس پُرہول خیمے میں تنہا رہ گیا، طالیس کی ٹوٹی ہوئی، خون آلود کلائی جو با حقارت سے فرش پر پھینک گیا تھا—— ۔ فضا میں بہت دُور سے آنے والی، طالیس کی کربناک چیخوں اور بذیانی قہقہوں کی آوازیں میرے وجود میں خوف اور دہشت کی پھریریاں دوڑا رہی تھیں!

اس خونیں رات کا باقی حصّہ میں نے بڑی المناک حالت میں گزارا۔ طالیس کا مُردہ ہاتھ میں نے ڈرتے ڈرتے خیمے سے باہر پھینک دیا۔ طالیس کسی آوارہ بدروح کی طرح ساری رات جبرین کی بستی میں چیختا اور قہقہے مارتا آوارہ پھرتا رہا۔ کبھی اُس کی آوازیں اتنی دُور ہو جاتیں کہ اُن پر وہم کا گمان ہوتا اور کبھی وہ میرے خیمے کے آس پاس منڈلاتا ہوا محسوس ہوتا۔

اس رات میں خیمے میں تنہا تھا۔ جوبا اپنے خیمے میں جا کر شراب و شباب کی سرمستیوں میں اپنا خوف غرق کر رہا تھا، میرا محافظ مانینی کے خوفناک قہر کا نشانہ بن کر بستی میں دربدر مارا پھر رہا تھا۔ وہاں بظاہر کوئی نہ تھا جو میری راہ میں حائل ہوتا میرے فرار کی راہیں صاف تھیں لیکن میں اس قید خانے سے باہر قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ مقدس الاؤ کے خونی رکھوالے، مانینی کی دہشت سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چٹائیوں کے عقب سے نحیف و ناتواں مانینی کی چندھیائی ہوئی مگر خون آشام نگاہیں میری ایک ایک حرکت کی نگرانی کر رہی ہیں۔

اس رات مجھے ہر آن طوبیہ کا انتظار رہا۔ اس کے تصوّر سے دل کو ڈھارس سی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ بنتِ نیل میری اس بدنصیبی کا کوئی حل ضرور نکال سکے گی۔ مگر رات ڈھل گئی اور وہ نہ آئی۔ میرے کان

فضاؤں میں اُبھرنے والی ہر آہٹ پر جمے رہے لیکن وہاں طالیس کی دور سے لرزتی ہوئی چیخوں اور آوارہ ہواؤں کے آسیبی شور کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں فضا میں کانسی کی گھنٹیوں کا لاہوتی ترنّم سننے اور خوشبوؤں کا طوفان سونگھنے کو ترستا رہا اور مجھے یقین ہونے لگا کہ طوبیہ بھی مانینی کے عتاب میں مبتلا کی جا چکی ہے۔

اگلی صبح جوبا کے دو ہرکارے میرے خیمے میں آئے اور نیزوں کی نوک پر مجھے وہاں سے لے چلے۔ میرا بدن زخموں سے چور اور حواس منتشر منتشر سے تھے۔ باہر آکر میں نے طوبیہ کے فرحت آفریں سراپا کی تلاش میں بے تابی سے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ ہاں خیمے سے کچھ دور صحرائی ریت پر پروں سے محروم، لمبی گردنوں والے کئی مُردہ خور گدھ بھیانک چیخیں مارتے طالیس کے مُردہ ہاتھ کے لئے لڑ رہے تھے!

میں جوبا کے خاص خیمے میں پہنچا تو وہاں کی فضا ابھی تک گزری ہوئی رات کے خمار سے بوجھل تھی۔ کنیزوں کے بکھرے ہوئے بال، پامال چہرے اور چور نگاہیں بتا رہی تھیں کہ زمین پر لڑھکتی ہوئی خالی صراحیوں کی طرح اُن کے جسموں سے بھی پچھلی شب ہر لذت نچوڑ لی گئی ہے۔

جوبا کے بڑے بڑے بال بے ترتیبی اور وحشت کے ساتھ اُس کے چہرے اور شانوں پر لہرا رہے تھے۔ اُس کی بڑی بڑی خونخوار آنکھیں ابھی تک شراب کے نشہ سے دہک رہی تھیں۔ اُس کے کٹے پھٹے اور زخم خوردہ چہرے پر عجیب سی محرومی نمایاں تھی اور وہ خود فراموشی کے عالم میں اپنے بدن پر ایک قیمتی چادر ڈالے مسندِ خاص پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے برابر میں جبرین کا خوفناک پر دہشت، مانینی بیٹھا ہوا تھا۔

میرے اندر داخل ہوتے ہی مانینی نے فضا میں اپنا منہ اُٹھا کر کئی بار نتھنے پھلائے اور جذبات سے عاری، سرد آواز میں بولا "حسین آ گیا۔ کیا یہ زخمی ہے۔ میں اس کے زخموں سے رِستے ہوئے خون کی بُو سونگھ رہا ہوں۔"

سردار جوبا کی ڈراؤنی آنکھیں میری طرف اُٹھیں اور وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا " ہاں مقدس مانینی! تو سچ کہتا ہے۔ یہ واقعی اپنے خون میں نہایا ہوا ہے۔"

اس وقت تک میں مانینی اور جوبا کی مسند کے قریب فرش پر بچھے ہوئے قالین پر بٹھا دیا گیا تھا!

"میں تیرے پاس اس لئے آیا تھا جوبا کہ حسین کو مانگ لوں" مانینی کی آواز میں ہلکا سا طنز چھپا ہوا تھا۔

مانینی کے الفاظ پر جوبا نے بے چینی سے مسند پر پہلو بدلا۔ ایک ثانیے کے لئے اُس کے چہرے پر سیاہی آ کر گزر گئی۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اب مانینی پچھلی رات کے واقعات کا تذکرہ چھیڑ کر تھپ کے بُت اور طالیس کی کہانی دہرائے گا۔

"میں اب تک اپنی کنیزوں کے نیلام کے لئے تیرے گونگے اور بہرے غلام، طالیس کو ساتھ لیجاتا رہا ہوں" مانینی رُکے بغیر اپنی بات پوری کر رہا تھا۔ "لیکن یہاں آتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اُس کا داہنا ہاتھ ٹوٹا ہوا ہے اور وہ پاگلوں کی طرح جبرین کے در و دیوار سے سر ٹکراتا پھر رہا ہے!"

وہ خاموش ہو گیا۔ میرا دل خوف سے سُست پڑنے لگا۔ اُدھر جوبا کے چہرے کا رنگ بھی اُڑ گیا تھا۔ مانینی نے جس لاپروایانہ انداز میں طالیس کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی حالت کا سبب جاننے سے گریز کا اظہار کیا تھا وہ بہت زیادہ غیر فطری تھا کیونکہ مانینی جبرین میں ہونے والے ہر چھوٹے سے چھوٹے قصے کی جڑ تک پہنچنے کا عادی تھا! اُس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میری آمد سے قبل اُس نے جوبا سے پچھلی رات کے پُراسرار واقعات پر کوئی بات نہیں کی ہے۔

مانینی خاموش ہوا تو اُس کے ہونٹوں پر زہر میں ڈوبی ہوئی بے رحمانہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی جیسے سردار جوبا کو بے یقینی اور سنسنی میں مبتلا کر کے اُسے دلی خوشی ہو رہی ہو۔

"لے جا... تو خوشی سے حسین کو لے جا" جوبا اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر ہکلاتے ہوئے بولا "لیکن یہ منحوس ہے تجھے کنیزوں کے معقول دام نہیں مل سکیں گے۔"

مانینی زور سے ہنسا "منحوس ہے! تو کیسے کہہ رہا ہے؟"

جوبا بُری طرح بوکھلایا ہوا نظر آنے لگا۔ اُس کے ہونٹ کانپے لیکن وہ کوئی معقول بات نہ سوچ سکا۔

"خیر۔ کوئی راز کی بات ہوگی" مانینی کا لہجہ زہریلا اور بے رحمانہ تھا" لیکن تو جانتا ہے کہ مانینی نحوستوں کا علاج جانتا ہے۔ وہ رات کے اندھیروں میں خیمے سے باہر نکلتا ہے اور آج تک اُس کا کچھ نہیں بگڑا ہے!"

"راز کی بات نہیں مقدس مانینی!" جوبا اپنی دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ پڑتے ہی تلملا کر بولا "جبرین میں اُس کی عمر کے لڑکے آج بھی اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے لپٹ کر سوتے ہیں لیکن اس کی نحوست اس کے ماں باپ کو نگل چکی ہے اور یہ خود ذلیل و رسوا ہو کر اپنے انجام کا انتظار کر رہا ہے۔"

"اُس کی اُنگلیوں میں آذر کے مسلک کی نزاکتیں سوئی ہوئی ہیں جوبا" مانینی بولا تو اس بار میں نے بھی اس کے الفاظ میں نیزوں کی سی چُبھن محسوس کی" اپنے شب و روز کا خون کر کے دیوتاؤں کے صنم تراشنے والے منحوس نہیں ہوا کرتے!" یہ کہہ کر اُس نے جوبا کے شانے پر ہاتھ مارا اور زور زور سے ہنسنے لگا۔

میرے ذہن میں باریک باریک ٹانگوں والے سینکڑوں کنکھجورے رینگنے لگے شکستہ اعصاب پر ناقابلِ برداشت تناؤ چھانے لگا۔ مانینی الفاظ کے ہیر پھیر میں جوبا کو بتا رہا تھا کہ وہ پوری سازش سے اسی طرح باخبر ہے جیسے وہ خود اس میں شریک رہا ہو۔ اُس کے قہقہے میں اعتماد کی گونج تھی۔ جوبا کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا اور اُس کی قوّتِ گویائی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ اُس نے سراسیمہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور بے اختیار میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر مانینی سے کہوں کہ تو مکار ہے، تو سب جانتا ہے مگر ہمیں دہشت زدہ کرنے کے لئے کھُل کر اس کا اظہار نہیں کر رہا۔ ہاں میں نے اپنی راتوں کا خون کیا ہے، میں نے شب و روز محنت کر کے اپنی رُوح کے کرب کو پتھر کے بے رحم کلیجے میں اُتارا ہے، میں نے اپنی اُنگلیاں فگار کر کے ایک دیوتا کا بُت تراشا ہے اور ہاں! طالیس وہی مجسمہ لے جاتے ہوئے تیرے ہاتھوں گرفتار ہو کر تیری درندگی اور سزا کا نشانہ بنا ہے، مگر میں کچھ نہ کہہ سکا۔ مانینی کی خباثت کے سامنے میری زبان مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔

"تو اس کو آزاد کر دے"۔ کچھ دیر تک قہقہے لگاتے رہنے کے بعد مانینی نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا" میں اس کی نگرانی میں اپنی کنیزوں کو لے کر اس بار مشرق کی طرف جاؤں گا۔ سُنا ہے جبل کی بستی کے امراء اونچی بولیاں لگاتے ہیں۔"

"جبل۔!" سردار جوبا نے حیرت سے دُہرایا" وہ تو یہاں سے دور دراز کی مسافت پر ہے مقدس مانینی!"

"ہاں" مانینی اُس کے تحیّر کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا" میں اپنا سارا مال بیچ کر ایک ہفتے میں لوٹ آؤں گا۔ اس بار مجھے نخلستان میں اپنے لئے پتھروں کا مکان بنوانا ہے صحرائی آندھیوں میں ہر بار میرے خیمے کے تنکے بکھر جاتے ہیں اور پتھر بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اس بار مجھے پیسے کی ضرورت ہے۔"

"لل.... لیکن کل چاند کی آخری شب ہے حسین نے زینو کی آبرو لوٹی ہے۔ بستی کی روایت کے مطابق اس رات میری کنیزیں اسے مقدس الاؤ کے شعلوں اور دھویں پر اُلٹا لٹا کر ہلاک کریں گی"۔ سردار جوبا نے سراسیمہ لہجے میں ہکلاتے ہوئے کہا۔

"جبرین کا قانون مانینی کی مرضی کا دوسرا نام ہے جوبا!" مانینی کی آواز یک بیک کرخت ہو گئی" میں ارادہ بدل چکا ہوں۔ حسین زندہ رہ کر اس کا عذاب بھگتے گا۔"

سردار کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے۔ اُس نے اشارے سے کنیزوں کو رخصت کر دیا۔ اور دھیمی آواز میں بولا "مقدس مانینی میں تیرا ہر حکم مانتا ہوں مگر بستی والے روایت سے بغاوت پر میرے خلاف ہو جائیں گے

وہ یہی سمجھیں گے کہ میں نے اپنی زینو کو لاوارث ہو کر چوپال میں جانے سے روکنے کے لئے حسین کو معاف کیا ہے' تو یہ کیوں بھول رہا ہے کہ حسین نے زینو کو اپنی زرخرید کنیز بنا لیا ہے۔ جبرین والے اپنے نیزے زہر میں بجھا کر میرے اوپر آ پڑیں گے' میری کنیزیں بیٹی جائیں گی' میرے خیمے کو آگ لگا دی جائے گی اور میرا سر.... میرا سر ٹھوکروں میں لڑھکایا جائے گا۔"

"یہ سب میں نہیں جانتا۔" مانینی بے رحمانہ سنجیدگی کے ساتھ بولا "حسین زندہ رہے گا اور میں آج ہی اُسے ساتھ لے کر جبل کی بستی کی طرف جا رہا ہوں۔"

"نہیں نہیں.... یہ ظلم نہ کر مقدس مانینی!" سردار جوبا کی آواز بھرا گئی۔

"مانینی کی ہڈیوں پر اپنی سرداری قائم رکھنے کی سازش کرنے والوں پر ظلم روا ہے جوبا۔" مانینی مسند سے اُٹھتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا۔

"ہاں - میں نے تیرے خلاف سازش کی تھی۔" جوبا نے بے اختیار اپنے بال نوچ ڈالے "میں اندھا ہو گیا تھا' مگر پھر میں نے تیرے خوف سے راستہ بدل لیا حسین نے طالبیس کو بہکایا تھا' مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ مجسمہ طالبیس کب لے کر گیا۔"

"مجسمہ ؟ سازش ؟" مانینی نے مکارانہ معصومیت سے دہرایا۔ "جوبا تو کیا کہہ رہا ہے' تو میرا دوست ہے' تو ہرگز میرے خلاف سازش نہیں کر سکتا۔"

"مقدس مانینی !" سردار جوبا اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو پڑا۔ اس کے سارے بدن پر زلزلے کی سی کیفیت طاری تھی "تیرے دُکھ سے میرا کلیجہ چھلنی کرنا تجھے زیب نہیں دیتا.... مجھے معاف کر دے' مجھے معاف کر دے!"

"رونا بزدلی ہے جوبا" مانینی کا لہجہ زہریلا اور تیور خوفناک تھے "اگر جبرین کے شہ زوروں کو علم ہو گیا کہ اُن کا سردار بچوں کی طرح رو رہا ہے تو وہ ابھی تجھ پر یلغار کر دیں گے!"

جوبا کا بدن ایک بار تیزی سے کانپا اور وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی سُرخ سُرخ آنکھیں نمناک تھیں اور چہرے کے بگڑے ہوئے نقوش بھیانک لگ رہے تھے۔

"حسین نے طالبیس کو میرے نہیں تیرے خلاف بہکایا تھا" مانینی کے منہ سے رازدارانہ سرگوشی میں نکلے ہوئے یہ الفاظ میرے ذہن پر وزنی ہتھوڑوں کی طرح گرے "جوبا! تجھے دوست اور دشمن کی تمیز نہیں ہے۔ حسین نے طالبیس کو غلامی سے رہائی کا مژدہ سنا کر تیرے خلاف بغاوت پر اُکسایا تھا۔"

مانینی یہ کہہ کر تیزی کے ساتھ آگے جھپٹا اور سردار کی مسندِ خاص اُلٹ دی۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مانینی نے میری زبان مجھ پر ہی اُلٹ دی تھی۔ اِدھر مسند کے اُلٹتے ہی جوبا کے منہ سے دبی دبی تحیر آمیز غراہٹ نکلی اور اُس کی متحیرانہ نگاہیں میرے تراشے ہوئے پتھر کے اس دیوتا پر جم کر رہ گئیں جو مسند کے اُلٹتے ہی سامنے نظر آ رہا تھا۔

مجھے طوسیہ کی زبانی علم ہوا تھا اور میں خوب واقف تھا کہ جوبا کے غلام' طالبیس نے وہ مجسمہ مانینی کے خیمے میں پہنچانے کی کوشش کی تھی مگر مانینی ہوشیار تھا۔ اُس نے طالبیس کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر معذور کر دیا۔ اذیت سے اس گونگے اور بہرے غلام کا دماغ اُلٹ گیا اور وہ کسی کو اپنی کہانی سنانے کے قابل نہ رہا۔ مانینی نے مجسمہ اُس سے چھین کر اپنی پُراسرار قوتوں کے سہارے جوبا کی مسند کے نیچے چھپا دیا۔ اس طرح اُس نے جوبا کو دہشت زدہ کرنے کے ساتھ ہی میرے خلاف بھڑکا دیا تھا' وہ جانتا تھا کہ جبرین میں صرف جوبا ہی میرا ہمدرد ہے اس گھناؤنے حربے کے بعد جوبا کا دل میری طرف سے ہرگز صاف نہ ہوتا اور میں مانینی کے چنگل میں جا پھنستا۔

"حسین لعنت ہو تیری صورت پر' تیرے باپ دادا کی روحوں پر" جوبا میری طرف پلٹ کر کسی زخمی درندے کی طرح دہاڑا "تو نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے!"

"اس کی سازش بہت کامیاب تھی"۔ مانینی میرے اور جوبا کے درمیان نفرتوں کی خلیج بڑھائے جا رہا تھا "لیکن حسین یہ بھول گیا تھا کہ جب جبرین کی مٹی تک سو جاتی ہے تو مانینی جاگتا رہتا ہے۔ میں نے طالبیس کو تیرے خیمے سے نکلتے ہوئے پکڑا تھا اور پھر اُسے معذور کر کے آزاد کر دیا تاکہ اُس کے حشر سے سازش کرنے والے عبرت حاصل کر سکیں!"

"یہ جھوٹ ہے' یہ جھوٹ ہے!" میں وحشت زدہ آواز میں بول پڑا

"مانینی جھوٹ نہیں بولتا۔" جوبا مٹھیاں بھینچ کر غرایا "بس دو روز بعد تیری عبرتناک موت اٹل ہے!"

"نہیں جوبا" مانینی کی پُرعزم آواز اُبھری "تو بھول رہا ہے کہ مانینی کا ارادہ بدل چکا ہے۔ یہ اب میرا غلام بن کر زندہ رہے گا۔"

جوبا کے چہرے پر ایک بار پھر تذبذب جھلکنے لگا "مگر مقدس مانینی! میں بستی والوں کو کیسے سمجھاؤں گا؟"

بوڑھے مانینی کے چہرے پر کرختگی اُبھر آئی۔ اُس نے جوبا کو تحکمانہ انداز میں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی ان دونوں کے عقب میں خیمے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

مانینی نے جوں ہی دروازے سے پردہ اُٹھایا' جوبا کا چہرہ دھواں ہو گیا "کھیل ختم ہو گیا' پردہ گرا دے مانینی.... پردہ گرا دے!"

پھر ہم تینوں اندر لوٹ آئے۔

اس وقت جبرین کے سردار' جوبا کا خیمہ محاصرے کی حالت میں تھا۔ جبرین کے لوگ نیزوں' کمانوں اور ترکشوں سے لیس خیمے کے چاروں طرف موجود تھے۔ اور اندر میرا تراشا ہوا' دیوتا کا مجسمہ موجود تھا۔ جبرین والے یقیناً مانینی کی ہدایت پر ہی باہر جمع ہوئے تھے۔ اگر مانینی باہر نکل کر انھیں بتا دیتا کہ جوبا کے خیمے میں' مسند کے نیچے سے ایک بُت برآمد ہوا ہے اور جوبا چھپ کر اُسے پُوجتا ہے تو وہ سب وحشیانہ نعرے مارتے' آناً فاناً میں جوبا کے بدن کے ٹکڑے اُڑا کر اس کے خیمے کو آگ لگا دیتے۔

دوسری طرف جوبا اگر میرے بارے میں مانینی کی بات مان کر مجھے زندہ رکھنے کا فیصلہ کر لیتا تو شاید مانینی تو خاموش ہو جاتا لیکن جبرین والے روایت شکنی کے جُرم میں جوبا کے لہو سے ہولی کھیلنے پر اُتر آتے۔ جوبا کے لئے دونوں ہی صورتیں جانگسل تھیں۔

"یہ سب تیرے خیمے کے گرد میرے اشارے کے منتظر ہیں" مانینی کا چہرہ فاتحانہ شان سے دمک رہا تھا "انھیں کچھ علم نہیں کہ اس خیمے میں کیا کھیل ہو رہا ہے۔ اب اگر تو نے حسین کو میری مرضی کے مطابق میرے حوالے نہ کیا تو تو بُت پرستی کے الزام سے نہ بچ سکے گا اور یہ ابھی تجھے روند ڈالیں گے.... تو خوب سوچ لے' میں تجھے تھوڑی دیر کی مہلت دیتا ہوں۔ مجھے آخری فیصلہ چاہیئے۔"

جوبا کسی زخم کھائے ہوئے بھیڑیئے کی طرح بے چینی سے خیمے میں ٹہلنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شدید غصے کے ساتھ ہی بے بسی بھی ناچ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں کبھی اس مجسمے پر جم جاتی تھیں اور کبھی وہ مجھ کو پھاڑ کھانے والے انداز میں گھورنے لگتا تھا۔ مانینی قالین پر بیٹھ کر ایک صراحی سے شراب پینے میں منہمک ہو گیا تھا اور میں شدید اُلجھن میں مبتلا تھا۔

مجھے مانینی کی دھمکی اچھی طرح یاد تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میرا حشر اسی کے ہاتھوں ہوگا اور اسی لئے وہ میرے لئے جوبا سے سودے بازی کر رہا تھا۔ وہ مجھے اپنا غلام بنا کر میری مٹی پلید کرنی چاہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے زندہ رکھنے میں اُس کا کوئی بڑا مقصد کارفرما رہا ہو۔ پُوری بستی میں صرف میں ہی ایسا شخص تھا جسے طوسیہ کا راز معلوم تھا اور جس دن بھی طوسیہ کا راز جبرین والوں میں عام ہوتا' اسی روز نہ صرف وہ مانینی کی ظالمانہ قید سے رہا ہو جاتی بلکہ تباہی و بربادی مانینی کا مقدر بن جاتی۔ مانینی کو خوب علم تھا کہ مجھے طوسیہ سے محبت ہے مگر میں اپنی جان کے خوف سے طوسیہ کی کہانی اپنے سینے میں چھپائے پھر رہا ہوں۔ چاند کی آخری رات کو جب موت میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سینہ سپر ہو جاتی تو میں اپنی بے مقصد موت کے ذریعے شاید طوسیہ کی رہائی اور مانینی کی بربادی کا سامان کر جاتا۔ مقدس الاؤ کے شعلوں پر تڑپتے ہوئے جب میں چیخ چیخ کر طوسیہ پر مانینی کے ظلم کی داستان سُناتا تو اُس کی بازگشت جبرین کے ہر گھر میں گونجنے لگتی۔ یوں میں تو مر جاتا لیکن مانینی بھی زندہ نہ بچ پاتا۔ اس ملعون نے یقیناً مجھے مایوسی کے اس درجے پر پہنچ کر زبان کھولنے سے باز رکھنے کے لئے زندہ رکھنا چاہا تھا۔ اسے میری زندگی سے محبت نہیں تھی' وہ مجھے بے خبری کے عالم میں گھیر کر ہلاک کرنا چاہتا تھا تاکہ مرتے دم میں طوسیہ کا راز لوگوں تک نہ پہنچا سکوں۔ اور وہ خود نہ صرف زندہ رہے بلکہ طوسیہ کی معصوم رُوح سے اپنا آبائی انتقام لینے پر بھی قادر رہے۔

جوبا کافی دیر تک خیمے میں ٹہلتا رہا۔ فضا پر موت کا گمبھیر سکوت طاری تھا۔ آخر کسی خیال کے تحت جوبا کی آنکھیں تیزی کے ساتھ چمکنے لگیں اور وہ مانینی کے قریب جا پہنچا۔

"آج میں تجھے بتاتا ہوں کہ میں عاطبیس دیوتا کی کہانی سے باخبر ہوں" اُس نے مانینی کے شانے دبوچ کر جوشیلی آواز میں کہا۔ "تو راتوں کی سیاہی میں عاطبیس دیوتا کا رُوپ دھار کر جبرین کی کنواریوں کے بستروں میں سوتا رہا ہے۔ عاطبیس کی کہانیوں سے جبرین کی ہر عورت باخبر ہے لیکن مرد لاعلم ہیں۔"

ایک ثانیے کے لئے مانینی کا شکن آلود چہرہ پھیکا پڑ گیا لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور قہقہہ لگا کر بولا "باہر کوئی یقین نہیں کرے گا کہ مقدس الاؤ کا رکھوالا' مانینی راتوں کی سیاہی میں جبرین کی کنواریوں کو عاطبیس دیوتا کا فریب دیتا ہے' وہ تجھ سے اس کا ثبوت مانگیں گے!"

"میرا مقصد وہ نہیں جو تو سمجھ رہا ہے"۔ جوبا کی آواز بدستور جوشیلی تھی "تیرا نام درمیان میں لائے بغیر میں اپنی جان بچاؤں گا اور ہاں - میں حسین کو تیرے حوالے کرتا ہوں۔"

"میں نہیں سمجھا کہ تو کیا کہہ رہا ہے!" مانینی کی آواز میں تحیر سمٹ آیا۔

"باہر چل کر تو سب کچھ سمجھ جائے گا۔ عاطبیس دیوتا کا مجسمہ کسی نے نہیں دیکھا' ہماری پچھلی نسلیں اسی کی پُجاری تھیں۔ میں حسین کے تراشے ہوئے مجسمے کو عاطبیس دیوتا کا پیکر کہوں گا اور تو دیکھے گا کہ جوبا کس طرح جبرین والوں کے قہر سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے!"

پھر جوبا میرے اور مانینی کے ہمراہ خیمے سے باہر نکل آیا۔ اس کے بدن پر ابھی تک چادر لپٹی ہوئی تھی۔ باہر آ کر وہ مٹی کے چبوترے پر جا چڑھا خیمے کا محاصرہ کرنے والوں میں دبی دبی' بے چین سرگوشیاں اُبھریں لیکن جوبا نے پُراعتماد انداز میں ہاتھ اُٹھا کر انھیں خاموش کر دیا اور پلٹ کر خیمے کی طرف دیکھنے لگا۔

جب اُس کے آدمیوں نے پتّھر کا بُت اُس کے قدموں میں لا کر رکھا تو خیمے کے چاروں طرف پھیلے ہوئے لوگ سمٹ سمٹ کر چبوترے کے سامنے جمع ہونے لگے۔ اُن کے تیور چڑھتے جا رہے تھے اور ہاتھ ترکش کی جانب بار بار بڑھ رہے تھے!

"سنو اِس بستی کے رہنے والو!" جوبا کی آواز گونجیلی اور پُراعتماد تھی "تم جانتے ہو کہ سینکڑوں برس پہلے تمہارے باپ دادا عاطیس دیوتا کی پرستش کرتے تھے۔ فتح و کامرانی، زندگی اور خوشحالی کے لئے وہ اسی کے سامنے گڑگڑایا کرتے تھے۔" مجمع میں بے چینی کی لہر شدید ہوگئی۔ پیچھے والے پنجوں کے بل اچک اچک کر چبوترے پر پڑے ہوئے مجسّمے کو دیکھنے کے لئے بے چین نظر آنے لگے مگر جوبا رُکے بغیر جوشیلی آواز میں کہتا رہا "پھر اُن کو معلوم ہوا کہ اس دنیا کی سب سے بڑی قوّت آگ ہے اور اس کی پُوجا ہی میں نجات اور خوشحالی پوشیدہ ہے۔ انھوں نے عاطیس کے بتوں کو آگ میں جلا کر اپنا مسلک بدل لیا۔ پھر وہ دَور آیا کہ ہم بُت پرستوں کے ہاتھوں رسوا ہوگئے۔ اپنی جانوں کے خوف سے ہم نے صحرا کے اس گمنام گوشے کو اپنا ٹھکانا بنا لیا اور یہاں آگیاری تعمیر کر کے مقدّس الاؤ روشن کر لیا جو آج تک اپنی روشنی سے ہمارے دلوں کو منوّر کر رہا ہے لیکن سنو کہ ہم اب بھی عاطیس دیوتا کے اثر میں ہیں۔ آسمانوں سے خبر آئی ہے کہ عاطیس دیوتا راتوں کی سیاہی میں جبرین کی کنواریوں کی کوکھ میں زرخیزی کے جوہر بکھیرتا رہا ہے... ٹھہرو، خاموشی سے سنو!" وہ اونچی اور بے چین سرگوشیوں پر زور سے دہاڑا "یقین نہ ہو تو جاؤ، مقدّس آگ کی قسم دے کر اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے پوچھ لو۔ وہ سچی ہیں تو تم یہ سب جان جاؤ گے۔" مجمع پر موت کا سا سکوت چھا گیا "بستی کی روایات کا مجرم حسین ایک سنگتراش ہے۔ تم میرے قدموں میں جو مجسّمہ دیکھ رہے ہو وہ اسی نے تراشا ہے۔ یہ عاطیس دیوتا کا مجسّمہ ہے"

مجمع میں ایک دم شور و غل بلند ہوا۔ کئی کمانوں سے پیاسے تیر اُڑتے میری طرف آئے اور میں چیخ مار کر مانینی کے عقب میں چھپ گیا۔ جوں ہی جبرین کے قزاقوں کی دیوار حرکت میں آئی مانینی بھی اچھل کر چبوترے پر جا چڑھا اور جوبا کے ہمراہ مشتعل لوگوں کو پُرسکون رہنے کا حکم دینے لگا۔

مانینی کے دخل کا خاطر خواہ اثر ہوا، بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے، تیر اپنے اپنے ترکشوں میں لوٹ گئے لیکن ان سب کی بُھوکی نگاہیں اب بھی میرے اوپر جمی ہوئی تھیں۔

"کیا تم سب بہرے ہوگئے ہو، دیکھو جبرین کی فضا طالیس کی دہشتناک چیخوں سے ابھی تک لرز رہی ہے، حسین کے اوزار خود بخود اس کے پاس پہنچے اور یہ چپکے چپکے عاطیس کا بُت تراشتا رہا۔ پچھلی رات اس کے محافظ، طالیس کو پتہ چلا کہ اُس کے مزار کا قیدی سنگتراشی کرتا رہا ہے تو وہ مشتعل ہو کر حسین پر ٹوٹ پڑا لیکن اس سے پہلے کہ طالیس حسین کی گردن توڑتا، عاطیس کا بت زندہ ہو کر اس سے لپٹ گیا" سردار کی آواز میں ڈرامائی طور پر خوف اُبھر آیا "اور پھر اس کا داہنا ہاتھ کہنی کے جوڑ سے اکھاڑ دیا اور اب تم دیکھ رہے ہو کہ طالیس پاگل ہو کر جبرین کے طول و عرض میں سر ٹکراتا پھر رہا ہے۔ طالیس کا حشر دیکھ کر میں ڈر گیا ہوں حسین پر عاطیس دیوتا کی مہربانیوں کا سایہ ہے۔ ہم کتنے بھی شہ زور ہوں لیکن دیوتاؤں سے نہیں لڑ سکتے!"

جوبا نے قدرے توقّف اختیار کر کے مجمع پر نگاہیں دوڑائیں۔ ان سب کے تیور اُتر چکے تھے۔ چہروں پر حیرت اور نگاہوں میں خوف سمٹ آیا تھا۔ جوبا نے اپنے اوہام پرست قبیلے کی دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ ڈال دیا تھا اور وہ سب اپنے قہر و غضب کو بھول کر جوبا کے بولنے کے منتظر تھے۔

"زینو میری بیٹی ضرور ہے!" جوبا پھر بولنے لگا "مگر مقدّس الاؤ کی قسم میں اسے چوپال سے بچانا نہیں چاہتا، میں اسے عاق کر چکا ہوں، وہ اب میری بیٹی نہیں ہے، اس پر تمہارا حق ہے، تم چاہو تو اس کے بال پکڑ کر اسے ابھی چوپال میں لے جاؤ مگر میں حسین کی سزا میں فریق نہیں بن سکتا، میں اس وقت سے ڈرتا ہوں جب میں بھی عاطیس کے قہر کا نشانہ بن کر طالیس کی طرح جبرین کی گلیوں میں چیختے پھرنے پر مجبور ہو جاؤں!"

سردار جوبا کے خاموش ہوتے ہی ہجوم میں سرگوشیاں اُبھرنے لگیں طالیس کی اندوہناک چیخیں اس وقت بھی فضاؤں کے دوش پر آوارہ تھیں اور وہ سب لوگ فیصلہ کی قوّت کھو چکے تھے!

جوبا نے خاموشی کے دوران ان سب کے ذہنی خلا کا اندازہ لگایا اور اُن کے سنبھلنے سے قبل ہی اپنی تجویز بیان کرنے لگا "حسین مجرم ہے، اسے کسی قیمت پر آزاد نہیں کیا جا سکتا۔ بس یہی کافی ہے کہ ہم اس کا خون نہیں بہائیں گے میری تجویز ہے کہ اُسے تا زندگی مقدّس مانینی کی غلامی میں دے دیا جائے۔ تپتے ہوئے سُورج کی روشنی میں نخلستان کی مشقت اس کے لئے عذاب سے کم نہ ہوگی!"

ہجوم نے نیزے اُچھال اُچھال کر اپنی تائید کا اعلان کیا۔

"لیکن اس مجسّمہ کا کیا ہوگا؟" مجمع میں سے کوئی پُوری قوت سے چیخا۔

"بستی میں کئی سرکش اونٹ موجود ہیں۔ اس مجسّمہ کو کسی پاگل اونٹ کی پشت سے باندھ کر اُسے کھلے صحرا میں دُور تک ہانک دیا جائے گا اسی طرح ہم اس بُت سے چھٹکارا پا سکتے ہیں!" جوبا کے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے۔

فضا جبرین کے قزاقوں کے وحشیانہ نعروں سے لرز اٹھی۔ وہ سب جوبا کے ہمنوا تھے۔

"اب اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ، میں نے اسی لئے تمہیں یہاں بُلایا تھا" مانینی نے تحکمانہ آواز میں اُن سے کہا اور وہ ٹولیوں کی صورت میں وہاں سے لوٹنے لگے۔

جوبا اور مانینی کی نگاہیں چار ہوئیں اور میں ان کے چہروں کی تحریر پڑھ کر کانپ اُٹھا۔ اپنا وقار اور بھرم جیت لینے پر جوبا کی آنکھوں میں خونخوار سُرخی جھلک آئی تھی۔ ان دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لئے چیلنج اور خون کی پیاس اُبھر آئی تھی۔ سردار اور مقدّس پروہت کے درجے سے گر کر وہ دونوں ایک دوسرے کے خون آشام حریف بن چکے تھے۔

جوبا واپس اپنے خیمے میں جا گھسا۔ مانینی نے مالکانہ شان سے میری طرف دیکھا اور پھر میرا ہاتھ تھام کر مجھے اس جانب لیتا چلا گیا جہاں ایک کھونٹے سے اس کا اونٹ بندھا ہوا تھا۔

مانینی کے قدموں کی مانوس آہٹیں سُن کر وہ اونٹ محبت بھرے انداز میں بلبلاتا ہوا، بے چینی کے ساتھ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ مانینی نے اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اُچھل کر اُس کی پشت پر سوار ہوگیا۔ اونٹ ایک ہچکولا لے کر تیزی سے سیدھا ہوگیا، مانینی نے اونٹ کے سنبھلنے پر اُس کی چرمی نکیل میرے منہ پر اچھال دی "نخلستان کا راستہ تیرا دیکھا بھالا ہے لیکن ذرا احتیاط سے کام لینا ہوگا، یہ اونٹ بڑا سرکش ہے"

میری پیشانی پر مانینی کی غلامی کی مہر ثبت کی جا چکی تھی۔ میں نے نکیل کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور اپنے نئے آقا کی سواری کو نخلستان والی راہ پر ڈال دیا۔

جوبا کے خیمے سے گھروں کو لوٹنے والے لوگوں کی ٹولیاں رک رک کر مقدّس مانینی کو تعظیم دینے لگیں۔ وہ سب نفرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے پارساؤں کی بستی میں کوئی راکھشش گھس آیا ہو۔ میں زیادہ دیر تک اُن کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور مجرموں کی طرح نگاہیں جھکا لیں۔

راستے بھر میں اپنی بدنصیبی اور بے بسی کی دنیا میں کھویا رہا اور جب بستی سے نکلنے کے بعد لہلہاتا ہوا نخلستان نظر آیا تو بے اختیار میرا دل تڑپ اٹھا، نگاہیں بے قراری کے ساتھ طوبیہ کی تلاش میں بھٹکنے لگیں لیکن اس کا کہیں نشان نہیں تھا۔ بنتِ نیل صحرا کی وسعتوں میں کہیں گم ہو چکی تھی!

"تو جسے ڈھونڈھ رہا ہے وہ سزا بھگت رہی ہے۔ مانینی کی مرضی سے انحراف کرنے والے کبھی خوش نہیں رہتے۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ میں ہر روز نخلستان سے کسی لمبے سفر پر چلا جاتا ہوں لیکن میری نگاہیں باجرے کے پودوں کی اوٹ سے اُس کا پیچھا کرتی رہتی تھیں۔" ویران علاقے میں آنے کے بعد مانینی نے سرد آواز میں کہنا شروع کیا "وہ مجھ سے چھپ چھپ کر تجھ سے ملتی تھی اور میں نے اسے بہت دُور اِن پہاڑوں کے دھواں اُگلتے دہانے میں قید کر دیا ہے جن کے سینوں میں مقدّس آگ کے الاؤ انگڑائیاں لیتے رہتے ہیں۔ وہاں جہنّم کی گرمی اور دماغ کو اُلٹ دینے والی زہریلی ہواؤں کا راج ہے۔ میں اسے مجبور کر دوں گا کہ وہ تجھے کسی خواب کی طرح بھول جائے۔ مانینی کے سامنے پتھروں میں بھی دراڑیں پڑ جاتی ہیں، وہ تو صرف ایک رُوح ہے، جبرین والوں کے آبائی دشمن کی اکلوتی بیٹی کی رُوح جس کا کوئی ساتھی اور ہمدرد نہیں۔"

میں نے سر گھما کر کرب آلود نگاہیں مانینی کے چہرے پر ڈالیں تو وہ آپے سے باہر ہوگیا "اب تو مانینی کا غلام ہے، اگر آئندہ مجھ سے نگاہیں چار کرنے کی گستاخی کی تو انھیں جھلسا دوں گا۔"

اُس کی آواز کی کڑک سے اونٹ بھڑک اُٹھا اگر میں نکیل کھینچنے میں ذرا بھی سستی سے کام لیتا تو مجھے رُوندتا ہوا آگے نکل جاتا۔

مانینی نے مجھے اپنے خیمے سے دور نخلستان میں چھوڑ دیا اور خود آگے بڑھتا چلا گیا۔

نخلستان میں اُگی ہوئی سبزیوں کے چھوٹے چھوٹے قطعات پر مانینی کی جوئے میں جیتی ہوئی کنیزیں کام کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے سوگوار اور پتھرائے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک دوشیزگی کی حدود میں تھی۔ اُن کے خوبرو چہروں اور دلفریب نقوش پر چھائی ہوئی بے رونقی ہولناک حد تک غیر فطری لگ رہی تھی۔ انھوں نے دہشت زدہ نگاہوں سے مانینی کو اپنے اونٹ پر سوار، خیمے کی طرف جاتا دیکھا اور مشینی طور پر اُن کے ہاتھوں کی رفتار تیز ہوگئی۔ مانینی سے گزر کر اُن کی نگاہیں میرے سراپا سے سرسری طور پر پھسلتی ہوئی دوبارہ منڈیروں، پانی کی نالیوں اور پودوں پر جم گئیں۔ جیسے اُن کے نزدیک میرا وجود قطعی غیر اہم ہو۔

میں نے میٹھے پانی کے کنوئیں سے دُور دراز قطعات تک نگاہیں دوڑائیں، وہ تعداد میں کسی طرح تیس سے کم نہیں تھیں، میرے قریب ہی سُتے ہوئے اور غمگین چہرے والی ایک لڑکی پانی کی نالیوں سے کیچڑ اور خشک پتّے نکال کر کنوئیں سے آنے والے پانی کی گزرگاہ بنا رہی تھی۔

میں اس کے قریب جا پہنچا لیکن میری آہٹوں نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا۔ وہ سر جھکائے تیزی کے ساتھ اپنا کام کرتی رہی۔ میں نے ایک بار آہستگی سے کھانسا، وہ بُری طرح چونک پڑی اور اُس کے ہاتھوں کی رفتار تیز تر ہوگئی۔ نگاہیں اب بھی نیچے ہی جمی ہوئی تھیں۔

"لڑکی!" میں نے نرم آواز میں اسے مخاطب کیا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے میری جانب دیکھا۔ میرے زخمی بدن ادھڑے ہوئے چہرے اور مسکراتے ہونٹوں پر نظر پڑتے ہی وہ کچھ متحیّر سی نظ

آنے لگی۔

میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ قدرے گہری ہوئی اور اُس کا تحیر بے بسی میں ڈھل گیا۔ اُس نے جلدی جلدی اپنے ہاتھ بہتے ہوئے پانی میں دھوئے اور اپنے بدن سے لباس اتارنے لگی۔

وہ شاید جبرین والوں کی سرشت سے خوب واقف تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ جب کوئی مرد کسی کنیز کے قریب آکر مسکراتا ہے تو اس کا کیا مقصد ہوتا ہے۔

میں نے بڑھ کر اُس کے ہاتھ تھام لئے "نہیں.... میں تمہاری آبرو کا دشمن نہیں، تمہارا ہمدرد ہوں۔"

وہ کچھ پریشان سی ہوگئی۔ اس کی خوفزدہ نظریں نخلستان کی وسعتوں میں دوڑنے لگیں جیسے اسے نادیدہ نگاہوں کی نگرانی کا خوف ہو۔

"کیا تم مانینی کی قید میں خوش ہو؟" میں نے اس کی ٹھوڑی تھام کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

"تم کون ہو... چلے جاؤ، یہاں سے چلے جاؤ۔" وہ بری طرح خوفزدہ ہوگئی "وہ ہر بات جان لیتا ہے، چلے جاؤ میں کچھ نہیں جانتی، میں مقدس مانینی کی کنیز ہوں۔"

وہ زور آزمائی کر کے میرے ہاتھوں سے نکل گئی اور کچھ دور جاکر دوبارہ پانی کی نالیاں صاف کرنے لگی جیسے کوئی بے رحم جلاد چابک سنبھالے اس کے سر پر سوار ہو۔

وحسین اکنویں کے عقبی احاطے میں بندھے ہوئے اونٹوں کو تیار کرلے۔" اچانک دور سے مانینی کی گونجیلی آواز ابھری "ہمیں آج ہی یہاں سے نکلنا ہے۔"

میرے قدم مشینی طور پر اونٹوں کے باڑے کی طرف اٹھنے لگے۔

راستے میں کئی لڑکیاں کام میں مصروف نظر آئیں لیکن کسی نے میری طرف نہ دیکھا۔ مانینی کا خوف اُن کے رَیں رَیں میں جاگزیں تھا۔ وہ اپنے سائے تک سے خوفزدہ نظر آرہی تھیں۔

احاطے میں لٹے ہوئے قافلوں کے اونٹ اور محمل موجود تھے میں نے دو جانور ہی تیار کئے تھے کہ مانینی بھی اپنے اونٹ پر سوار آپہنچا۔ اُس کے ہاتھ میں چمڑے کا لمبا سا چابک لہرا رہا تھا اور وہ نخلستان میں کام کرتی ہوئی تمام کنیزوں کو وہاں ہانک لایا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں بارہ اونٹوں کا کارواں تیار ہوگیا۔ آٹھ اونٹوں پر سجے ہوئے محملوں میں مانینی کی تیس کنیزیں سوار ہوگئیں۔ دو اونٹوں پر تازہ پانی کے مشکیزے اور دوسرا ساز و سامان تھا۔ مانینی نے باریک ریشمین لبادوں سے بھرا ہوا ایک صندوق بھی لاد لیا تھا جو شاید کنیزوں کو پہنانے کے لئے تھے۔

پھر اونٹوں کی نکیلیں ایک قطار میں پرو دی گئیں۔ سب سے آگے مانینی کا اونٹ تھا جس پر وہ خود چابک سنبھالے سوار تھا۔ اس کے عقب میں کنیزوں سے لدے ہوئے اونٹ تھے اور میں سامان والے اونٹوں کے عقب میں آخری اونٹ پر سوار تھا۔

"تم سب سُن لو" سفر شروع کرنے سے قبل مانینی مڑ کر چلایا "میرے سارے جسم پر بے شمار آنکھیں ہیں اور میں تنہا تمہارے سروں پر مسلط نہیں ہوں آسمانوں کی مدد میرے ساتھ ہے، نادیدہ روحیں تمہاری نگرانی کریں گی سفر کرتے ہوئے یا کسی پڑاؤ پر اگر تم میں سے کسی نے اندھے صحرا میں فرار ہونا چاہا تو وہ میرے ہاتھوں کتے کی موت مارا جائے گا۔ میں اپنے چابک سے اس کی کھال ادھیڑ دوں گا۔ یہ سفر تم سب کی بہتری کا سفر ہے۔ آنے والے دن حسین کے سوا تم سب کے لئے خوشی کے دن ہوں گے۔ اب تمہارے چہروں پر تازگی اور مسکراہٹ ہونی چاہیئے۔"

پھر مانینی کا اونٹ چل پڑا۔ پوری فضا تانبے کی گھنٹیوں کے شور سے گونج اٹھی۔

جس وقت مانینی کا وہ کارواں بستی میں داخل ہوا تو سورج سروں پر آچکا تھا۔ بستی والے دور ہی سے جرس کارواں کا ترنم سن کر راستے پر جمع ہوگئے تھے اور جھک جھک کر مانینی کو تعظیم دے رہے تھے۔ بستی کے آخری سرے پر سردار جوبا بھی اپنے خیمے کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ مٹی کے چبوترے پر پڑا ہوا بت اب وہاں موجود نہیں تھا شاید جوبا نے اسے کسی پاگل اونٹ کی پشت سے باندھ کر اونٹ کو صحرا میں ہانک دیا تھا۔

جب تک مانینی کا اونٹ جوبا کے سامنے نہ پہنچا وہ اپنی گردن تانے اور سینہ نکالے آسمان کی جانب دیکھتا رہا جیسے اُس کے نزدیک مانینی غیر اہم ہو۔ پھر مانینی کے سامنے آتے ہی اُس کا سر آہستہ آہستہ نیچے خم ہوا مانینی نے اپنا چابک فضا میں لہرا کر اسے جھٹکا دیا۔ تڑاپ کی آواز کے ساتھ ہی اونٹوں کی رفتار تیز ہوگئی اور وہ ریت کے بگولے اڑاتے صحرا کی بیکراں وسعتوں میں گھس پڑے۔

ذرا ہی دیر میں جبرین کی بستی غبار کارواں کے پیچھے روپوش ہوگئی۔ فضا اونٹوں کی ہمک اور گھنٹیوں کے مترنم شور سے گونج رہی تھی۔ ریت کے بگولوں میں مجھے اپنا اگلا اونٹ تک دھندلایا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مانینی کو دیکھنا چاہا لیکن وہ نظر نہ آیا۔ آنکھوں میں گھسنے والے ریت کے ذرات مجھے آنکھیں بند رکھنے پر مجبور کئے دے رہے تھے اور

اسی لمحے ایک تجویز نے میرے ذہن میں سر اُبھارا!

میں نے اپنی آنکھیں موند لیں اور اپنی تجویز پر غور کرنے لگا مانینی پُراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ میں بھی لاشعور میں اس سے خوفزدہ تھا لیکن اس سے نجات پالینے کی موہوم سی اُمید بھی میرے لئے حوصلہ افزا تھی۔ میں جتنا سوچتا رہا، میرا عزم اسی قدر پختہ ہوتا رہا اور میں جبرین سے مناسب حد تک دور نکل آنے کا انتظار کرنے لگا۔

پھر اچانک فضا مانینی کی تیز آواز سے گونج اٹھی۔ اس روز پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ اس کرخت اور ہیبت ناک بوڑھے کے گلے میں ترنم کا سوز بھی پایا جاتا ہے۔ وہ لہک لہک کر صحرا نشین، محمل سواروں کا نغمہ گا رہا تھا اسکی آواز آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئی اور حدی کی لے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ اونٹ بھی مست ہو کر ہوا سے باتیں کرنے لگے! ویران اور خاموش صحرا میں کارواں کی گھنٹیوں کا تیز شور اور مانینی کی حُدی خوانی نے عجیب اور پُراسرار سماں باندھ دیا تھا۔

مانینی اپنے صحرائی گیت میں کھویا ہوا تھا۔ محملوں میں بیٹھی ہوئی سہمی سکڑی کنیزیں اپنے غیر یقینی مستقبل اور گمنام منزل کے اندیشوں میں گھری ہوئی تھیں مستی میں آئے ہوئے اونٹ ہچکولے کھاتے، تیزی کے ساتھ جبرین سے دور اور جبل کی بستی سے قریب ہوتے جارہے تھے۔ ہر ایک اپنی اپنی محویت میں گم تھا اور میرے لئے کچھ کر گزرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ آزادی کی زندگی کی لگن مجھے بار بار کچھ کر گزرنے پر اکسا رہی تھی

آسمان کی بلندیوں تک اُڑتے ہوئے ریت کے طوفانی بگولوں کے عقب میں دھندلایا ہوا سورج تھکے تھکے قدموں سے مغرب کی جانب جھکتا جارہا تھا۔ میرے قیاس کے مطابق ہمیں جبرین کو چھوڑے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر ایک بار پیچھے کی طرف دیکھا اور پھر بہت احتیاط کے ساتھ اپنے اونٹ کے کوہان کے پیچھے سے اچھل کر میں اونٹ کی گردن سے لپٹ گیا۔

میرا اونٹ زور سے بلبلایا، اُس کی گھنٹیوں کا شور اپنا تسلسل توڑ کر بے ربط سا ہوگیا۔ خوف اور سنسنی کے باعث میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا میں کئی ثانیوں تک سانس روکے کسی واقعے کا منتظر رہا لیکن کچھ نہ ہوا۔ میرا اونٹ اعتدال پر آچکا تھا۔ اس کی گھنٹیاں دوبارہ ربط میں آچکی تھیں اور بوڑھا مانینی مسلسل حُدی خوانی کئے جارہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے نغمہ کے زور سے جبل تک کی دو روز کی مسافت ایک ڈیڑھ پہر ہی میں پوری کر لینی چاہتا تھا تاکہ کنیزوں کا نیلام کر کے جلد از جلد جبرین واپس لوٹ سکے۔

مجھے خوب یاد تھا کہ میرا منہ بولا باپ ایک اونٹ پر سے گرنے کے باعث ہی ہلاک ہوا تھا اور میری ذرا سی غلطی میری گردن بھی توڑ سکتی تھی۔ میں بہت آہستہ آہستہ اونٹ کی گردن پر آگے سرکتا رہا۔ درمیان میں سامان سے لدے ہوئے اونٹ اور غبار کا طوفان حائل ہونے کے باعث کنیزوں کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مجھ کو دیکھ لیتیں۔

میرا اونٹ اپنی گردن پر بوجھ محسوس کر کے خاصا پریشان تھا لیکن اُس کی نکیل کی رسّی اگلے اونٹ سے بندھی ہوئی تھی اس لئے، اپنی وحشت کے باوجود وہ قافلے کی رفتار سے بھاگتے رہنے پر مجبور تھا!

جب میرے لئے مزید آگے سرکنا ممکن نہ رہا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر اپنے اونٹ کی نکیل ٹٹولی اور میرا دل خوشی سے بلّیوں اُچھل پڑا پہلی ہی کوشش میں اُس کی نکیل میرے ہاتھ میں آگئی۔

میں نے نکیل کی مدد سے اپنے اونٹ کی رفتار قدرے تیز کی اور جب نکیل خاصی ڈھیلی محسوس ہونے لگی تو میں نے اسے اگلے اونٹ کی داہنی جانب آگے بڑھانا شروع کر دیا۔

چند ہی منٹ میں میری کوشش بارآور ہوئی اور میں نے ایک جھٹکا دے کر اپنے اونٹ کی نکیل کا آخری سرا اگلے اونٹ پر لدے ہوئے سامان میں سے نکال لیا۔ اس مرحلہ پر نخلستان کی محنت نے میرا ساتھ دیا کیونکہ وہاں میں نے اپنے ہاتھوں سے اونٹوں کی نکیلیں ایک دوسرے سے باندھی تھیں۔

اب میرا اونٹ کارواں سے الگ ہوچکا تھا، میں احتیاط اور تیزی کے ساتھ واپس کوہان تک سرکا۔ نکیل میرے دانتوں میں دبی ہوئی تھی لیکن میرا اونٹ قافلے کی روانی میں ابھی تک باقی اونٹوں کے پیچھے دوڑا جارہا تھا۔ کوہان تک پہنچ کر میں پلٹا اور پھر اپنی جگہ تک آگیا۔

بوڑھے مانینی کی گونجیلی آواز میں اب دھیما پن آگیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ سانس ٹوٹنے کے باعث ذرا ہی دیر میں خاموش ہونے والا ہے۔

پھر میں نے اچانک اپنے اونٹ کی نکیل کھینچ لی۔ گھنٹیاں تیزی سے چیخیں، میرا اونٹ تکلیف سے بری طرح بلبلایا اور پچھلی ٹانگوں پر رکتا چلا گیا۔

اپنے اونٹ کی وحشت زدہ بلبلاہٹ پر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کارواں کی گھنٹیوں کا شور حالانکہ بہت تیز تھا لیکن میرے اونٹ کی آوازیں اس پر حاوی تھیں۔

جتنی دیر میں میرا اونٹ ٹھہرا اس وقت تک مانینی کا کارواں خاصی دور نکل چکا تھا۔ پھر شاید مانینی کو میری کوشش کا علم ہوگیا۔ آگے جاتا ہوا کارواں تیزی کے ساتھ رکنے لگا۔ فضا اونٹوں کے شور سے گونج اٹھی۔ میرے لئے فیصلہ کن لمحات آچکے تھے جتنی دیر میں مانینی اپنے اونٹ کو قافلے سے

علیحدہ کر کے میرے تعاقب میں ڈالتا مجھے دُور نکل جانا چاہیئے تھا۔ میں نے فوراً اپنے اونٹ کو داہنی جانب گھما کر پوری سرعت سے صحرا میں دوڑا دیا۔

"مجھ سے فرار ممکن نہیں حسین!" فضا میں مانیتی کی قہر سے لرزتی ہوئی آواز گونجی "میرے ہاتھ بہت دراز ہیں۔ تو جلد ہی میرے قدموں میں ڈال دیا جائے گا۔"

میں نے مانیتی کی پرواہ نہیں کی۔ میں اس کے کارواں سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ میرے پیچھے مانیتی کی بھیانک قید اور اذیتناک غلامی تھی اور سامنے آزادی کی راہ مجھے پکار رہی تھی۔ میں مڑ کر دیکھے بغیر اپنے اونٹ کو پوری رفتار سے آگے دوڑاتا رہا۔ میرے اعصاب پر ناقابلِ بیان جوش طاری تھا۔ اور میں جلد از جلد اتنی دُور نکل جانا چاہتا تھا کہ مانیتی اور اس کے کارواں کی آوازیں بھی میرے کانوں تک نہ پہنچ سکیں۔

میں آگے بڑھتا رہا لیکن میرے کان لاشعوری طور پر عقب میں کسی آواز پر جمے ہوئے تھے۔ مجھے سخت حیرت تھی کہ جبرین کے مقدس پروہت، مانیتی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا جب کافی دیر گزر گئی اور مجھے پورا یقین ہو گیا کہ مانیتی نے کنیزوں کے ہراساں کارواں کو چھوڑ کر میرا تعاقب نہیں کیا ہے تو میرے بدن میں سنسنی دوڑنے لگی۔ اس کے آخری الفاظ میرے کانوں میں گونجے اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ آخر کیا بات تھی کہ مانیتی کو میرے فرار کی ناکامی کا یقین تھا۔ اُس کے آخری جملوں میں غصّے کے ساتھ ہی بلا کا اعتماد بھی تھا جیسے اُسے پورا یقین ہو کہ میں اس کے چنگل سے فرار نہ ہو سکوں گا۔

میں صحرا کے اجنبی راستوں سے ناواقف تھا۔ میرے لئے ہر راہ یکساں تھی۔ میں نے اپنے اونٹ کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے مجھے ایک جانب لئے جا رہا تھا۔ مانیتی سے دُور نکل آنے کے بعد اب مجھ پر ہلکی سی تشویش چھانے لگی تھی۔ مانیتی اگر کارواں کو چھوڑ کر میرا پیچھا کرتا تو بدکے ہوئے اونٹ اس کی کنیزوں کو لے کر صحرا کی بیکراں وسعتوں میں گم ہو جاتے اور وہ اپنی متاع سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ وہ کئی پشتوں سے صحرا کا باسی تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ میں اس سے فرار ہو کر صحرائی عتاب سے نہ بچ سکوں گا۔

مجھے نہ راستوں کا علم تھا، نہ میرے پاس کھانے پینے کا سامان تھا، نہ صحرا کی سرد راتوں سے بچاؤ کا انتظام تھا نہ دن کی جہنمی گرمی سے نجات کی کوئی صورت تھی، مانیتی کو یقین تھا کہ مجھے یہ فرار مہنگا پڑے گا۔ اس کا طویل تجربہ اسے میرے آنے والے لمحوں کی داستان پہلے ہی سنا چکا تھا۔

میں اپنے اونٹ کو پوری رفتار سے دوڑاتا رہا۔ سُورج اب مغربی اُفق پر آسمان اور صحرا کے سنگم کو چھوڑ کر ریت کے ٹیلوں پر روپہلے سمندر کا سماں باندھ رہا تھا طویل جدوجہد کے باعث مجھے پیاس کا احساس ستانے لگا تھا حلق میں پیدا ہونے والی خشکی سے مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ منصوبہ بندی کے بغیر فرار کی یہ کوشش مجھے مانیتی کی قید سے بھی مہنگی پڑتی نظر آ رہی تھی۔

میں کسی قریئے اور بستی کی اُمید پر صحرائی راستے عبور کرتا رہا۔

سارا دن دوڑتے رہنے کے باوجود اونٹ کی تازگی اور رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پھر سُورج ڈوب گیا۔ صحرا میں رقص کرتی ہوئی آوارہ ہوائیں اپنے گمنام مسکنوں میں معدوم ہو گئیں اور صحرا پر خنکی میں ڈوبا ہوا شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ اس صحرائی سکوت میں میرے اونٹ کے گلے میں پڑی تین گھنٹیوں کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی۔

پھر رات آ گئی۔ دن بھر کی تکان، بھوک اور پیاس کے باعث میری حالت ابتر ہونے لگی۔ فضا میں تیزی سے پھیلتی ہوئی سردی اب ہڈیوں پر اثر کرنے لگی تھی اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اس حالت میں سفر جاری رکھنا محال ہوتا جا رہا ہے۔ اونٹ پر میری گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی اور مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اونٹ مجھے اسی عالم میں کہیں گرا کر صحرا میں گم ہو جائیگا۔

میں نے اونٹ کی رفتار کم کر لی۔ میرے حلق میں اب پیاس کے کانٹے پڑنے لگے تھے۔ سُورج کی تمازت میں دن بھر کا سفر آہستہ آہستہ رنگ لا رہا تھا۔ آنکھوں میں ریتیلے ذرات کی چُبھن سے میٹھی میٹھی سوزش ہونے لگی تھی۔ میری آبلہ پا نگاہیں حسرت اور بے چینی کے ساتھ رات کے پُرہول اندھیرے میں ہر طرف اُٹھ رہی تھیں لیکن وہاں کسی طرف زندگی یا روشنی کے آثار نہیں تھے، وہ ریگزار رات کی سیاہی میں ڈوب کر صحرائے ظلمات میں بدل چکا تھا جہاں ہر طرف ابدی سناٹا اور سکوت حکمراں تھا۔

آہستہ آہستہ میری حالت غیر ہونے لگی۔ دن کی روشنی میں سُورج کے سہارے سمتوں کا تعین آسان تھا لیکن میں ستاروں کی مدد سے راستہ تلاش کرنے کا اہل نہیں تھا۔ میری ناتجربہ کار نگاہوں کے سامنے سیاہ آسمان پر چمکتے ہوئے بے شمار تارے بالکل یکساں تھے اور اُن سے کسی رہبری کی اُمید فضول تھی اور رہبری بھی اسی صورت میں کام آتی جب مجھے کسی منزل اور ٹھکانے کا علم ہوتا لیکن میرے لئے تو ہر سمت اجنبی تھی۔

آخر کار میں نے اپنے اونٹ کو روک لیا اور نیچے اُتر پڑا۔ دن بھر سُورج کی تپش میں جلتی ہوئی ریت سے سوندھی سوندھی خوشبو پھوٹ رہی تھی میرے برہنہ پیروں نے ریت کی خنکی کو محسوس کیا، سرد ہواؤں میں بڑھتی ہوئی خنکی کی رفتار سے ظاہر تھا کہ جوں جوں رات ڈھلتی جائے گی، صحرائی ہوائیں ناقابلِ برداشت ہوتی جائیں گی۔

میں نے وہیں رک کر رات گزار دینے کا فیصلہ کر لیا۔ کھلے آسمان کے نیچے، صحرا کی ٹھنڈی ریت پر میں نے اونٹ کی نکیل اپنی پنڈلی سے باندھ لی اور خود اونٹ کی آڑ میں ریت پر دراز ہو گیا۔ وہ ریت پر بیٹھا اس طرح جگالی کر رہا تھا جیسے وہ ان ہی لمحات کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

ہر طرف سکوت اور یکسانیت کا دَور دورہ تھا، ریت پر کروٹیں بدلتے اور تاروں بھرے آسمان کو تکتے تکتے مجھ پر غنودگی چھانے لگی۔ اور پھر میں نیند کی آغوش میں کھو گیا۔

گہری نیند تو نہ آ سکی، ہاں بھوک اور پیاس نے تھکن سے مل کر غنودگی طاری کر دی تھی۔ اسی عالم میں ایک بار میرے بدن کو تیز جھٹکا لگا۔ ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو میرا اونٹ گردن جھکائے ہوئے کھڑا تھا۔ اس پر عجیب سی بے چینی طاری تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نکیل تڑا کر کسی نامعلوم منزل کی جانب فرار ہو جانے کے لئے بے چین ہو۔

میں نے اُسے پُچکار کر بڑی مشکل سے ریت پر بٹھایا اور خود ایک مرتبہ پھر اپنی شکستہ حالت کو بھول جانے کی کوششیں کرنے لگا۔

بے بسی اور مجبوری کے ان لمحات میں مجھے شدّت سے طوسیہ یاد آ رہی تھی۔ اُسے میرے قریب آئے کافی وقت گزر چکا تھا۔ طالیس کے مجسمہ بن جانے کے بعد سے وہ مجھ سے نہیں ملی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے ذرا بھی مہلت ملتی تو وہ سیدھی میرے پاس دوڑی ہوئی آتی لیکن مانیتی مجھے بتا چکا تھا کہ اُس نے طوسیہ کی مظلوم روح کو گمنام آتش فشانوں کے دہانے میں قید کر دیا ہے۔ اس بے چاری کا جُرم صرف یہ تھا کہ وہ میری محبت میں گرفتار ہو گئی تھی اور مانیتی کے چنگل میں قید ہونے کے باوجود زینو کا پیکر چرا کر میرے پاس آتی رہی تھی۔

غنودگی کے عالم میں میں ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے نرم اور ٹھنڈی ریت پر کھینچے لئے جا رہا ہو۔

بے ساختہ چیخ کے ساتھ میری آنکھ کُھل گئی اور میں فضا میں اپنے اونٹ کی غضبناک آوازیں سُن کر کانپ اُٹھا۔ اس کی نکیل میری داہنی پنڈلی سے بندھی ہوئی تھی اور وہ تکلیف سے بلبلانے کے باوجود اپنی نکیل سمیت مجھے ریت پر گھسیٹتا ہوا ایک طرف بھاگ رہا تھا۔

میں نے سنبھلنا چاہا لیکن اونٹ کی رفتار تیز تھی۔ اس کی آوازوں سے پتہ چل رہا تھا کہ اس کی ناک بُری طرح زخمی ہو چکی ہے اور وہ خود تکلیف میں مبتلا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ٹھہرتا نظر نہیں آ رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اس صحرائی جانور کے بدن میں کوئی خبیث رُوح حلول کر گئی ہے۔

یہ کیفیت زیادہ دیر باقی نہیں رہی۔ دوڑتے دوڑتے وہ اونٹ ایکبارگی میری جانب پلٹا اور اگلے ہی لمحے اس نے میری ٹانگ اپنے منہ میں دبوچ لی۔ صحرا کی خاموش فضا میری چیخوں سے لرز اٹھی اور پھر وہ اونٹ مجھے ریت پر گھسیٹنے لگا۔ اُس کے تیز دانتوں کی چُبھن سے میری پنڈلی میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں لیکن وہ رُکنے پر تیار نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت اُسے اپنی جانب بلا رہی ہو۔

اونٹ کی گھنٹیوں کا بے ہنگم اور خوفناک شور رات کے سنّاٹے میں گونجتا رہا۔ وہ اونٹ اپنی گردن جھکائے، مجھے ریت پر گھسیٹتا ہوا لئے جا رہا تھا۔ مجھے ہر آن یہ اندیشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ اچانک گردن اوپر نہ اُٹھا لے۔ ایسی صورت میں میرا معذور ہو جانا بالکل یقینی ہو جاتا لیکن وہ اونٹ ایک خوفناک عفریت کی طرح کسی پُراسرار قوت کے تابع محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے کم از کم نقصان پہنچا کر کسی خاص منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہو۔ میں جب تک ہوش میں رہا، اذیت اور دہشت سے چیخیں مارتا رہا آخر کار میرے حواس جواب دے گئے۔

مجھے کچھ علم نہیں کہ میں نے بے بسی کی اس حالت میں صحرا کی ریت پر گھسٹتے ہوئے کتنا سفر طے کیا لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے کراہ کر آنکھیں کھولیں تو جبرین کا خوفناک بوڑھا، مانیتی میرے اوپر جھکا ہوا زہریلے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"ان صحراؤں پر مانیتی حکمراں ہے حسین!" وہ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر تلخ لہجے میں بولا "میری غلام قوتیں تیرا ہر طرف پیچھا کرتی رہیں گی اب تو مر کر بھی مجھ سے نجات نہیں حاصل کر سکے گا!"

میں پھٹی پھٹی دہشت زدہ نگاہوں سے اُسے گھورتا رہا۔ مجھے اپنی بینائی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مانیتی کا وجود اس وقت مجھے کوئی ڈراؤنا خوابی آسیب لگ رہا تھا جس سے فرار ہو کر میں صحرا میں کوسوں دور نکل گیا تھا مگر وہ ایک بار پھر میری زندگی کا مالک بنا ہوا نظر آ رہا تھا!

میں نے اٹھنے کی کوشش میں اپنے جسم کو جنبش دی اور کراہ کر رہ گیا۔ میرا سارا بدن بُری طرح زخمی تھا۔ داہنی پنڈلی میں ہونے والی شدید ٹیسوں نے مجھے سب کچھ یاد دلا دیا۔

تو کیا وہ اونٹ مانیتی کی پُراسرار قوتوں کے زیرِ اثر مجھے کوسوں دُور سے ریت پر گھسیٹتا ہوا مانیتی تک لایا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرا دل پانی پانی ہونے لگا۔ گزشتہ واقعات بھیانک تصویروں کی طرح میرے پھوڑے کے مانند دکھتے ہوئے دماغ میں چکرانے لگے۔

مانینی کے ہاتھ واقعی دراز تھے اور اس کی قوتوں سے فرار ایک خواب اور سراب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

اس وقت مانینی کا چہرہ بڑا ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ میں نے پھُرریری لے کر اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

مانینی کے چہرے سے نگاہیں پھسلیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ مجھ سے تھوڑی دُور مانینی کی تمام کنیزیں ایک قطار میں سہمی ہوئی سو رہی تھیں۔ مٹی کے ان کھنڈرات میں بس ایک چراغ روشن تھا۔ اس کی ناکافی روشنی میں اس کھنڈر کے در و دیوار اپنی کہانی سنا رہے تھے۔ کسی زمانے میں وہ کھنڈر بھی یقیناً آباد رہے ہوں گے لیکن ان پر چھائی ہوئی ویرانی بتا رہی تھی کہ اُس کے صحرائی مکین کسی سُرخ آندھی یا صحرائی قزاقوں کا شکار ہو کر مدتوں قبل اپنی بستی کو ویران کر چکے ہیں۔ اس وسیع کھنڈر میں ایک جانب مانینی کے کارواں کے تمام اونٹ بیٹھے ہوئے تھے اور سب سے آگے میرا اونٹ تھا۔ اُس کی ناک خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں ساری کہانی سمجھ گیا۔

مانینی کی خفیہ اور پُراسرار قوتوں کے زیرِ اثر پہلے تو اس اونٹ نے اپنی نکیل کے سہارے مجھے گھسیٹنے کی کوشش کی تھی لیکن لہولہان ہونے کے بعد وہ مزید تکلیف برداشت نہ کر سکا اور دیوانہ وار میری ٹانگ مُنہ میں دبوچ کر مجھے کسی نادیدہ رہنمائی کے سہارے مانینی تک لے آیا اور یوں میں فرار ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر اس خوفناک بوڑھے کے چنگل میں آ پھنسا تھا۔

"جب سے تو فرار ہوا تھا میں ہر آن صحرا کی ریت پر تیرے قدموں کی آہٹیں سُن رہا تھا" مانینی دہشتناک ہنسی کے ساتھ کہہ رہا تھا "ویران صحرا میں سرسرانے والی ہواؤں میں میں تیرے بدن کی بُو سونگھ رہا تھا، مجھے علم تھا کہ تو صحرا میں ہی پھر رہا ہے۔ اب میں چاہوں تو تجھے چیونٹی کی طرح مسل سکتا ہوں لیکن مجھے اپنے دشمنوں کو مجبور اور بے بس دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں تجھے زندہ رکھوں گا..... تو زندہ رہے گا!"

مجھ پر مایوسیوں کی سیاہ گھٹائیں چھاتی جا رہی تھیں جبرین کی پُرہول یادوں کے بعد صحرا کے جگرخراش تجربے نے مجھ سے عزم اور حوصلے کی قوتیں چھین لی تھیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مانینی سچا ہے، میرا اس کا مقابلہ ہاتھی اور چیونٹی کی ٹکر کے مترادف تھا، میں اپنی قوت اور توانائی سے اس ناقابلِ شکست منحنی بوڑھے کو زیر نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے نمٹنے کے لئے مجھے اس ہاتھی کی سونڈ میں گھسنے کی تدبیریں تلاش کرنی تھیں۔

سسکتی ہوئی رات کے آخری لمحے بڑے کرب کے عالم میں گزرے

ان کھنڈرات میں پڑنے والی سورج کی کنواری کرنوں نے مانینی کی آبروباختہ کنیزوں کو بڑی حسرت کے ساتھ بوسے دیئے۔ موت کے سکوت میں ڈوبے ہوئے کھنڈرات کچھ دیر کے لئے خوف میں ڈوبی ہوئی چہل پہل میں بدل گئے۔ لکڑیوں کے ڈھیر سے دھوئیں کی بل کھاتی ہوئی لکیریں اُبھریں پھر چٹختے ہوئے انگاروں پر آتشِ شکم کو سرد کرنے کی تیاریاں مکمل ہوئیں۔ ناشتہ کرتے ہوئے میں نے مانینی کو غور سے دیکھا اُس کی چُندھیائی ہوئی آنکھیں ایک دراز قامت اور سبک اندام کنیز کے بدن پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کنیز کے جسم کے کھُلے ہوئے حصّوں پر مانینی کے بے رحم چابک کی نیلی نیلی، تازہ لکیریں اُبھری ہوئی تھیں۔ جمے ہوئے خون کی وہ نیلاہٹ مانینی کی کسی سفاکی کی کہانی سنا رہی تھی۔

ناشتے کے بعد کنیزیں جانوروں کو تیار کرنے لگیں۔ ان کی حرکات و سکنات بالکل مشینی تھیں۔ ان پر مانینی کی دہشت چھائی ہوئی تھی۔ ان کی چھاتیوں سے قدرے اوپر چمکتے ہوئے مانینی کی مُہر کے نشان نمایاں تھے۔ مانینی جبرین کے سردار، جوبا کے خاص خیمے میں ایک جنوں خیز محفل میں مقدّس آگ میں تپی ہوئی مخصوص مُہر باہر سے لائی جانے والی کنیزوں کے سینوں کو داغدار کرنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ وہ تقدّس میں ڈوب کر اتنی بے رحمی کے ساتھ جسموں کو جلاتا تھا کہ دیکھنے والوں تک کے رُونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

کنیزیں اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں اُن کے انداز میں نہ احتجاج تھا نہ مزاحمت کا عنصر نظر آتا تھا۔ آدم کی وہ بیٹیاں مانینی کے ہاتھوں لاوارث ہو کر اپنا سب کچھ کھو بیٹھی تھیں اور اب جبرین کے دَرندوں کا دل بھر جانے کے بعد مانینی جوئے میں جیتی ہوئی ان لڑکیوں کو لاعلمی میں جبل والوں کے درمیان نیلام کرنے لے جا رہا تھا۔ اس مقدّس بردہ فروش کا چہرہ آنے والی دولت کی ہوس سے چمک رہا تھا۔

"حسین!" کسی سوچ میں کھوئے ہوئے مانینی نے اپنی ٹھوکر سے میری پسلیوں کو چھو کر کہا "تیرے فرار کے بعد میری بلند آوازوں سے اس لمبی لڑکی پر دہشت طاری ہو گئی تھی اور وہ ہذیانی انداز میں بال نوچ نوچ کر چیخنے لگی تھی میرے چابک نے اس وقت تو اس کا دماغ درست کر دیا لیکن اب مجھے افسوس ہوتا ہے!"

میں نے نظر بھر کر زخمی کنیز کو دیکھا۔ میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مانینی جیسا درندہ اپنے کسی فعل پر متأسف بھی ہو سکتا ہے۔ میں اس کی بات کا مفہوم نہ سمجھ سکا اور خالی نظروں سے اُس کا منہ تکنے لگا۔

"یہ کنیز اچھے داموں نہ اُٹھ سکے گی" مانینی قدرے توقف کے بعد بولا تو اس کی آواز میں واقعی ملال نمایاں تھا "ہنستے مسکراتے چہروں، گداز جسموں، خوبصورت چہروں، ہری رنگت اور بے داغ چمڑی والی کنیزوں

ن بولی بہت اونچی جاتی ہے۔ میری دہشت سے ساری کنیزیں یرقان میں مبتلا نظر آتی ہیں پھر جبل کے کسی امیر کو پتہ چل گیا کہ میری کنیزوں میں کوئی زخمی بدن والی بھی شامل ہے تو وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں نے کنیزوں کی مناسب دیکھ بھال نہیں کی ہے اور جبل پہنچنے تک اُس کے زخم بھرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

وہ خاموش ہوا تو میں الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ آخر اتنی لمبی تمہید کا مقصد کیا تھا؟ لیکن میں نے زبان نہیں کھولی۔ اس کے بولنے کا منتظر رہا۔

"صحرائی گدھ اس کی لاش بڑے شوق سے نوچیں گے!" وہ زخمی کنیز پر نظریں جما کر سرگوشیانہ آواز میں بولا "اس کے بھرے بھرے بدن پر کافی گوشت ہے، میں سوچتا ہوں کہ اسے ان ہی کھنڈرات میں ختم کر دوں، اپنے انجام کے خوف سے شاید باقی کنیزیں مسکراتے رہنے پر مجبور ہو جائیں، مجھے ان کی سوگواری سے اُلجھن ہونے لگی ہے۔"

میں کانپ اٹھا "نہیں مقدّس مانینی!" میرے منہ سے کانپتے ہوئے الفاظ نکلے "تم اسے لمبا لبادہ پہنا دو، نیلام میں بھی آخر میں سامنے لانا، اسے یوں بے قصور ہلاک نہ کرو۔"

"بے قصور!" وہ زور سے ہنس پڑا۔ کنیزیں اس کی آواز پر دہشت سے اچھل پڑیں۔ کئی لڑکیوں کے ہاتھ سے سامان چھوٹ گیا۔

پھر اُس نے قریب ہی سے اپنا چابک اُٹھا لیا اور دراز قامت کنیز کو مخاطب کر کے زور سے چلّایا "او اُمّ الخنزیر! ادھر آ میرے قریب!"

اُس نے ایک نظر مانینی کو دیکھا پھر اُس کے ڈراؤنے چابک کو دیکھتی سحرزدہ انداز میں اس کی طرف بڑھنے لگی۔ دہشت سے اس کا چہرہ اور ہونٹ سفید پڑ گئے تھے، پنڈلیاں بُری طرح کانپ رہی تھیں!

"لباس اُتار دے" مانینی سرد لہجے میں غرّایا "جبل والے اسے دو چار دینار کی بولی دے کر اپنی عورتوں کے لئے خرید لیں گے۔"

وہ کسی ننھی سی چڑیا کی طرح سہمی ہوئی تھی۔ ایک لفظ کہے بغیر لرزتے ہاتھوں سے اپنی حیا کی چادر اُتارنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں حیا اور التجا نقش تھی۔

اس کے بدن سے لبادہ گرتے ہی مانیٔی کا چابک والا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ شڑاپ کی آواز کے ساتھ چابک اس لڑکی کی کھال میں لپٹ گیا اور فضا اُس کی چیخوں سے کانپ اٹھی۔ دوسری کنیزیں اپنے کاموں میں مصروف تھیں، لیکن اُن کے بدن بُری طرح لرز رہے تھے۔

وہ دراز قامت کنیز پہلے ہی وار میں زمین پر ڈھیر ہو گئی تھی

مانیٔی نے بے رحمی کے ساتھ چابک واپس کھینچا اور اس لڑکی کی کھال چرچرے کے ساتھ چپک کر اُکھڑ آئی اور اُس کے برہنہ بدن سے خون کی لکیریں بہہ نکلیں۔

مانیٔی کا ہاتھ دوبارہ لہرایا، ساری کنیزیں چیخیں مار کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں، زخمی کنیز تو پہلے وار میں ہی بے ہوش ہو چکی تھی۔

"ہاتھ روک لے بڈھے!" میں لرزتی ہوئی آواز میں چیخا لیکن اس کا ہاتھ تیسرے وار کے لئے بلند ہوتا رہا۔

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں لنگڑاتا ہوا اس کی طرف لپکا وہ الٹے قدموں ذرا پیچھے سرکا اور اس بار چابک میری پنڈلیاں ادھیڑ گیا۔ میں چیخ مار کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

غصّے اور نفرت سے میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ انتقام کا ناقابلِ برداشت لاوا میرے وجود میں کھول رہا تھا لیکن میں اس جہنمی پروہت کے سامنے بے بس تھا۔

فضا بار بار چابک کی ہولناک آوازوں سے کانپ رہی تھی زخمی کنیز بے ہوش تھی۔ اس کا بدن ساکت تھا مانیٔی کے ہاتھ میں یہ خوبی تھی کہ اس کا ہر وار لڑکی کے بدن پر خون کی نئی لکیریں اُبھار رہا تھا۔

ساتویں چابک پر زخمی کنیز کا بدن آہستہ سے کانپا اور وہ اذیت و راحت کے جذبوں سے بے نیاز ہو کر، ہمیشہ کے لئے مانیٔی کی قید سے آزاد ہو گئی۔

"تم سب سنو!" مانیٔی اپنے خونی چابک کو فضا میں پھٹکارتا ہوا، کنیزوں سے بولا "مانیٔی تمہارے یرقان زدہ چہروں پر زندگی کا نکھار اور مسکراہٹ دیکھنی چاہتا ہے۔ اگر تم پر یہی مُردنی طاری رہی تو ایک ایک کر کے اسی کے پاس پہنچا دی جاؤ گی"۔

وہ اپنی ہدایت کا ردِ عمل دیکھے بغیر مٹی میں اپنا چابک صاف کرنے لگا۔

اس روز میں نے زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار لرزا دینے والا منظر دیکھا۔ گو اب کنیزوں کی جانب مانیٔی کی پشت تھی لیکن اُن کی دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھوں کے نیچے اُن کے سوکھے ہوئے ہونٹ پھیل گئے تھے۔

موت کے پسینوں میں نہائی ہوئی وہ لڑکیاں مسکرانے کی رحم انگیز کوششیں کر رہی تھیں بعض آنکھوں سے آنسو رواں تھے لیکن ہونٹ پھیلے ہوئے تھے جیسے مانیٔی کی نادیدہ قوتیں اُن کے جبڑوں میں انگلیاں پھنسا کر اُن کے دہانے چیر رہی ہوں۔

کھنڈرات سے روانگی کے وقت ہر ایک دم بخود تھا۔ وہاں کھیلا جانے والا خونیں ڈرامہ ہر ایک کے ذہن میں چپکا ہوا تھا۔ جب اونٹ ہمک کر زمین سے اُٹھے تو گھنٹیوں کی گونج میں بھی اس بے گناہ کنیز کی چیخوں کا آہنگ رچا ہوا محسوس ہوا جس کا جُرم یہ تھا کہ اُس کا بدن مانیٔی کے ہاتھوں داغدار ہو گیا تھا۔

قافلہ باہر نکلتے ہی کھنڈرات کی خشک اور شکستہ دیواروں پر بیٹھے ہوئے گِدھوں نے مسرّت سے کریہہ آوازیں نکال کر اپنے محسن مانیٔی کو پُرجوش طریقے پر الوداع کہی اور میں نے ایک دیوار کی اوٹ سے مظلوم کنیز کی برہنہ لاشے پر ان گدھوں کو منڈلاتے دیکھا اور میرا اونٹ آگے نکل گیا۔

اِن گِدھوں کی آوازیں کافی دُور تک ہمارا تعاقب کرتی رہیں۔

میں پہلے کی طرح قافلے کے آخری سرے پر تھا۔ میرا زخمی اونٹ چارے کے بغیر بھی پہلے جیسی رفتار سے چل رہا تھا۔ میرے لئے اس صحرا کی ہر سمت یکسانیت کا راج تھا لیکن مانیٔی صحرا کا کیڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ آنکھ بند کر کے بھی سفر طے کرے تو مقررہ وقت سے پہلے ہی جبل جا پہنچے گا۔

زخموں اور مسلسل سفر سے چُور بدن ریت کے ذرّوں کے سبب چٹخ رہا تھا۔ مشکیزوں میں صرف اسی قدر پانی تھا کہ پینے کا کام دے سکتا تھا۔ ابھی تک اونٹوں کو بھی پانی نہیں پلایا گیا تھا۔ ہاں سفر شروع کرنے سے قبل جبرین کے نخلستان میں انھیں سیر کر دیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد مانیٔی پھر موج میں آ گیا۔ کچھ دیر قبل والے خون آشام واقعے کا کوئی اثر نہیں تھا اور وہ بڑے سوز کے ساتھ حُدی کی لے گا رہا تھا، کوئی اجنبی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گانے والے نے ذرا ہی دیر پہلے بھیڑیئے کی طرح کسی نازک اندام دوشیزہ کا بدن نوچا ہو گا۔

مانیٔی کی آواز بلند ہوتے ہی اونٹوں نے اپنی گردنیں نیچی کیں اور ان کی چال تیز ہونے لگی۔ اُن کے قدموں سے اُڑنے والی ریت کے بگولے بھی گہرے ہوتے جا رہے تھے اور گھنٹیوں کی آواز بتدریج اونچی ہو رہی تھی!

دن بھر ہمارے اونٹ بلا تکان صحرا میں دوڑتے رہے۔ اس روز مجھے پہلی بار ذاتی تجربہ ہوا کہ طویل صحرائی مسافتوں کے لئے اونٹ کو ترجیح کیوں دی جاتی ہے۔

پھر دن ڈھل گیا اور ہر سو شام کا اندھیرا چھا گیا۔ سُورج کی روشنی میں بیکراں سمندر کی طرح چمکتا اور انگڑائیاں لیتا ہوا صحرا پُرسکون ہوتا جا رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس شام کے جلو میں چاند کی آخری شب طلوع ہونے والی ہے۔

یہی وہ شب تھی جب جبرین کے سردار جوبا کی کنیزیں مجھے مقدّس الاؤ کے دھویں پر الٹا لٹکا کر ہلاک کرتیں، بے اختیار مجھے طالبس یاد آیا۔ جو میری مدد کرتے ہوئے مانیٔی کی بے رحمی کا نشانہ بنا۔ کون جانے کہ جبرین کی فضائیں ابھی تک اس پاگل کی چیخوں سے گونج رہی تھیں یا وہ ہلاک ہو چکا تھا۔

اپنی قید کے دَوران مجھے اتنا اندازہ تو ہو چکا تھا کہ سردار جوبا کو اپنی بیٹی زینو سے گہری محبّت ہے۔ گو ایک مرحلے پر وہ اپنی جان کے خوف سے اُس کی آبرو لُٹا دینے پر بھی تیار ہو گیا تھا لیکن میرا قیاس تھا کہ ایک بار حالات پر گرفت مضبوط ہوتے ہی اُس نے اپنی بیٹی کو جبرین والوں کی ہوسناک نگاہوں سے محفوظ کر لیا ہو گا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر مجھے اپنی طوبیہ کا غم تھا وہ بے چاری نہ جانے کہاں اور کس حال میں مانیٔی کی سزائیں جھیل رہی تھی۔

میں ان ہی خیالات میں کھویا رہا اور کارواں برق رفتاری سے جبل کی جانب بڑھتا رہا جہاں ایک نئی کہانی میری منتظر تھی۔ اور میں آنے والے ہولناک لمحات سے قطعی بے خبر تھا۔

سُورج غروب ہونے کے کچھ وقفے بعد فضا میں اچانک مانیٔی کی آواز گونجی "تو یہ سُن لو کہ بستی قریب آ چکی ہے۔ مانیٔی فضا میں اجنبیوں کی بُو سونگھ رہا ہے"۔

میرا دل بے اختیار اچھل پڑا میں نے غبار کے عقب سے سامنے کسی بستی کے آثار دیکھنے چاہے لیکن بے سود۔ اندھیرے کی پھیلتی ہوئی چادر میں وہاں کسی آبادی کے آثار نہیں تھے لیکن مانیٔی کے بارے میں میرا تجربہ کہتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ وہ میلوں دُور سے بُو سونگھ لینے والی حیوانی قوت کا مالک تھا اور مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ ہمارا کارواں وقت سے پہلے ہی جبل کی بستی میں داخل ہو جائے گا۔

کچھ دیر بعد سامنے، بہت دور روشنی کے دُھندلائے ہوئے نقطے نظر آنے لگے اور میں اپنے ذہن میں جبل کی خیالی تصویریں بنانے لگا!

"ہم آج رات ہی جبل میں داخل ہوں گے۔ یہ رات کھلے آسمان کے بجائے کسی سرائے کی چھت کے نیچے بسر ہو گی"۔ مانیٔی کی آواز نے ایک بار پھر مجھے چونکا دیا اور مجھ پر نامعلوم سا اضطراب چھانے لگا۔

روشنی کے دُھندلائے ہوئے نقطے اب آہستہ آہستہ واضح ہوتے جا رہے تھے۔ میرے دل میں غیر ارادی طور پر یہ خواہش اُبھر رہی تھی کہ کاش اونٹ پل بھر میں یہ فاصلہ طے کر لیں۔ اس وقت میں نے اپنے اس جذبے کو جبرین والوں کی وحشت سے فرار کی خواہش ہی تصوّر کیا لیکن آنے والے دنوں اور لمحوں نے ثابت کر دیا کہ یہ جبرین والوں سے نفرت نہیں بلکہ جبل کی پُراسرار کشش تھی جو میرے دل میں ایسے جذبے جگا رہی تھی۔

سیاہ آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کی مدھم چھاؤں میں اب جبل کی بستی کے اونچے نیچے ہیولے نظر آنے لگے تھے۔ چاند کی آخری شب جبرین والوں کے مقدّس الاؤ پر زندگی اور موت کی کشمکش میں گزارنے کے بجائے میں جبل کی کسی سرائے میں بسر کرنے والا تھا۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ دو روز کی طویل صحرائی بھاگ دوڑ کے بعد میں ایک ایسی جگہ پہنچنے والا تھا جہاں صرف خونخوار مانیٔی ہی نہیں بلکہ اور بھی انسان ہوتے۔

کارواں کی گھنٹیوں کا شور ہمارے جبل میں داخل ہونے سے قبل وہاں ہماری آمد کا اعلان کر چکا تھا۔ جب جبل کے روشن ہیولوں نے آبادی کا رُوپ دھارا تو گندمی رنگت اور مضبوط جسموں والے بچّوں کی ایک فوج بستی سے باہر بے چینی سے ہمارے کارواں کی منتظر تھی۔ ان کے درمیان بہت سے ناقہ سوار نوجوان بھی نظر آ رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر شوق اور تجسّس نمایاں تھا۔ بستی سے کئی فرلانگ باہر جب ہم اُن کے درمیان پہنچے تو انھوں نے مسرّت بھرے نعروں سے ہمارا استقبال کیا۔ نوجوانوں کی نگاہیں محملوں کے گرد آلود پردوں سے اندر داخل ہوئیں اور مانیٔی کے عقب میں کنیزوں کے حسین پیکر دیکھ کر اُن کے چہرے حریصانہ انداز میں چمکنے لگے۔

مانیٔی نے قافلے کی رفتار سست کر دی۔ بچّے شور مچاتے اور نوجوان اپنی اونٹنیاں کنیزوں کی محملوں سے لگائے چل رہے تھے۔ مانیٔی نے ایک بار پلٹ کر دیکھا لیکن کچھ نہ بولا۔ وہ ہنس ہنس کر بچّوں سے باتیں کر رہا تھا اُس کے لہجے میں شوخی اور زندگی نمایاں تھی اس میں چھپا ہوا خوفناک بوڑھا نہ جانے کہاں گم ہو چکا تھا۔

پھر ہم جبل کے دروازے پر پہنچ گئے اور میری نگاہوں میں حیرت سمٹ آئی۔

مانیٔی نے سامنے پھیلے ہوئے مکانوں کی جانب دیکھا اور اُس کے منہ سے متحیّرانہ آواز آزاد ہو گئی "ارے یہ کیا... شاید ہم غلط جگہ آ گئے ہیں"۔

- —— وہ بستی کون سی تھی؟
- —— جبل کے حیرت ناک اسرار!
- —— مقدّس بردہ فروش کی شخصیت کے نت نئے پہلو!

آئندہ ماہ کی تحیّر خیز اور سنسنی خیز قسط میں ملاحظہ فرمائیے

میں ایک بہت معمولی سا آدمی ہوں ۔ اوسط درجے کا قد و قامت، اوسط درجے کی آمدنی، اوسط درجے کی ذہانت کا مالک، گویا صحیح معنوں میں متوسط طبقے کا ایک فرد ہوں بلکہ اس سے بھی کچھ کم ۔کیونکہ میں ایک اوسط درجہ کے انسان کی ہمت اور بہادری سے محروم ہوں۔لیکن اس کے باوجود میں نے ایک آدمی کو قتل کیا ہے میرے تمام ہمسائے اس بات سے واقف ہیں تمام ملک اسے جانتا ہے اور جب میرا ڈیڑھ سالہ لڑکا جوان ہوگا تو وہ بھی اس خبر سے لاعلم نہیں رہے گا اور

یہ بات میرے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے، مگر میں کیا کروں حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ میں یہ جرم کرنے پر مجبور تھا۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا روس کے خلاف فنلینڈ والوں کی دلیرانہ جنگ کا حال پڑھ رہا تھا اور اُن کیلئے میرے جذبات کچھ اسی قسم کے تھے جو کمزور لوگ بہادروں کیلئے اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں. میں خاص طور سے اُن کے فوجیوں کی نشانہ بازی سے متاثر تھا کیونکہ یہی ایک بات ایسی تھی جس میں میں دوسرے لوگوں سے کچھ ممتاز تھا میں مقامی رائفل کلب کا صدر بھی تھا اور گزشتہ سال میں نے نشانہ بازی میں جنوبی ریاستوں کی چیمپئن شپ بھی جیتی تھی ۔میری تنہائی کی وجہ یہ تھی کہ ایلس اپنے برج کلب گئی ہوئی تھی اور مجھے لیسٹر کی دیکھ بھال کیلئے ٹھہرنا پڑا تھا چنانچہ اس وقت گھر میں ہم صرف دو نفر تھے ۔لیسٹر عقبی بیڈ روم میں اپنے گہوارے میں سو رہا تھا اور میں نشستگاہ میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا، جیسے جیسے رات زیادہ ہوتی جا رہی تھی میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ بے چینی کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اندھیرے سے بڑا ڈر لگتا ہے، اب آپ یہ کہیں کہ ایک جوان آدمی میں یہ ڈر بڑی عجیب بات ہے تو میں عرض کروں گا کہ تاریکی کا خوف اور خواہ کچھ بھی ہو، مگر عجیب بات ہرگز نہیں ہے ۔میں نے اخبار رکھ دیا۔ سوچ رہا تھا کہ لیسٹر کو گہوارے سے اٹھا کر بڑے بستر میں لٹا دوں اور خود بھی اسکے برابر کمبل اوڑھ کر لیٹ جاؤں چنانچہ اُٹھ کر بجلی بجھائی اور بیڈ روم کی طرف چلا لیکن ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی ۔آواز اتنی اچانک تھی کہ میں تقریباً اُچھل پڑا۔ خوف کی ایک لہر سی پورے جسم میں دوڑ گئی، اگر اتفاق سے یہ ایلس ہوتی تب بھی میں اتنا ہی خوف زدہ ہوتا ۔مگر یہ کوئی مرد تھا۔ ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا تو ایک بھاری اور کھنچی کھنچی سی آواز میرے کان سے ٹکرائی۔

"میں ایک انتہائی ضروری کام کے سلسلے میں تم سے ملنا چاہتا ہوں ــــــ" اُس نے کہا۔ "تم کہاں مل سکتے ہو مسٹر جانسن"

"کون بول رہا ہے؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"میرے کام کا تعلق اصلاحی جماعت سے ہے ــ"

اُس نے جواب دیا۔ "میں فون پر اپنا نام نہیں بتا سکتا!"

میں اُسکی یہ بات سنتے ہی جان گیا کہ وہ کوئی فریبی آدمی ہے کیونکہ اگر وہ اصلاحی جماعت کا حوالہ دے سکتا تھا تو اپنا نام بھی بتا سکتا تھا۔ اصلاحی جماعت میں کسی فرد کا نام پوشیدہ نہیں تھا ۔سارے ممبران کے نام اور دوسری تفصیلات رجسٹر میں درج تھیں، یہ احساس کرتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور مجھے ہموار لہجہ میں بات کرنا مشکل ہوگیا۔

"تم کل صبح مجھ سے میری دوکان پر مل سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں ابھی دس منٹ میں تمہارے گھر آ رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ اور لائن خاموش ہو گئی۔

میں بےحد ڈرا ہوا تھا۔ مگر کسی نہ کسی طرح بیڈ روم تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ لیسٹر بڑے آرام سے سو رہا تھا میں کچھ دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ پھر کمرے کی بتی بجھا کر کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ لیکن دھند اور تاریکی کے سوا کچھ اور نظر نہیں آیا۔ پھر الماری کھول کر وہ کولٹ ریوالور نکالا جو ایلس نے مجھے کرسمس کے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ اُس کی نال کافی لمبی تھی۔ مگر وہ میرے جیکٹ کی جیب میں آسانی سے آگیا اسکے بعد پورچ کی لائٹ جلادی اور انتظار کرنے لگا۔

اصلاحی جماعت جس کا حوالہ اس گمنام فون کرنے والے نے دیا تھا قصبہ کو غیر قانونی سرگرمیوں سے نجات دلانے کیلئے تشکیل دی گئی تھی، مگر جہاں تک اس مہم میں اُسکی کامیابی کا تعلق تھا تو اس کا حال بھی اسی مقصد سے بنائی جانے والی بیشتر جماعتوں سے زیادہ مختلف نہیں تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جو شخص بھی ان مجرمانہ حرکتوں کے پس پشت کام کر رہا تھا اُس نے قصبہ کو پوری طرح اپنے کنٹرول میں لے رکھا تھا لوگ غنڈوں، بدمعاشوں کو پکڑتے تھے اُنہیں سزا بھی ہو جاتی تھی۔ مگر ہزار طرح کی سختیوں کے باوجود اُن میں سے کوئی اپنے سرگروہ کا نام بتانے کیلئے تیار نہ ہوتا تھا اور جب تک جڑ نہ کاٹی جائے شاخوں اور پتوں کو تراشنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ جتنے مجرم پکڑے جاتے تھے اُس سے کہیں زیادہ اُن کی جگہ پُر کرنے کے لئے آجاتے تھے ۔ جب میں نے جنوبی ریاستوں کے مقابلہ میں نشانہ بازی کی چیمپئن شپ جیتی تو مجھے اعزازی طور پر اصلاحی جماعت کا ممبر بنا لیا گیا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے میں یاد رکھتا۔ چنانچہ بات جلد ہی پُرانی ہو گئی ۔مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور نے اُسے خاص طور پر یاد رکھا تھا۔

میں نے کسی قدر کانپتے ہوئے دوبارہ کھڑکی سے باہر جھانکا اور دل ہی دل میں دُعا مانگنے لگا کہ ایلس خلاف توقع جلد ہی گھر واپس نہ آجائے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کو چھو کر اطمینان حاصل کرتے ہوئے میں ابھی کھڑکی سے ہٹا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجنے لگی ۔ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے

محسوس ہوئے مگر میں کسی نہ کسی طرح دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ آنے والا شخص قد میں میرے برابر ہی تھا لیکن اس کے جسم کا پھیلاؤ مجھ سے زیادہ تھا۔ "اندر آجاؤ!" میں نے کہا اور کچھ کہے بغیر وہ کمرہ نشست میں داخل ہوگیا۔ اپنے خدوخال سے وہ کوئی غیر ملکی معلوم ہوتا تھا لمبی سی داڑھی لگا رکھی تھی، جو غور سے دیکھنے پر صاف مصنوعی لگ رہی تھی۔

"تم نہ صرف رائفل سے بہترین نشانہ لگا سکتے ہو" اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بلکہ اس میں چیمپئن شپ بھی جیت چکے ہو۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہم تمہاری اس صلاحیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک آدمی کو قتل کرانا چاہتے ہیں!"

میں بےحد خوفزدہ تھا مگر پھر بھی میں نے ہمت کر کے جیب سے ریوالور نکال لیا اور کہا "یہ کام اگر میں ابھی کرنا چاہوں تو مجھے کون روک سکتا ہے؟"

"اس کھلونے کو واپس جیب میں رکھ لو۔" وہ ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ "بے شک تم مجھے مار سکتے ہو مگر تمہارے بیوی اور بچے کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ہمارے باس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ایسی کوئی حماقت کرنے کے بجائے اطمینان سے بیٹھ کر میری بات سنو۔" ایلس اور لسٹر کی سلامتی کے خوف نے مجھے بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔ "بروس برکم عنقریب سٹی پارک کے ایک جلسے میں کچھ انکشافات کرنے والا ہے۔" اُس نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے ناموں کا اعلان اور اُن کے خلاف زہر افشانی کریگا۔ تم اس وقت سڑک کے بالمقابل واقع ایک گیرج میں چھپے ہوئے ہوگے اور گیرج کی کھڑکی سے اُسے نشانہ بناؤ گے۔ باس کا خیال ہے کہ اُس کی موت کے ساتھ ہی معاشرے کی اصلاح کا یہ ہنگامہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ وہ ان احمقانہ حرکتوں، اور ہر بار ایک نئی جماعت کے اُٹھ کھڑے ہونے سے بہت تنگ آچکا ہے۔"

بروس برکم اصلاحی جماعت کا صدر تھا۔ وہ نہ صرف ایک بہادر اور نڈر آدمی تھا بلکہ غیر شادی شدہ اور گھر بار کے جھنجھٹ سے بالکل آزاد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قصبے کے لوگوں نے صدر کے عہدے کیلئے اس کا انتخاب کیا تھا۔ وہ میرا دوست بھی تھا۔ میں نے داڑھی والے کو بھی یہ بات بتا دی۔

"تمہارا دوست ہے تو ہوا کرے۔" وہ کندھے اُچکاتے ہوئے بولا۔ "میں اظہار ہمدردی کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ میرا کام اپنے باس کے احکامات کی تعمیل کرنا ہے۔"

"اصلاحی جماعت کی مجلس عاملہ میں کئی دولت مند لوگ بھی شامل ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے اُمید ہے کہ وہ تمہارے باس کا نام معلوم کرنے کیلئے بڑی سے بڑی رقم دے سکتے ہیں اور تم اس رقم کے بلا شرکت غیرے مالک بن سکتے ہو۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "مگر دُنیا کا بڑے سے بڑا خزانہ بھی میری زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہے، ہم نے اپنے طور پر دو تین مرتبہ بروس کو مارنے کی کوشش کی مگر اُس نے اپنی حفاظت کا بڑا سخت انتظام کر رکھا ہے ہم اس کے قریب نہیں پہنچ سکتے یہی وجہ ہے کہ اب اُسے دور سے نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے، اور یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ اس وقت قصبے میں تم سے بہتر کوئی نشانہ باز موجود نہیں ہے کم سے کم رائفل چلانے میں۔"

"اگر میں انکار کر دوں تب؟"

"ضرور کر سکتے ہو، بشرطیکہ تمہیں اپنی، اپنی بیوی اور بچے کی زندگیاں پیاری نہ ہوں۔"

میں پھر ریوالور نکالنا چاہتا تھا مگر رک گیا، ظاہر تھا اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ محض حکم کا غلام تھا میں ایک داڑھی والے کو ختم کر دوں گا تو کوئی دوسرا مونچھوں والا اُسکی جگہ لے لے گا۔

"اتنے پریشان نہ ہو۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ "قتل کرنا صرف پہلی مرتبہ کچھ بھاری پڑتا ہے پھر اسکی عادت ہو جاتی ہے۔"

میں کیا جواب دیتا۔ مجھے تو یہ سارا واقعہ کسی مار دھاڑ سے بھرپور فلم کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ایسی کوئی بات میرے ساتھ بھی پیش آسکتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے یہ حقیقت تھی اور میں جارج جانسن ایک معمولی شہری، تقدیر کی اس ستم ظریفی کا ہدف بنا ہوا تھا، میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ دروازے تک پہنچ کر داڑھی والا ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہم تم سے دوبارہ رابطہ قائم کریں گے۔ شاید کل۔"

میں نے صرف سر ہلا دیا اور کمرے میں واپس آکر بیٹھ گیا۔ جب ایلس اور فریڈ لاک آئے تو میں اسی طرح گم سُم بیٹھا ہوا تھا۔

"ارے جارج!" ایلس میری صورت دیکھ کر چونکی۔ "کہیں تم نے کوئی اور بھوت تو نہیں دیکھ لیا؟"

میں نے مسکرانا چاہا۔ فریڈ نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ایلس سمجھ گئی کہ بات صرف اتنی نہیں کہ میں گھر کی تنہائی اور تاریکی سے ڈر گیا ہوں، بلکہ ضرور کوئی سنگین معاملہ ہے۔ "کیا ہوا؟" اُس نے پوچھا میں جواب دیتے ہوئے ہچکچایا۔ یہ فریڈ ہی تھا جس نے اصلاحی جماعت میں میری اعزازی رکنیت کی تجویز پیش کی تھی۔ اگر مجھے کسی کو بتانا ہی تھا تو اُسے بتا سکتا تھا۔ لیکن میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص بات نہیں، ذرا کچھ طبیعت خراب ہے!"

فریڈ کچھ دیر کے بعد چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایلس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ..... کہ تم..... کہ تمہیں میرا فریڈ کے ساتھ جانا ناگوار گزرا ہو، میں جانتی ہوں کہ آجکل وہ کچھ زیادہ ہی آ جا رہا ہے۔ لیکن..."

عام حالات میں میں اس بات پر بے اختیار ہنس دیتا۔ ایلس اور فریڈ کالج کے ابتدائی سال سے لے کر آخری کلاس تک ایک دوسرے کے منگیتر رہے تھے مگر پھر فریڈ نے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا اور ایلس سے میری شادی ہوگئی لیکن شاید پہلی وابستگی کی وجہ سے فریڈ اب بھی ایلس کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ مجھے اس بات پر شدید اعتراض ہو سکتا تھا مگر میں ایلس پر سو فیصدی اعتماد کرتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے بےوفائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اِدھر کچھ دنوں سے دُکان کے بعض معاملات ذہن کو پریشان کر رہے ہیں اور شاید یہی ذہنی پریشانی طبیعت کو متاثر کر رہی ہے۔"

منہ سے یہ الفاظ نکالنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میں ایلس کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکوں گا۔ میرا ذہن روس اور فن لینڈ کی جنگ کی طرف چلا گیا۔ آخر فن لینڈ والے اپنے ملک کو بچانے کے لئے روسیوں کو قتل کر رہے ہیں یا نہیں، اگر میں اپنے گھر کو بچانے کیلئے کسی کی جان لے لوں گا تو کیا ہے لیکن مجھے احساس تھا کہ میرے اندر وہ ہمت ہی نہیں ہے، جو کسی انسان پر گولی چلانے کیلئے ضروری ہوتی ہے، میں جو جانوروں کا شکار کھیلنے سے گھبراتا تھا مجھ سے ایک آدمی کو قتل کرنے کی توقع کی جا رہی تھی۔

دوسرے دن اپنے اسٹور میں مجھ سے ذرا سا بھی کام نہیں ہو سکا۔ میں نے بیوی بچے کو لے کر قصبے سے باہر جانے کے بارے میں بھی سوچا لیکن اس میں ایک دشواری تو یہ تھی کہ میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ کسی دوسری جگہ جا کر نئے سرے سے کام شروع کر سکوں، دوسرے اس بات کی بھی کیا ضمانت تھی کہ یہاں سے کوئی بدمعاش میرا تعاقب کرتا ہوا وہاں تک نہیں پہنچ جائے گا۔

دوپہر کو اصلاحی جماعت کی کھانے کی دعوت تھی، میرا دل تو نہیں چاہتا تھا۔ مگر ذہن کو دوسری طرف متوجہ کرنے کیلئے میں شریک ہو گیا۔ جب بروس برکم تقریر کرنے کیلئے کھڑا ہوا تو میں اُسکی طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا۔ میرا تصور اُسے بار بار ایسی حالت میں دیکھ رہا تھا کہ اُسکی پیشانی پر گولی کا سوراخ ہے اور تمام جسم خون میں نہایا جا رہا ہے، فریڈ لاک میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ شاید اُس نے میرے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو تاڑ لیا۔

"کیا بات ہے جارج!" وہ سرگوشی میں بولا۔ "تمہاری طبیعت کیا ابھی تک خراب ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بروس کہہ رہا تھا۔

"میں آپ تمام حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ پولیس ہم سے سو فیصدی تعاون کرنے کیلئے تیار ہے، یہاں اس قسم کی افواہیں اُڑ رہی ہیں اور ایک اخبار نے اس جانب اشارہ بھی کیا ہے کہ ہماری پولیس اِن مجرمانہ سرگرمیوں کی پُشت پناہی کر رہی ہے، میں نے گزشتہ پورے ماہ اس الزام کی بڑی باریک بینی سے چھان بین اور تحقیقات کی ہے اور پورے اعتماد کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس افواہ میں کوئی صداقت نہیں ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اس بات کی زیادہ سے زیادہ پبلسٹی کریں تاکہ عوام......."

میں اس سے زیادہ نہیں سُن سکا۔ میں نے بڑبڑاتے ہوئے فریڈ سے معذرت طلب کی اور کہا کہ وہ دوسروں سے میری غیر حاضری کیلئے معذرت کر لے اور خود اُٹھ کر باہر چلا آیا۔ میں اجلاس سے تو اُٹھ آیا لیکن ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں میں اپنے پریشان ذہن کو تسکین پہنچانے کے لئے جا سکتا۔ اسٹور جا سکتا تھا لیکن میں اسپورٹس کا سامان فروخت کرتا تھا جس میں رائفلیں بھی شامل تھیں اور اس وقت ذہن کی یہ کیفیت تھی کہ رائفل کے تصور سے ہی جھرجھریاں آرہی تھیں، چنانچہ میں اپنی کار میں بیٹھا اور دیہات کی جانب نکل گیا۔ دیہات کا منظر خوشگوار تھا۔ مگر اندھیرے کے خوف سے مجھے جلد ہی واپس لوٹنا پڑا۔ واپسی میں مجھے پولیس کے بارے میں بروس کے الفاظ یاد آئے، میں نے اس خیال سے کہ شاید پولیس نے گروہ کے باس کے بارے میں کوئی سُراغ لگا لیا ہو، کار کا رُخ پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔ پولیس چیف کو میں اپنے بچپن کے زمانے سے جانتا تھا۔ پھر اصلاحی جماعت کے ساتھ میرے تعلق نے بھی مجھے ایک خاص اختیار دے دیا تھا اس لئے اُس نے بڑے پُرتپاک انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا۔ مگر میرا سوال سُن کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

"کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی ہے۔" وہ بولا۔ "اور نہ اس وقت تک ہمیں کوئی کامیابی ہو سکتی ہے، جب تک ہم گروہ کے سرغنہ تک نہ پہنچ جائیں بات دراصل یہ ہے کہ گروہ کے آدمی اپنے باس سے اس قدر خوفزدہ رہتے ہیں کہ وہ اُسکے خلاف زبان نہیں کھول سکتے، وہ خوف کی طاقت کیساتھ اُن پر حکمرانی کر رہا ہے، اگر وہ پکڑا جائے یا مارا جائے تو پورا گروہ بکھر جائیگا۔ اب تک جو مجرم پکڑے گئے ہیں ہم نے عام قاعدے سے ہٹ کر اُن پر سختی کر کے بھی دیکھ لی لیکن ہر شخص پر اپنے باس کا ڈر اتنا غالب ہے کہ وہ پولیس کے خوف کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔"

میں جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے، خود میری اپنی حالت اِسکی

گواہ تھی، میرا نہ پولیس سے تعلق تھا اور نہ مجرموں سے اسکے باوجود خوف سے میری کیفیت یہ تھی کہ جو کچھ دل میں تھا، زبان پر نہیں لاسکتا تھا میں ایک پرانے دوست اور بچپن کے ساتھی کو اُس داڑھی والے کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا۔ میں خود اس قانون کی مدد نہیں کرسکتا تھا جس کی مدد کرنیکا فرض ایک شہری کی حیثیت سے مجھ پر عائد ہوتا تھا۔ یہ بالکل ویسی ہی بات تھی جیسے اس قصبے پر قانون کی نہیں کسی ڈکٹیٹر کی حکمرانی ہو۔ کسی مجرم ڈکٹیٹر کی۔

پولیس اسٹیشن سے نکل کر میں سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جاؤں، اچانک مجھے ایک جگہ کا خیال آگیا، فریڈ لاک نے چند ہفتے پہلے میری نئی رائفل شکار کے لئے عارضیاً مانگی تھی، میں اس رائفل کو استعمال کرنیکا ارادہ کر رہا تھا چنانچہ میں سیدھا فریڈ کے گھر چل دیا۔ وہاں پہنچا تو میں نے باہر ایک کالے رنگ کی سیڈان کھڑی دیکھی، اگر یہ فریڈ کی تھی تو شاید اُس نے حال ہی میں خریدی تھی لیکن وہ اُسکی نہیں تھی کیونکہ جب میں فریڈ کے اسٹڈی روم میں داخل ہوا تو وہاں ایک چھوٹے قد کے آدمی کو بیٹھا پایا۔ فریڈ کہہ رہا تھا۔

"اور تم اپنے باس سے کہہ سکتے ہو کہ میں کسی قیمت پر نہیں بک سکتا۔ اُس سے کہہ دینا اب اسکے دن قریب آگئے ہیں، چند ہفتوں کے اندر اندر اُس کا اور اُس کے گروہ کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

وہ آدمی مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑایا۔ میری طرف تیز نظروں سے دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"اُس غنڈے کا یہ چمچہ مجھے خریدنے آیا تھا۔" فریڈ ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "جی تو چاہتا تھا کہ اسے جیل میں ٹھونس دوں۔ مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔"

میں نے اُسکی ہمّت کی تعریف کی کہ اُس نے گروہ کے باس کو ایسے الفاظ میں جواب دیا ہے۔

"ہمت کی بات نہیں ہے دوست!" اُس نے کہا۔ "مجھے کس چیز کی کمی ہے، جو اسکے لالچ میں آتا۔ اسکے علاوہ ایک محبِّ وطن شہری کی حیثیت سے میں مجرموں کا ساتھ دینے کیلئے کس طرح آمادہ ہو سکتا ہوں، مجھے خواہ کتنا ہی نقصان اُٹھانا پڑے میں ان غنڈوں کے خلاف اپنی لڑائی جاری رکھونگا"

میں نے اُس سے اپنی رائفل مانگی، اُس نے اُٹھ کر الماری سے رائفل نکالی اور میرے ہاتھ میں دیدی ـــ "بہت اچھی رائفل ہے۔" وہ بولا "اگر کبھی اسے فروخت کرنیکا ارادہ ہو تو مجھے ضرور بتانا۔"

استعمال کرنے کے بعد البتہ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہونگا۔ مگر یہ بات میں اس وقت اُسے کس طرح بتا سکتا تھا۔ گھر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ مگر میں پھر بھی ہچکچا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ آجکل میں جتنا زیادہ ایلس اور لسٹر سے قریب رہوں گا اتنی ہی زیادہ بعد میں مجھے اُنکی جدائی پریشان کریگی کیونکہ اپنی تمام تر کمزوری اور بزدلی کے باوجود میں جانتا تھا کہ ایک انسان کی جان لینے کے بعد میں کبھی اُن سے آنکھیں چار نہیں کرسکوں گا۔ اِلّا یہ کہ اپنے جرم کا اعتراف کرلوں اور اقبال جرم کا مطلب تھا کم سے کم زندگی بھر کی قید۔ لسٹر کھیلنے کے موڈ میں تھا۔ آدھ گھنٹے تک میں نے کوشش کی کہ میں بھی اسکے ساتھ قہقہے لگا سکوں، اس خوف و پریشانی کو بھول جاؤں جو مجھے مضطرب کیئے ہوئے ہے، مگر ناکام رہا اُکتا کر میں تہہ خانے میں جانے کے ارادے سے اُٹھا کہ وہاں جاکر کچھ کارتوس تیار کرلوں۔ باورچی خانہ کے پاس سے گزرا تو ایلس نے نگاہ اُٹھا کر کچھ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔ میں اپنے استعمال کیلئے خود ہی کارتوس بنایا کرتا تھا اور اس معاملہ میں میری صلاحیت اور تجربہ اتنا زیادہ تھا کہ میں نے اپنے کارتوسوں کے لئے اپنا ایک مخصوص ڈیزائن ایجاد کرلیا تھا۔ چنانچہ میرے لئے ایک ایسی گولی تیار کرنا کوئی مشکل بات نہیں تھی جو برؤس برنم کی ٹھیک پیشانی پر جاکر لگے اور پھر بھی اُسے نہ مار سکے۔

کچھ دیر تک میں اس خیال کے ہر پہلو کا جائزہ لیتا رہا جیسا کہ میں نے کہا۔ یہ بات قطعی طور پر ممکن تھی، مگر گولی چلانے کے بعد جو نتائج میرے لئے پیدا ہوتے وہ کچھ غیر یقینی سے تھے۔ اگر داڑھی والے کے باس کو شک بھی ہو گیا کہ میں نے اُسے دھوکا دیا ہے تو.... میں کانپ کر رہ گیا۔

میں چھت کے اوپر لسٹر کے اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ اور ایلس کے بولنے کی آوازیں سُن رہا تھا۔ میں ایک کمزور دل آدمی تھا لیکن اُن دونوں کی سلامتی کیلئے قتل جیسا جُرم کرنے پر آمادہ تھا۔

آخر میں نے ایک درمیان کی راہ نکالی، تین گولیاں تیار کیں، دو کی طاقت رائفل کی گولی کے مطابق رکھی اور ایک کو ہلکی طاقت کا بنایا۔ پھر میں نے ہلکی گولی کو رائفل میں ڈال کر فائر کیا، فائر کرنے کے بعد میں نے اُس بورڈ کا جائزہ لیا جسے میں آزمائشی نشانوں کیلئے استعمال کرتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اگر میں اتنی ہلکی طاقت کی گولی بھی چلاؤں تب بھی چونکہ میرے اور برؤس کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہو گا اس لئے اس بات کا خطرہ ہے کہ گولی خواہ اُسے مار نہ سکے مگر زندگی بھر کیلئے اندھا ضرور کردیگی۔

ایلس کے آواز دینے سے بیشتر میں نے کچھ اور ہلکی گولیاں بنائیں میں نے سوچا کہ پوری قوت کی گولیوں کے ساتھ میں انہیں بھی جیب میں ڈال کر لے جاؤں گا۔ شاید وہاں میں اپنے اندر انہیں استعمال کرنے کی ہمّت پیدا کرسکوں۔ داڑھی والے نے ٹھیک دس بجے فون کیا۔

"جلسہ کل رات ہو رہا ہے۔" اُس نے بتایا۔ "میں آٹھ بجے تمہیں تمہارے اسٹور سے لے لوں گا۔"

میں نے بڑبڑاتے ہوئے کچھ جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔ کمرہ نشست میں داخل ہوا تو ایلس نے اخبار رکھ کر میری طرف دیکھا۔

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں کیا بات پریشان کر رہی ہے؟" اُس نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "یہ مت کہنا کہ کوئی کاروباری معاملہ ہے، یا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے، کیونکہ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ان دونوں سے زیادہ کوئی اہم بات ہے۔"

میں کئی لمحوں تک چُپ چاپ اُسکی صورت دیکھتا رہا۔ پھر آخر کار بولنا پڑا۔

"تمہیں ہفتہ تک سب کچھ معلوم ہو جائے گا، اس بات کا تعلق اصلاحی جماعت سے ہے اور میں سر دست اِسے راز رکھنے پر مجبور ہوں۔ لیکن میرا وعدہ ہے کہ ہفتہ تک تمہیں تمام تفصیلات کا علم ہو جائیگا۔"

"کیا کوئی خطرناک بات ہے؟" ایلس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "لیکن مجھے اسے انجام دینا ہی پڑیگا۔ البتہ ایک بات یاد رکھنا۔ میں جو کچھ بھی کروں گا تمہارے اور لسٹر کے لئے کروں گا۔ میں کسی فلمی ہیرو کی طرح شاندار مکالمے بول کر تمہیں اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکتا۔ مگر یقین جانو دُنیا میں کوئی بھی تم سے اور لسٹر سے اتنی محبت نہیں کرسکتا، جتنی میں کرتا ہوں۔"

وہ میری بات سُن کر مسکرائی۔ ایسی ہنسی جس سے اُسکی بے پایاں محبت کا اظہار ہو رہا تھا اور اس تبسم میں صرف محبت ہی نہیں تھی بلکہ اس میں تعریف و توصیف کے تاثرات بھی نمایاں تھے، اب میں اُسے کیا بتاتا کہ یہی ایک چیز ایسی تھی جس کا میں خود کو مستحق خیال نہیں کرتا تھا۔ میں نے اُسے بڑی گرمجوشی کے ساتھ پیار کیا۔

وہ رات کروٹیں بدلتے گزری، دوسرے دن بھی میں کیا کچھ کرتا رہا مجھے کچھ یاد نہیں، میری تمام حرکات و سکنات کسی مشین کی طرح تھیں جو مقررہ کام انجام دے رہی ہو لیکن یہ تو ظاہر حالت تھی.... اسکے پیچھے جو طوفان برپا تھا اُس نے میرے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا میں تمام دن خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ اور بڑی جدوجہد کے بعد شام کے چھ بجے جاکر کہیں اپنے آپ پر کسی حد تک قابو پا سکا۔ اپنی رائفل میں صبح ہی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا اسلئے اب شام کو گھر جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، میں نے سوچا کہ رات کا کھانا کسی ریسٹورنٹ میں کھا کر پھر داڑھی والے سے ملنے دوکان واپس آجاؤں گا۔ جانے سے پہلے میں نے ایلس کو فون کیا۔ "کیا وہ کام جس کا تم نے ذکر کیا تھا آج رات ہونیوالا ہے؟" اُس نے پوچھا۔ "ہاں!" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ ایک لمحے کیلئے چپ سی رہ گئی۔ "آج صبح تم اپنی نئی رائفل بھی ساتھ لے گئے تھے؟" ایلس نے دوسرا سوال کیا۔

"ہاں۔"

"میں تمہاری واپسی کا انتظار کرونگی جارج!" وہ جیسے سرگوشیوں میں بولی۔ "اور میں تمہارے لئے دُعا بھی کروں گی۔"

فون کرنے کے بعد میری طبیعت کچھ اتنی خراب ہوئی کہ میں نے کھانے کا ارادہ ترک کر دیا، اسٹور بند کیا اور دو گھنٹے تک سڑکوں پر گھومتا رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ میرے قدم مجھے کہاں کہاں لے گئے تھے، بس میں چلتا رہا اور کوستا رہا۔ اپنے آپ کو، مجرموں کے سرغنے کو، یہاں تک کہ برؤس برنم کو بھی کہ جس نے خواہ مخواہ خدائی فوجدار بننے کے شوق میں اصلاحی جماعت کا بکھیڑا شروع کیا تھا۔ بہرحال ٹھیک آٹھ بجے میں اسٹور کے سامنے موجود تھا۔ سیاہ رنگ کی ایک بڑی سیڈان کار میری منتظر تھی۔ اگلی سیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور داڑھی والا اسٹیرنگ وہیل سنبھالے بیٹھا تھا، میں نے اسٹور سے اپنی رائفل نکالی اور دوبارہ دروازہ مقفل کرتے ہوئے کار میں آبیٹھا۔

داڑھی والے نے سر ہلایا اور کار سٹی پارک کی جانب موڑ دی۔

جب ہم گیرج کے قریب والی گلی میں پہنچے ہیں تو پارک تقریباً بھر چکا تھا اور پارک کے درمیان بنا ہوا بلند چبوترہ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ "روشنی اتنی تیز ہے کہ تمہیں نشانہ لینے میں کوئی زحمت نہیں ہوگی۔" داڑھی والے نے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

گیرج میں صرف ایک آدمی تھا۔ اُس نے ہمیں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہوئے دیکھا مگر کچھ نہ بولا۔ ممکن ہے وہ کوئی داڑھی والے کا ساتھی ہو، یا پھر کوئی مجھ جیسا کمزور دل آدمی جو باس کی ہدایات ماننے پر مجبور ہو۔

گیرج کی چھت پر تیل، ربر اور مٹی کی ملی جُلی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے پارک کے چبوترے کی طرف دیکھا روشنی بھی ٹھیک تھی اور فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہیں تھا میرے لئے نشانہ لینا بہت آسان بات تھی۔ عجیب بات تھی کہ میری اعصابی کشیدگی بھی اس وقت غائب ہو چکی تھی، میں اس وقت خود کو کسی مشین کے ایک پُرزے کی طرح محسوس کر رہا تھا جسے ایک مقررہ فرض انجام دینا ہوتا ہے۔ چبوترے پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے، درمیان میں برؤس تھا اُس کے بائیں ہاتھ پر جو شخص اس وقت تقریر کرنے کیلئے کھڑا ہوا تھا وہ فریڈ لاک تھا اُس نے مائیکروفون ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا؛

"حضرات! ہم آج رات ایک چونکا دینے والا انکشاف کرنا چاہتے ہیں۔ جو......"

مگر میں اس کا اگلا فقرہ نہیں سُن سکا کیونکہ اسی وقت داڑھی والے نے بھی بولنا شروع کر دیا۔

"ہم نے سوچا کہ ممکن ہے تم ہم سے کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کرو۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "چنانچہ میں تمہاری رائفل کے لئے کارتوس لیتا آیا ہوں، ایسا کارتوس جس سے نکلنے والی گولی اپنا کام ادھورا نہیں چھوڑ سکتی چنانچہ تم نے اپنی جیب میں جو کارتوس ڈال رکھے ہیں وہ مجھے دیدو۔"

میں نے وہ تین کارتوس اُسے دیدیئے وہ مخالف دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کا رُخ ایک لمحے کیلئے بھی میری جانب سے نہیں ہٹا تھا۔ میں نے رائفل کی نال کھولی، اور پڑی ہوئی عادت کے مطابق غیر شعوری طور پر کارتوس کو ہاتھ میں لے کر تولا اور پھر اُسکی طرف دیکھا ایک سیکنڈ کیلئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا ہو۔

کارتوس کے چھلّے پر بنا ہوا نشان ...... کیا یہ وہی تھا... بلاشک و شبہ وہی تھا..... یہ نشان اور گولی دونوں میرے اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے تھے اور پھر بھی اگر میرے ذہن میں کوئی شبہ تھا تو اس لکیر کو دیکھ کر جاتا رہا، جو نشان بناتے وقت ہاتھ بہک جانے سے پڑ گئی تھی، دُنیا بھر میں کسی اور کارتوس پر یہ لکیر اس انداز سے نہیں بنائی جا سکتی تھی اور..... اور یہ وہ کارتوس تھا جس نے فریڈلاک کو ہلاک کر دیا تھا۔

گذشتہ دنوں کے تمام چھوٹے بڑے واقعات میری نظروں کے سامنے دوڑنے لگے۔ وہ کار جو میں نے فریڈ کے مکان کے سامنے کھڑی دیکھی تھی وہی کار تھی جس میں آج داڑھی والا مجھے اسٹور سے گیرج لایا تھا اُس دن میں غیر متوقع طور پر وہاں پہنچ گیا تھا، فریڈ نے اپنی باتوں سے اس بوتے شخص کی آمد کو دوسرا رنگ دینے کی کامیاب کوشش کی پھر آج کی پارک کی میٹنگ کا حال صرف ممبران کو ہی معلوم تھا۔ میٹنگ ہونے والی ضرور تھی۔ مگر اس کے لئے.... دن کا تعین کل ہی ہوا تھا اور کل رات ہی داڑھی والے نے مجھے فون کر کے اطلاع دیدی تھی اتنی جلدی کسی غیر ممبر کو معلوم ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی یاد آیا کہ دو سال پہلے فریڈ کی مالی حالت بہت ناگفتہ بہ تھی وہ عموماً دوسروں کا مقروض رہتا تھا۔ جبکہ آج وہ دولت مند ہے۔ پھر وہ ہمیشہ سے ایلس کو اپنانا چاہتا تھا اس طرح اُسکے دو مقصد پورے ہو رہے تھے، بروس سے بھی پیچھا چھوٹ جاتا اور مجھ سے بھی۔

میں نے رائفل بند کر کے چھت کی منڈیر پر ٹکا دی۔ میں اب خوفزدہ نہیں تھا میں اب نروس بھی نہیں تھا میرے دل و دماغ اس سے کہیں زیادہ شدید جذبے کی آماجگاہ تھے۔ میں سرتاپا نفرت بنا ہوا تھا میں نے رائفل پکڑی تو میرے ہاتھوں میں کوئی لرزش نہیں تھی۔ میں نے فریڈ کی پیشانی کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔

پھر جب میں نے داڑھی والے کی طرف گھوم کر اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو یہ میری بلند ہمتی نہیں تھی میں بہادری اور بزدلی کے جذبات سے کہیں آگے گزر چکا تھا۔ اُس وقت مجھے اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں تھا۔

"میں بروس کو نہیں مار سکا۔" میں نے کہا۔ "نشانہ چوک گیا۔"

داڑھی والا دیوار سے ہٹ کر میری طرف بڑھا تو اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس نے ریوالور میری پسلیوں سے لگا دیا اور پارک کی جانب دیکھا۔ لوگ چبوترے کی طرف دوڑ رہے تھے مگر پھر بھی اُس نے جو کچھ دیکھنا چاہا تھا دیکھ لیا اور وہ میری طرف پلٹا۔ میں اُس وقت بھی کوئی ڈر محسوس نہیں کر رہا تھا۔

"بیشک تم بروس کو نہیں مار سکے۔" وہ اسی سپاٹ انداز میں بولا۔ "مگر تمہارا نشانہ خطا نہیں گیا۔ اب بہتر یہی ہوگا کہ تم یہاں سے نکل جاؤ ابھی کسی کو اس سمت میں دیکھنے یا اس طرف آنے کا خیال نہیں آیا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ تم..... کہ تم مجھے قتل نہیں...."

"کوئی کسی کی جان لینا پسند نہیں کرتا۔" اُس نے میری بات کاٹ دی۔ "یہاں تک کہ میں بھی بشرطیکہ مجھے کوئی معقول معاوضہ نہ مل رہا ہو اور اب اگر میں تمہیں قتل بھی کر دوں تو مجھے اُس کا معاوضہ کون دیگا۔"

اس نے اپنا ریوالور چھت پر پڑے ہوئے ٹائروں کے اونچے ڈھیر کی طرف اُچھال دیا اور پھر میری جانب دیکھے بغیر تیزی سے سیڑھیاں اُترتے ہوئے میری نظروں سے... اور میری زندگی سے بھی اوجھل ہو گیا۔

بیشک عدالت نے مجھے بری کر دیا خاص طور سے جب پولیس نے فریڈلاک کے گھر کی تلاشی لینے کے بعد ایسے کاغذات برآمد کر لئے جنسے اسکے مجرموں کے سرغنہ ہونیکے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا۔ ہمارا قصبہ غنڈوں اور بدمعاشوں سے پاک ہو گیا مگر میں نے بہرحال ایک آدمی کو قتل کیا تھا اور کم سے کم اس عذر سے میرا دل مطمئن نہیں ہوتا کہ وہ مجرم تھا اور میں حالات کے تحت ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی تمام رائفلیں، جو مجھے بیحد عزیز تھیں، فروخت کر ڈالیں۔ مچھلی کے شکار میں وہ مزا نہیں ملتا جو رائفل سے شکار کرنے میں آتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جب اس خونی واقعہ کی یاد ذہن میں دھندلا جائیگی۔ تو شاید مجھے اس نئے شغل میں بھی لطف آنے لگے۔

دولت اور بیوی

شمیم جمیل

اس کی کہانیوں کی طرح اس کا منصوبہ بھی ناکام رہا

خانم

فرح نے کمرے کے دروازے پر رُک کر اپنے شوہر کو دیکھا جو ٹائپ رائٹر پر بیٹھا نئی جاسوسی کہانی لکھ رہا تھا۔

"حسن! میں شاپنگ کیلئے شہر جا رہی ہوں۔" فرح نے کہا۔ حسن نے سر اُٹھا کر اپنی بیوی کو دیکھا۔

"ارے، تم نے تو میرا پسندیدہ لباس پہنا ہوا ہے، گویا تم مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہو۔"

"نہیں۔" فرح نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم اپنی نئی کہانی مکمل کرلو۔" "اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" حسن نے دروازے کے پاس جا کر اپنی بیوی کا بوسہ لیا۔ "کیا تم تنہا شہر جانے کے قابل ہو؟"

فرح دھیرے سے مسکرائی۔ "ذرا سی بدہضمی ضرور ہے لیکن میں مریض بن کر گھر میں تو قید نہیں رہ سکتی، دوپہر کے کھانے سے پہلے واپس آجاؤنگی، تم کھانا باہر مت کھانا۔"

"جلدی آنے کی ضرورت نہیں جانِ من! میں خود گیارہ بجے

کے قریب باہر جاؤں گا۔" حسن نے کہا۔

"اوہو، کیا تمہیں آج پھر اپنی کہانی کے سلسلے میں تحقیقاتی کام کرنا ہے؟"

"ہاں!" حسن نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ گرمیوں کے موسم میں دس کیلو برف کو پگھلنے میں کتنی دیر لگ سکتی ہے!"

"اس کا انحصار درجہ حرارت پر ہوتا ہے۔ خیر تم کھانا کہاں کھاؤ گے؟"

"وہی پرانی جگہ، لائبریری کے پاس جو کیفے بہلوی ہے۔"

حسن نے پُرتشویش نظروں سے فرح کو دیکھا۔ "تمہارا چہرہ زرد ہو رہا ہے۔ جانِ من! کیا تم گاڑی چلا سکو گی؟"

"کیوں نہیں۔" فرح نے جلدی سے جواب دیا۔ حالانکہ اُسکا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر نکل جائے گا۔

"تم میری فکر نہ کرو حسن! میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

فرح ہلکی رفتار سے گاڑی چلاتی ہوئی شہر میں آئی اُس نے کاشانۂ رضا کے پیچھے اپنی گاڑی روکی اور پھر لفٹ کے ذریعہ ساتویں منزل پر پہنچی ایک آفس کے دروازے پر رُک کر اُس نے اُس پر لکھا ہوا نام پڑھا۔

"شہریار مشہدی۔ پرائیویٹ جاسوس۔" اُس نے اس پرائیویٹ جاسوس کا انتخاب ٹیلیفون ڈائرکٹری کے پیلے صفحات میں سے کیا تھا اس جاسوس کو منتخب کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ اس نام کو پڑھ کر نہ جانے کیوں فرح کو احساس ہوا کہ یہ شخص قابلِ اعتماد ہے۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی۔ شہریار مشہدی اپنے نام کے برعکس منحنی سا آدمی ثابت ہوا بالکل کسی ڈرپوک چوہے کی طرح، اُس کے دانت مصنوعی تھے اُس نے مسکرا کر فرح کا استقبال کیا۔

"خانم فرح!"

"جی ہاں۔ کیا میں صحیح وقت پر پہنچی ہوں؟"

"جی ہاں۔ تشریف رکھئے!"

فرح اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس کا دل اس قدر زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ پریشان ہو گئی اور سوچنے لگی کہ آخر رات کو اُس نے ایسی کونسی چیز کھائی تھی جس کی وجہ سے بدہضمی ہوئی اور بدہضمی کے نتیجے میں اُس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا ہے، حالانکہ پچھلے کچھ عرصے سے وہ حسن کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہاضمے کی گولیاں برابر کھا رہی تھی لیکن اس کے باوجود کمزوری بڑھتی جا رہی تھی اور بدہضمی میں کوئی افاقہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"اب فرمائیے خانم فرح! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" پرائیویٹ جاسوس نے پوچھا۔

فرح نے کئی گہرے سانس لئے اُسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی، شہریار نے اُسکی بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھ کر غلط نتیجہ اخذ کیا۔

"خانم گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یقین کیجئے۔ آپ جو کچھ کہیں گے وہ صرف میرے اور آپکے درمیان رہے گا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کو اپنے شوہر پر جو شبہ ہے وہ صحیح ثابت ہو میرے ذاتی تجربے میں ایسے بہت سے کیس ہیں جن میں تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہوا کہ بیوی کا اپنے شوہر پر بیوفائی کا شبہ غلط تھا، آپ اطمینان سے بیٹھیں اور پہلے مجھے اپنے شوہر کے متعلق کچھ بتائیں۔"

"حسن جاسوسی کہانیاں لکھتا ہے۔" فرح نے چند لمحے توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ "وہ اس پیشے میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہے لیکن آپ اُسے بالکل ناکام بھی نہیں کہہ سکتے، وہ اپنی کہانیوں پر بہت محنت کرتا ہے لیکن اُسکی زیادہ تر کہانیاں جاسوسی رسالوں کے ایڈیٹر واپس کر دیتے ہیں۔"

فرح خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ فرح کو خاموش دیکھ کر شہریار نے اُسکی ہمت بڑھائی۔ "آخر وہ کون سی وجوہ تھیں جنکی بنا پر آپ کو اپنے شوہر پر بیوفائی کا شبہ پیدا ہوا؟"

"بہت سی وجوہ تھیں مثلاً اُس کا بدلا بدلا رویہ۔ کچھ عرصے سے میری طبیعت خراب ہے اس پر حسن نے اصرار کیا کہ وہ میری طبیعت ٹھیک ہونے تک دوسرے کمرے میں سوئے گا، اس کے علاوہ وہ اچانک ہی میرے لباس میں دلچسپی لینے لگا ہے، پہلے کبھی وہ میرے لباس میں دلچسپی نہیں لیتا تھا کہ میں نے کونسا لباس پہنا ہوا ہے لیکن اب وہ خاص طور پر اس چیز کو نوٹ کرتا ہے، اسکے علاوہ پہلے وہ مجھ سے محبت اور گرمجوشی سے پیش آتا تھا۔ لیکن اب اُسکے رویہ میں صرف نرمی اور تشویش ہوتی ہے جیسے میں کوئی غیر ہوں۔ ہماری شادی کو صرف تین سال کا عرصہ ہوا ہے اور پہلی مرتبہ میں نے اسکے رویہ میں یہ تبدیلیاں محسوس کی ہیں میرے شبہ کی دوسری وجہ اُس کا تحقیقاتی کام ہے وہ مجھ سے شادی سے پہلے بھی کہانیاں لکھتا تھا۔ شادی کے بعد بھی وہ کہانیاں لکھتا رہا، لیکن اس عرصے میں میں نے کبھی اُسے اپنی کہانی کے سلسلے میں تحقیقاتی کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا، کچھ عرصے سے اچانک اُس نے تحقیقاتی کام شروع کر دیا اب وہ تقریباً اس سلسلے میں روزانہ کتب خانۂ عمر خیام جاتا ہے اُس کا کہنا ہے کہ اس طرح وہ اپنی کہانیوں کو حقیقت سے قریب تر کرنا چاہتا ہے تاکہ پڑھنے والے کو ان کہانیوں پر حقیقت کا گمان ہو۔ میں نے اُسکی نئی کہانیاں پڑھیں لیکن

مجھے ان کہانیوں میں ایسے نکتے نظر نہیں آئے جن پر اتنی چھان بین کی ضرورت پڑی ہو۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا! اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ کتب خانے میں چھان بین کا صرف بہانہ کرتا ہے، اس کا مقصد صرف گھر سے دور رہنا ہوتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اگر کسی روز کتب خانہ رات کو دیر تک کھلا رہتا ہے تو وہ بھی رات گئے گھر واپس آتا ہے۔"

"سمجھا!" شہریار نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ کا خیال ہے کہ آپکے شوہر کتب خانے نہیں جاتے بلکہ یہ وقت کسی دوسری عورت کے ساتھ گزارتے ہیں اور کتب خانے جا کر چھان بین کرنا تو محض ایک بہانہ ہے۔"

"جی ہاں، میں یہی کہنا چاہتی تھی۔" فرح نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا آپ اپنے شوہر کی تصویر لائی ہیں؟"

فرح نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے حسن کی تصویر نکال کر شہریار کے سامنے رکھ دی، وہ اپنے شوہر کی جاسوسی کرانے پر بے حد نادم تھی اُسے یہ بڑی گھٹیا سی حرکت محسوس ہو رہی تھی۔

حسن سے ملاقات ہونے سے نو مہینے قبل فرح کے پہلے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا، اس لئے جب اُسکی حسن سے ملاقات ہوئی تو وہ ایک سوگوار بیوہ تھی۔ حسن اُسے دیکھتے ہی اُسکی محبت میں گرفتار ہو گیا اور بہت جلد وہ دوبارہ بیوہ سے بیوی بن گئی، وہ حسن ہی تھا جس نے اُس سے شادی کر کے اس کو دوبارہ ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار کیا ورنہ وہ تو ہمیشہ کیلئے ازدواجی زندگی کی خوشیوں اور ہنگاموں کو خیرباد کہہ چکی تھی حقیقت یہ ہے کہ فرح نے دوسری شادی پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ ایک سپاٹ سی گھریلو عورت تھی، نہ تو وہ حسین تھی، نہ اُس کا جسم پُرکشش تھا، نہ وہ نوجوان تھی، پھر اس زمانے میں جب نوجوان، پُرکشش اور خوبصورت لڑکیاں ہر معقول مرد کو حاصل کرنے کیلئے ہر کام کر گزرنے پر آمادہ رہتی ہیں وہ کس طرح اپنے لئے ایک شوہر حاصل کرنے کی اُمید کر سکتی تھی اور شوہر بھی حسن جیسا جو عمر میں اُس سے کئی سال چھوٹا تھا۔

شہریار کچھ دیر تک اُسکے شوہر کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ "اس وقت آپکے شوہر کہاں ہوں گے خانم فرح! میں چاہتا ہوں کہ اپنا کام فوراً شروع کر دوں۔"

"حسن نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ گیارہ بجے کتب خانے جانے کے لئے گھر سے نکلے گا۔ آج اُسے یہ معلوم کرنا ہے کہ گرمیوں کے موسم میں دس کیلو برف پگھلنے میں کتنی دیر لگتی ہے، اسکے علاوہ وہ لائبریری کے قریب کیفے بہلوی میں کھانا کھائے گا۔"

"ٹھیک ہے، میں یہاں سے آپکے گھر جا رہا ہوں تاکہ جیسے ہی آقائے حسن باہر نکلیں میں اُن کا تعاقب کر سکوں۔" شہریار نے تصویر کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"اگر آپ کو کسی غیر معمولی بات کا علم ہو تو آپ مجھے فوراً ٹیلیفون کر دیجئے گا۔"

"ضرور۔" شہریار نے کہا۔ "لیکن میری خواہش ہے کہ مجھے کسی ایسی چیز کا علم نہ ہو جسے سُن کر آپ اُداس ہو جائیں۔"

فرح شہریار کے دفتر سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کچھ ضروری چیزیں خرید سکے اُسے اپنا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور سر چکرا رہا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھی رہی، جب اُسے یقین ہو گیا کہ حسن اب گھر سے جا چکا ہو گا تو اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور احتیاط سے چلاتی ہوئی گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

وہ تقریباً بارہ بجے گھر پہنچی حسن جا چکا تھا، وہ اس معمولی سے سفر سے اس قدر تھک گئی تھی کہ اُسے اپنے لئے کھانا پکانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی، وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کر کے اوپری منزل میں اپنی خوابگاہ میں پہنچی جو پہلے کبھی اُن دونوں کی مشترکہ خوابگاہ تھی لیکن اب حسن تنہا نچلی منزل میں سوتا تھا۔ وہ بے دم سی بستر پر گر پڑی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ آہستہ آہستہ اُسکے دل کی دھڑکن معمول پر آتی جا رہی تھی وہ اپنے شوہر حسن اور جاسوس شہریار کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اگر شہریار نے اُسے یہ اطلاع دی کہ واقعی حسن اُس سے بیوفائی کر رہا ہے اور کسی دوسری عورت سے ملتا ہے تو میرا ردعمل کیا ہو گا اُسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی صورت میں وہ کیا کرے، اُسکی خواہش تھی کہ وہ چوہے جیسا جاسوس اس معاملے کو آج ہی ختم کر دے، اوّل تو اُسے اس گھٹیا اور بازاری کام میں ملوث ہی نہیں ہونا چاہئے اور اب جب وہ یہ قدم اُٹھا چکی ہے تو اُسے جلد از جلد ختم ہو جانا چاہئے۔ وہ انہی خیالوں میں ڈوبی نہ جانے کب سو گئی۔ اُس کی آنکھ ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز سُن کر کھلی اُس نے ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف وہی جاسوس تھا جسے اُس نے تین چار گھنٹے قبل اس کام پر مامور کیا تھا۔

"میں شہریار مشہدی بول رہا ہوں!"

"میں سُن رہی ہوں آقائے شہریار!" فرح نے جواب دیا۔

شہریار کی آواز سُنتے ہی اُس کا دل بہت زور سے اچھلا۔

"آپکے شوہر ابھی گھر پر نہیں پہنچے ہونگے، کیا میں آپ سے ٹیلیفون پر بے تکلفی سے گفتگو کر سکتا ہوں خانم فرح!"

"جی ہاں۔ حسن ابھی گھر نہیں آیا۔ آپ بے دھڑک گفتگو کر سکتے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں آدھے گھنٹے قبل آپکے شوہر کو لائبریری میں چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"سچ مچ کیا لائبریری کے اندر؟" فرح کا چہرہ دمکنے لگا۔ "وہ واقعی اپنی کہانیوں کے لئے چھان بین کرتا ہے؟"

"ہاں میرا یہی خیال ہے۔" شہریار نے جواب دیا۔ "لیکن وہ گھر سے نکلنے کے بعد براہ راست لائبریری نہیں گئے، نہ انہوں نے لائبریری کے نزدیک کیفے سپلوی میں کھانا کھایا اور مجھے یہ کہتے ہوئے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ انہوں نے کھانا بھی تنہا نہیں کھایا۔"

ریسیور پر فرح کی گرفت خود بخود مضبوط ہو گئی، اُس کا خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ اچانک تاریک ہو گیا۔ وہ خاموش رہی۔

"آقائے حسن گھر سے ٹھیک گیارہ بجکر دس منٹ پر باہر نکلے اُنہوں نے کتب خانے کے ساتھ اپنی کار روکی وہاں ایک نوجوان عورت اُنکی منتظر تھی، اُسے اپنے ساتھ لے کر وہ فردوس ریستوران میں پہنچے اور اس ریستوران میں اُن دونوں نے کھانا کھایا۔ خانم فرح! کیا آپنے وہ ریستوران دیکھا ہے؟"

"ہاں!" فرح نے جواب دیا۔ وہ کئی مرتبہ حسن کے ساتھ اُس ریستوران میں کھانا کھا چکی تھی اُس میں روشنی اتنی مدھم رکھی جاتی تھی کہ ایک مرتبہ حسن کو مینو پڑھنے کیلئے ماچس کی تیلی جلانی پڑی تھی۔

"میں اُنکے پیچھے ریستوران میں داخل ہو گیا خوش قسمتی سے مجھے اُن کے قریب ایک میز پر جگہ مل گئی۔ میں نے اُنکی کچھ گفتگو بھی سُن لی۔" شہریار نے رُک کر گلا صاف کیا۔

"میں اُنکی گفتگو نہیں سننا چاہتی۔" فرح نے سرگوشی میں کہا

"بہت بہتر! بس اتنا کہدینا کافی ہے کہ اُنکے درمیان ہونے والی گفتگو ذرا..... رومانی قسم کی تھی۔ کھانا کھا کر آقائے حسن اس عورت کو گاڑی میں بٹھا کر ایک سنسان مقام پر لے گئے وہاں ایک جگہ اُنہوں نے اپنی گاڑی کھڑی کر دی۔ تقریباً بیس منٹ بعد اُنہوں نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی اور اس عورت کو ایک تجارتی کمپنی کے سامنے اُتار دیا میرا خیال ہے کہ وہ عورت اس کمپنی میں کام کرتی ہے، اس کے بعد وہ سیدھے کتب خانے چلے گئے انہیں لائبریری میں چھوڑ کر میں واپس آیا اور میں نے اس عورت کے متعلق معلومات جمع کیں۔"

"کون ہے وہ عورت آقائے شہریار؟"

"اُس کا نام حمیرا ہے۔ غیر شادی شدہ ہے۔ اور انٹرنیشنل ٹیکسٹائل کیمیکلز کمپنی میں ملازم ہے۔"

"کیا۔ کیا وہ عورت بہت خوبصورت ہے آقائے شہریار؟" فرح نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

شہریار نے جواب دینے سے پہلے گلا صاف کیا۔ "ہاں، وہ واقعی خوبصورت ہے، میرا خیال ہے کہ اسکے بال مصنوعی تھے، اُس نے غالباً وگ پہن رکھی تھی۔"

"بس اتنا کافی ہے آقائے شہریار! آپ مہربانی کر کے اپنا بل اور اپنی تحریری رپورٹ مجھے روانہ کر دیں، میں فوراً چیک کے ذریعہ آپ کا بل ادا کر دونگی۔" فرح نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور نڈھال سی بستر پر گر گئی۔

تو میرا شبہ درست ثابت ہوا۔ فرح نے سوچا۔ اُسے سردی لگنے لگی اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے جسم پر کمبل کھینچ لیا۔ اس کا دل سینے میں اس طرح اچھلنے لگا جیسے وہ پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

ایک گھنٹے بعد اُس نے نیچے دروازہ کھلنے کی آواز سنی، پھر اُسے حسن کے سیٹی بجانے کی آواز سُنائی دی۔

"فرح ۔۔۔ ! فرح ۔۔ !! کوئی ہے ۔۔ ؟" حسن زور سے چلّایا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ فرح نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش لیٹی حسن کے اوپر چڑھنے کی آوازیں سنتی رہی پھر اُسکی خوابگاہ کا دروازہ کھلا۔ حسن نے اندر جھانک کر دیکھا۔ "فرح! تم کہاں ہو جان من؟ ارے تم لیٹی ہوئی ہو۔ میں تمہیں منع کر رہا تھا لیکن تم مانی نہیں تمہاری طبیعت زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے۔"

"کچھ زیادہ نہیں۔" فرح نے کمزور لہجے میں جواب دیا۔

"آؤ جان من! کھانے سے پہلے ایک آدھ گلاس بیئر پی لیں۔ کیا خیال ہے بیئر پی کر تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

"میں کچھ دیر لیٹنا چاہتی ہوں حسن! تم نیچے جا کر بیئر پی لو۔ مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔"

"اگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو کھانے کا فکر نہ کرنا۔ میں تمہارے لئے کچھ انڈے فرائی کر لوں گا۔ اسکے ساتھ چائے اور توس کھا لینا۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ تم بیئر پی کر واپس آجاؤ، مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں!"

"کس قسم کی باتیں؟" حسن نے قدرے تعجب سے اپنی بیوی کو دیکھا۔

"تم آؤ تو۔ پھر بتاؤں گی۔" فرح نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد حسن جب واپس آیا تو اُسکے ہاتھ میں ایک خالی گلاس تھا اور دوسرے ہاتھ میں بیئر کی بوتل تھی۔

"میں بوتل ساتھ ہی لے آیا ہوں تاکہ بار بار نیچے نہ جانا پڑے" حسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اُس نے خالی گلاس میں بیئر انڈیلی۔ پھر بوتل سنگھار میز پر رکھ کر وہ گلاس ہاتھ میں لئے اس کے پاس بستر پر بیٹھ گیا۔

"اب کہو جان من!"

فرح نے سر موڑ کر حسن کے خوبصورت چہرے کو دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ چسکیاں لے رہا تھا۔ اچانک فرح کا دل محبت کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ اُسے حسن پر بے تحاشا پیار آ رہا تھا۔ بیچارہ حسن ۔۔ فرح نے سوچا وہ مجھ جیسی عورت سے شادی کر کے پھنس گیا ہے، وہ خود جوان ہے، خوبصورت ہے، اُس کا خون گرم ہے، وہ ہنگامے پسند کرتا ہے اس کے برعکس میں کیا ہوں سپاٹ سی بیمار رہنے والی گھریلو عورت جس میں کوئی کشش نہیں اور جو عمر رسیدہ بھی ہے۔

"حسن اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم کس قسم کی لڑکی سے دوسری شادی کرنا پسند کرو گے؟" فرح نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ اُسکے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"یہ کیا حماقت ہے، تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو فرح؟" حسن نے حیرت بھری نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھا۔ "کیا تمہاری طبیعت اتنی ہی خراب ہے کہ تمہیں موت نظر آ رہی ہے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" فرح نے کہا۔ "بس مجھے بیٹھے بیٹھے ہی یہ خیال آیا کہ میرے بعد تم کس قسم کی لڑکی سے شادی کرنا پسند کرو گے؟"

حسن نے کوئی جواب دینے سے پہلے گلاس میں تیرتی ہوئی برف کی ڈلیوں کو زور سے ہلایا۔ "اگر ایسا ہوا تو وہ لڑکی تم سے مختلف ہو گی۔" حسن نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے میں تنوع پسند ہوں۔" وہ آہستہ سے ہنسا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ مجھ سے عمر میں کم ہو گی؟"

"ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن تم جانتی ہو کہ مجھے عورتوں کی عمر کے بارے میں زیادہ فکر نہیں ہوتی۔"

"کوئی ایسی لڑکی جو مجھ سے زیادہ خوبصورت ہو؟"

"تم میرے لئے بہت زیادہ خوبصورت ہو جان من!" حسن نے خوشدلی سے کہا۔ "اگر کسی کی بیوی دولت مند ہو تو اُسے خوبصورت چہرے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"حسن!" فرح نے تیز لہجے میں کہا، پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔ "اگر میرے پہلے شوہر کی موت کے بعد مجھے کچھ رقم ملی ہے تو تمہیں اس پر اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہئے حسن! میرے مرنے کے بعد وہ رقم تمہیں مل جائے گی۔ اور تم بھی یہی کہو گے کہ میری پہلی بیوی کی موت کے بعد مجھے یہ رقم ملی ہے۔ اس قدر تلخ ہونے سے فائدہ؟"

حسن نے تیسرا گلاس بھرا اور دوبارہ فرح کے پاس آکر بیٹھ گیا "نہیں فرح! میں جذباتی نہیں ہوں، البتہ مجھے کبھی کبھی خود پر غصہ آتا ہے کہ میں تمہارے ٹکڑوں پر پل رہا ہوں۔"

"کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو حسن! جو اس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔" فرح نے نرم لہجے میں کہا۔ "تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا تمہاری دوسری بیوی بہت زیادہ خوبصورت ہو گی۔ بہت پُرکشش؟ میری طرح گھریلو نہیں، جو اپنا لباس خود سیتی ہے، اپنا کھانا خود پکاتی ہے، شام کا وقت کلب کے بجائے گھر میں گزارتی ہے، تمہاری بیوی تو ایسی ہو گی، جو تمہارے ساتھ شام کو جدید ترین فیشن کا لباس پہن کر مشہور کلبوں میں تمہارے ساتھ رقص کرے۔ جسے تم مشہور ہوٹلوں میں کھانا کھلا سکو!"

حسن نے مشروب کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔ "اور فرح اسکے ساتھ یہ بھی بتا دو کہ مجھے ایسی عورت اور ایسے ہوٹل کہاں ملیں گے، کیا اِس شہر میں ہیں؟" حسن تلخ انداز میں ہنسا۔

"کیوں نہیں۔ مثال کے طور پر فردوس ریستوران ہے جس کے اندر اتنی مدھم روشنی ہوتی ہے کہ مینو پڑھنے کے لئے ماچس کی تیلی جلانی پڑتی ہے"

ہوٹل کا نام سُن کر حسن چند لمحوں کیلئے ساکت ہو گیا۔ پھر اُس نے زبردستی ایک بلند قہقہہ لگایا۔ "اوہ سمجھا۔ واقعی تم ٹھیک کہتی ہو۔ اگر تم اِس پر خوش ہو تو یہی سہی۔ میں کسی ایسی ہی لڑکی سے شادی کر لوں گا۔"

فرح نے محسوس کیا کہ حسن کو خود پر قابو نہیں رہا۔ وہسکی کا اُس پر بُرا اثر ہو رہا ہے، وہ بہکنے لگا ہے، وہ کچھ دیر اور حسن سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی لیکن چونکہ اُسنے حسن کی بیوفائی پر اُسے معاف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس لئے اب اُس نے کھل کر سامنے آنے کا فیصلہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن وہ عورت کس قسم کی ہو گی حسن؟ کیا حمیرا کی طرح؟"

حسن چوتھا گلاس بھرنے کے لئے سنگھار میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ حمیرا کا نام سُن کر اُسکے قدم زمین میں گڑ گئے، اُس نے آہستہ سے مُڑ کر فرح کو غور سے دیکھا۔ "کیا کہا تم نے فرح؟"

"کوئی ایسی عورت، جو بالکل حمیرا کی طرح ہو۔ تم نے اُسے

دیکھا ہوگا۔ وہ انٹرنیشنل ٹیکسٹائل کیمیکلز میں کام کرتی ہے۔"

حسن چند لمحے خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ مُڑا اُس نے خاموشی سے سنگھار میز پر رکھی ہوئی مشروب کی بوتل اُٹھائی اور آدھا گلاس بھر کر ایک ہی سانس میں اُسے پی گیا، چند لمحے وہ سنگھار میز میں لگے ہوئے آئینے میں اپنا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اُس نے خالی گلاس دوبارہ بھرا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس فرح کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ فرح کو اُس پر بڑا رحم آرہا تھا، وہ خود کو بہت ظالم محسوس کر رہی تھی اُسے اپنے طرزِ عمل پر افسوس ہو رہا تھا۔ شاید اُس نے اس راز کو افشا کرنے کیلئے غلط طریقہ استعمال کیا تھا۔

حسن نے آہستہ آہستہ مشروب کی چند چسکیاں لیں۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں تو صرف جاسوسی کہانیاں لکھنے میں مشغول رہا اور تم نے میری باقاعدہ جاسوسی کرا ڈالی۔" حسن کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔

"کیا اسکے لئے تم مجھے قصور وار ٹھہرا سکتے ہو حسن؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ سارا قصور میرا ہی ہے!"

"لیکن میں تمہیں بھی قصور وار نہیں سمجھتی حسن! میں اپنے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ جانِ من! مجھے معلوم ہے میں خوبصورت نہیں ہوں۔ اگر تم حمیرا جیسی عورت کے پیچھے بھٹکنے پر مجبور ہوئے تو میں اس کی وجہ سمجھ سکتی ہوں۔ کبھی کبھی اگر ایسا ہو جائے تو میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی لیکن میں تم سے اب بھی محبت کرتی ہوں حسن!"

"اتنی محبّت کہ تم مجھے معاف کر سکو؟"

"ہاں حسن! ۔ ہاں جانِ من! میں تمہیں معاف کر سکتی ہوں۔ تم حمیرا کو بھول جاؤ۔ اُسے فراموش کر دو۔"

حسن نے گلاس میں بھری ہوئی شراب کو غور سے دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلا دیا۔ "یہ ممکن نہیں فرح! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں؟"

"میں بہت آگے بڑھ گیا ہوں فرح! میں واپس نہیں آسکتا، میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"شادی!!" فرح نے اُسے اس طرح دیکھا جیسے اُس کا ذہنی توازن درست نہ ہو۔ حسن نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا اور بچا ہوا مشروب ایک ہی سانس میں حلق کے نیچے اُنڈیل لیا۔ "تم اُس سے شادی نہیں کر سکتے حسن!" فرح بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گئی "میں تمہیں اُس سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ میں تمہیں طلاق نہیں لینے دونگی۔"

حسن نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا، اُسکے ہونٹوں پر پُراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"طلاق! اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی جانِ من! ۔ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" حسن کو الفاظ کی ادائیگی میں مشکل ہو رہی تھی۔ شراب اُس پر اثر کر رہی تھی۔

"اگر میں طلاق دینے سے انکار کر دوں تو تم اُس سے شادی نہیں کر سکو گے حسن!"

"کیوں نہیں کر سکتا؟" حسن نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "فرض کرو تم مر جاتی ہو۔ پھر؟"

فرح نے ہنسنے کی کوشش کی۔ "لوگ بدہضمی کی وجہ سے نہیں مرتے حسن! تم احمق ہو!"

حسن کچھ دیر تک اُسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ بستر سے کھڑا ہوگیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سنگھار میز کی طرف بڑھا، میز پر گلاس رکھ کر وہ فرح کی طرف مُڑا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو فرح! لیکن جن لوگوں کو بدہضمی کی شکایت ہوتی ہے اُنہیں سانس لینے میں دُشواری نہیں ہوتی، نہ اُن کا دل زور زور سے دھڑکتا ہے، بدہضمی سے اتنی کمزوری بھی نہیں ہوتی ہے کہ کوئی اُٹھ کر کھانا بھی نہ کھا سکے، ساری بات یہ ہے کہ تم پہلے کبھی بیمار نہیں ہوئیں، ورنہ تمہیں معلوم ہوتا کہ بدہضمی کِسے کہتے ہیں۔"

"لیکن ۔ لیکن حسن تم نے ہی تو کہا تھا کہ مجھے صرف بدہضمی ہوگئی ہے اور....."

"ہاں، تاکہ تم مطمئن رہو اور کسی ڈاکٹر کے پاس نہ جاؤ۔"

"حسن ۔ !!" فرح نے دہشت بھری آواز میں کہا۔

"حسن! اگر مجھے بدہضمی نہیں ہے تو اور کیا بیماری ہے؟"

حسن نے جُھک کر دوبارہ گلاس بھرا اور سیدھا کھڑے ہوکر اُس کا ایک گھونٹ لیا۔ "تمہیں بدہضمی نہیں ہے فرح! تمہیں ایک خوفناک بیماری ہوگئی ہے خوفناک نہیں، بلکہ مہلک، ناقابلِ علاج بیماری۔"

"تم... تم مجھ سے اتنی نفرت کرتے ہو حسن! تم نہیں چاہتے تھے کہ میں کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤں۔ اور میں اِسی طرح ......" فرح کا سانس پھول گیا۔

"کوئی بھی ہوشیار ڈاکٹر تمہاری جان بچا سکتا تھا فرح!" حسن نے تیز لہجے میں کہا۔

"مجھے کیا بیماری ہے حسن!" فرح نے کانپتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

"پلاسٹک انیمیا ۔ ! نہیں سمجھیں؟ یہ ایسی مہلک بیماری ہے جو ہڈیوں میں ہوتی ہے، ہڈیوں کا گودا ختم ہو جاتا ہے اور نیا خون بننا بند ہو جاتا ہے اب تمہاری بیماری اس اسٹیج پر ہے کہ تمہیں دُنیا کا کوئی ڈاکٹر زندہ نہیں رکھ سکتا۔"

"تم مجھے زندہ نہیں دیکھنا چاہتے حسن!؟ تم یہی کہنا چاہتے ہو نا؟"

"بے شک!"

"تاکہ تم حمیرا سے شادی کر سکو؟"

حسن کے حواس پر خوف اس قدر مسلّط ہو چکا تھا کہ وہ سچ کے علاوہ کچھ اور بول ہی نہیں سکتا تھا۔

"کسی حد تک۔" حسن نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس سے میرا بنیادی مقصد تمہاری دولت حاصل کرنا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں مصنّف کی حیثیت سے کبھی کامیاب نہیں ہو سکونگا۔ اب سمجھ گئیں جانِ من!"

فرح نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اُس نے آنکھیں کھول کر اپنے شوہر کو دیکھا۔

"مجھے حیرت ہے حسن! تم نے میری دولت حاصل کرنے کیلئے مجھے زہر کیوں نہیں دیا؟ میرا خیال ہے کہ تم ضرور مجھے زہر دیدیتے لیکن خوش قسمتی سے میں خود ہی اس مہلک بیماری کا شکار ہوگئی کیوں حسن؟"

"نہیں۔" حسن نے جواب دیا۔ "میں جاسوسی کہانیاں لکھنے والا ایک ذہین مصنف ہوں کیا تم مجھ سے اس حماقت کی توقع کر سکتی ہو، زہر ایسی چیز ہے جسے چھپانا ناممکن ہے۔ میں فوراً ہی پکڑا جاتا لیکن پلاسٹک اینیمیا ایسی چیز ہے، جسے دیکھ کر پولیس کبھی مجھ پر شبہ نہیں کریگی۔" حسن کسی خیال کے زیرِ اثر زور سے ہنسا۔ "فرح! اگر میں نے کبھی یہ کہانی لکھی تو میں شرط لگانے پر تیار ہوں کوئی بھی ایڈیٹر میری اس کہانی کو رد نہیں کر سکے گا۔ کیسا عمدہ خیال ہے۔"

"تم نے .... تم نے مجھے یہ بیماری لگائی ہے۔" فرح نے حیرت سے کہا۔ "یہ ناممکن ہے۔"

"نہیں میری جان یہ ناممکن نہیں ہے۔ تمہیں یہ بیماری خود نہیں ہوئی۔" حسن نے چند لمحے خالی گلاس کو دیکھا اور پھر اسے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ "حمیرا نے اس سلسلے میں میری بڑی مدد کی ہے۔"

"کس طرح حسن؟ کس طرح؟ اب جب میرا آخری وقت آگیا ہے تو

نہیں ہوتا۔ مجھے بتاؤ میرے منصوبے میں کہاں جھول ہے؟"

یہ راز بھی بتا دینے میں کیا حرج ہے۔" فرح نے سرگوشی میں کہا۔ حمیرا کا نام سنتے ہی اُسکے خون کی گردش تیز ہو گئی تھی، شدید غصّے کی لہریں اُسکے پورے جسم میں دوڑ رہی تھیں۔

حسن آہستہ قدموں سے اُسکے بستر کی طرف بڑھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر فرح کا کمبل گھسیٹ لیا۔

"یہ ہے تمہارا قاتل فرح، یہ لباس جو تم پہنے ہوئے ہو۔" حسن نے اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یاد ہے یہ کپڑا تمہارے لئے میں لایا تھا، تم نے اسے اپنے ہاتھ سے سیا تھا۔ تمہیں یہ کپڑا بازار میں نہیں مل سکتا۔ تم جانتی ہو حمیرا انٹرنیشنل ٹیکسٹائل کیمیکلز کمپنی میں کام کرتی ہے، وہ کپڑے کی صنعت میں استعمال ہونیوالے کیمیاوی اجزا پر ریسرچ کرتی رہتی ہے۔ کیا تمہارے جاسوس نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا؟"

"ہاں — !"

"خیر میں تمہیں بتاؤں گا۔ اس کپڑے کو لیٹر مٹیریل کہتے ہیں اسے بار بار کیمیاوی اجزا میں ڈبویا جاتا ہے، اس کپڑے کو کبھی فیکٹری سے باہر نہیں آنے دیا جاتا کیونکہ یہ ایسے کیمیاوی اجزا سے پُر ہوتا ہے جنہیں کبھی صاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی اس کپڑے کو زیادہ عرصے جسم پر پہنے رہے تو اُسے کئی خوفناک بیماریاں ہو سکتی ہیں، اُن میں سے ایک مہلک بیماری پلاسٹک انیمیا بھی ہوتی ہے۔ حمیرا نے میرے لئے یہ کپڑا اپنی فیکٹری سے چُرایا تھا۔ اب تم سمجھیں، یہ بیماری تمہیں کس طرح ہوئی —؟"

فرح نے آنکھیں بند کر کے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اب ہر ناممکن بات پر یقین کر سکتی تھی — وہ آنکھیں بند کئے ریڑھ کی ہڈی سے اُٹھنے والی خوف و دہشت کی لہروں سے بُری طرح جنگ کر رہی تھی — وہ زندہ رہنا چاہتی تھی، وہ مرنا نہیں چاہتی۔ کیا اس کا وقت قریب آ گیا ہے؟ فرح نے سوچا۔ کیا حسن اسی لئے بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا ہے — کچھ دیر بعد فرح نے آنکھیں کھول کر حسن کو دیکھا، جو اس کی مسہری کے قریب دیوار کا سہارا لئے کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔

"افسوس! حسن تمہاری سب محنت اکارت گئی۔" فرح نے اپنے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے دولت حاصل کرنے کیلئے قتل جیسے بھیانک جرم کے ارتکاب سے گریز نہیں کیا۔ لیکن جس دولت کیلئے تم نے یہ سب کچھ کیا ہے، وہ پھر بھی تمہیں نہیں مل سکے گی۔ تمہارا یہ منصوبہ بھی ناکام رہا۔ بالکل تمہاری کہانیوں کی طرح!"

حسن نے دھیرے سے سر ہلایا۔ "مجھے بے وقوف مت بناؤ فرح! حسن منصوبے بنانے میں ماہر ہے۔ اُس کے منصوبوں میں کوئی جھول نہیں ہوتا۔ مجھے بتاؤ میرے منصوبے میں کہاں جھول ہے؟"

"میں نے اپنی وصیت تبدیل کر دی ہے حسن!" فرح نے غور سے اپنے خوبصورت جوان شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس لئے میری موت کے بعد تم میری دولت حاصل نہیں کر سکو گے۔"

یہ خبر حسن پر بجلی کی طرح گری، وہ بُری طرح چونک گیا اُس نے کئی قدم پیچھے ہٹ کر فرح کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا — "تم تم۔ تم جھوٹ بول رہی ہو — تم جھوٹی ہو۔ مکار ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا —" حسن چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "جب میرے جاسوس نے مجھے تمہاری حرکتوں کی اطلاع دی تو میں نے اپنی وصیّت بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ تمہیں یاد ہے میں آج صبح شہر گئی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ میں شاپنگ کرنے جا رہی ہوں — میں نے جھوٹ بولا تھا میں اپنے وکیل کے پاس گئی تھی۔"

"نہیں۔ تم جھوٹ بول رہی ہو — تم شاپنگ کیلئے گئی تھیں۔"

حسن کا یقین ڈانواڈول ہو رہا تھا۔

"صبح میری طبیعت اتنی خراب تھی حسن کہ میں صرف شاپنگ — کے لئے کبھی گھر سے نہیں نکلتی، وصیت کا معاملہ اتنا ضروری تھا کہ مجھے طبیعت ٹھیک نہ ہونے پر بھی شہر جانا پڑا —" حسن نے آگے بڑھ کر فرح کی کلائی پکڑ لی۔ "جھوٹی مکّار عورت! میں تیرے فریب کا پردہ چاک کر دونگا بول — تو جھوٹ بول رہی ہے نا؟"

"نہیں حسن!" فرح نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو تم اُسکی ایک نقل دیکھ سکتے ہو، اصل کاپی میرے وکیل کے پاس ہے۔" حسن نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ شاید وہ فرح کو اس قدر پُرسکون دیکھ کر اپنا یقین کرنا چاہتا تھا۔

"کہاں ہے وہ نقل؟"

"میرے ہینڈ بیگ میں!"

"ہینڈ بیگ!" حسن نے کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی "تمہارا ہینڈ بیگ کہاں ہے؟"

"نیچے ہال کے اندر پڑی ہوئی میز پر۔" فرح نے جواب دیا۔

حسن لڑکھڑاتا ہوا فرح کی خوابگاہ سے باہر نکل گیا اور سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگا۔ فرح بستر پر سے اُٹھی اُس نے اپنی خوابگاہ کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ اُس نے جاسوسی کہانیوں کے مصنف کو آخری وقت میں مات دیدی تھی۔ وہ کسی طرح حسن کو اپنی خوابگاہ سے باہر نکالنا چاہتی تھی اب وہ خود کو بہت پُرسکون محسوس کر رہی تھی پھر وہ ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھا کر پولیس ہیڈکوارٹر کا نمبر گھمانے لگی۔

ایک اناڑی مجرم کی کہانی،

انجم نوید

آدھی رات کا وقت تھا۔ تمام سڑکیں سنسان نظر آ رہی تھیں۔ چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور اس سناٹے میں اُس کے جوتوں کی ایڑیوں کی آواز بڑی بھدّی اور بے سُری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر سستے کرائے کے مکانات کی طویل قطار کے مٹے مٹے نمبر پڑھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ آخر اُسے جس مکان کی تلاش تھی وہ مل گیا۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اُس نے اس بوڑھے آدمی کی طرف دیکھا جو صرف بنیان پہنے آخری سیڑھی پر کھڑا ہوا تازہ ہوا حاصل کرنے کے لئے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ نیم تاریک ڈیوڑھی میں اُس نے لیٹر بکسوں پر لکھے ہوئے ناموں کا جائزہ لیا اور پھر لکڑی کا زینہ طے کر کے دوسری منزل پر آ گیا۔ کوریڈور میں قدم رکھنے سے پہلے اُس نے متجسّس نظروں سے مختلف کمروں کے بند دروازوں کو دیکھا اور پھر محتاط انداز میں آگے چلنے لگا۔

وہ چھوٹے قد اور چھریرے جسم کا ایک نوجوان تھا۔ سر پر تنکوں کا بنا ہوا ہیٹ رکھا تھا جو اُس کی زرد آنکھوں پر جھکا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اُس نے جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے اور گردن سے پسینہ خشک کیا اور زیرلب بڑبڑاتے ہوئے گرمی کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ دفعتاً ایک کمرے

کا دروازہ کھلا قمیص پاجامہ پہنے ہوئے ایک آدمی نمودار ہوا۔ اُسنے دُودھ کی ایک خالی بوتل اپنے دروازے کے سامنے فرش پر رکھی۔ سرسری نظر سے نوجوان کی طرف دیکھا ایک جماہی لی اور دوبارہ کمرے میں گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ نوجوان چند لمحوں کے لئے بالکل ساکت کھڑا رہ گیا۔ وہ کان لگائے کوئی آہٹ سننے کی کوشش کر رہا تھا

ایک طویل مدّت انتظار کرنے کے بعد آخر کار اُسے ایک اہم کام سپرد کیا گیا تھا۔ ویٹو اسے اپنے باقاعدہ آدمیوں میں شامل کرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے اُسے صرف اتنا کرنا تھا کہ وہ اپنے آپکو ویٹو کے اعتماد کا اہل ثابت کردے۔ اب اُسے معمولی چوریوں یا پولیس کے خوف سے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ آج کی رات کے بعد وہ ایک بہتر اور خوش آئند مستقبل کی راہ پر گامزن ہوجائے گا۔

اُسے صرف یہ امتحان پاس کرنا تھا۔ اس کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینا تھا۔ ہر پستول باز کو ویٹو کے گروہ میں شامل ہونے سے پہلے اس آزمائش سے گزرنا پڑتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح بیس بال ٹیم میں منتخب کئے جانے سے پہلے ہر کھلاڑی کو اپنی صلاحیت کا لوہا منوانا پڑتا ہے۔ ویٹو کی مثال بالکل کسی کوچ یا اُستاد کی طرح تھی اور وہ اپنی ٹیم میں صرف بہترین آدمیوں کی شمولیت پسند کرتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اسکا گروہ اب تک مضبوطی کے ساتھ قائم تھا جبکہ دوسرے بہت سے گروہ پولیس کا دباؤ پڑتے ہی اپنا دھندا سمیٹ کر بھاگ نکلے تھے۔ ویٹو جو کہ سسلی کا باشندہ تھا۔ بہت ہوشیار اور چالاک ذہن کا مالک تھا۔ ابتک کوئی اسے نیچا دکھانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

ویٹو کے گروہ کے تمام آدمی کسی ٹیم کی طرح نظم وضبط کے ساتھ کام کرتے تھے۔ اور اُس کے ہر حکم پر بلا چوں وچرا عمل کرنے کے لئے مستعد رہتے تھے۔ صرف اسی طرح کے منظم گروہ میں شامل ہونے کے بعد کوئی اپنے آپ کو محفوظ خیال کرسکتا تھا مگر یہ بات بھی امر واقعہ تھی کہ ویٹو قیامت تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ ہر شخص کو ایک نہ ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔ خواہ موت کسی وجہ سے ہی کیوں نہ واقع ہو۔ وہ آدمی جس کے دل میں آگے بڑھنے کا حوصلہ اور امنگ ہو اگر چاہے تو ایک دن ویٹو کی جگہ حاصل کرسکتا ہے مگر اس کے لئے بہت کچھ سیکھنا اور تجربہ حاصل کرنا ہوگا۔ یہ جاننا پڑے گا کہ گروہ کے جملہ افراد کیسے اور کس طرح کام کرتے ہیں۔ آج کی رات کا کام انجام دینے کے بعد وہ کم سے کم اُس راہ پر قدم تو رکھ ہی دے گا جو اُسے ایک نہ ایک دن سربراہی کی منزل تک لیجا سکتا ہے۔ وہ ویٹو کے گروہ

کے باقاعدہ ارکان میں شامل ہوجائے گا۔

اُس نے اپنے جیکٹ کو درست کیا تاکہ بغلی ہولسٹر میں لگے ہوئے ریوالور کا اُبھار اوپر سے نظر نہ آسکے۔ ویٹو کہا کرتا تھا کہ اپنا لباس اس طرح تیار کراؤ کہ وہ سینے پر سے کافی ڈھیلا ہو۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ لوگ میرے آدمیوں پر نگاہ ڈالتے ہی اُنھیں تاڑ جایا کریں۔ یہ الفاظ یاد آتے ہی اُس کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ ویٹو نے اُس سے یہ بات کہہ کر گویا یہ مان لیا تھا کہ وہ اُسے اپنے آدمیوں میں شمار کرتا ہے۔ پھر اس بات سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ویٹو کو یقین تھا کہ وہ آج کی رات ضرور کامیاب ہوکر لوٹے گا اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ "دینا ہی پڑے تو بیشک اسے پہلے رقم دے دینا مگر خیال رکھنا کہ وہ تمہارے ہاتھ سے بچ کر نہ نکلنے پائے۔"

اُس نے جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر اعشاریہ ۴۵ بور کے ریوالور کو ہولسٹر میں کچھ ڈھیلا کیا اور اُس کا سیفٹی بٹن بھی کھول دیا۔ پھر کوریڈور کے آخر میں واقع کمرے کی طرف بڑھا۔ ماچس جلا کر اُس کا نمبر دیکھا اور پھر ہاتھ اُٹھا کر لگاتار تین بار اور پھر کچھ رُک کر مزید دو بار دستک دی اُس کے کانوں میں دروازے کی دوسری جانب فرش کے تختے چرچرانے کی آواز آئی اور پھر کسی نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں پریٹی" اُس نے سرگوشی میں جواب دیا "مجھے ویٹو نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

ایک طویل سکوت کے بعد دروازے کی کنڈی گرنے کی آواز سُنائی دی پھر قفل کھولا گیا اور پھر دروازہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوا اسے دروازے کی دوسری جانب کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ کمرہ اندر سے بالکل تاریک تھا۔

"اندر آجاؤ۔" اسی آواز نے کہا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ اُس کی آنکھیں چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کررہی تھیں اور جسم کا ہر عضو اپنی جگہ چوکنا اور ہوشیار تھا۔ اچانک چھت پر لگا ہوا ایک تیز بلب روشن ہوگیا۔ ایک پل کے لئے اُس کی آنکھیں جھپک گئیں۔ اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنتے ہی وہ تیزی سے گھوما اُس کا ہاتھ بغلی ہولسٹر میں لگے ہوئے ریوالور کی طرف بڑھا مگر پھر درمیان میں ہی رک گیا کیونکہ اُسکی نظروں نے ایک دوسرے ریوالور کی نال کو اپنی جانب اُٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا، اُس نے ریوالور اور اُس پر لگے ہوئے سائیلنسر کو پہچان لیا۔ آجکل عام طور پر پستول باز اسی قسم کے ریوالور استعمال کررہے تھے۔

وہ آدمی کم سے کم چھ فٹ تین انچ لمبا ضرور تھا۔ اسی مناسبت سے اس کا جسم پھیلا ہوا بھی تھا۔ سیاہ اور سخت گیر آنکھیں۔ سیاہ بال جو اُس کی چوڑی پیشانی کو چھوتے ہوئے بھوؤں تک آرہے تھے۔ "تو تمہارا نام پریٹی ہے۔" وہ بولا۔

"ہاں۔ اور تم موروِن ہو۔ ٹھیک ہے؟"

مگر وہ جواب دینے کے بجائے اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اُس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی "ہاں میں موروِن ہوں" اُس نے کہا۔ اُس کی سیاہ آنکھیں بدستور گھور رہی تھیں۔ "پریٹی۔ بڑا مناسب نام ہے۔ یہ نام تمہیں کس نے دیا ہے برخوردار؟"

پریٹی کے جبڑے کے عضلات تن گئے وہ اپنی پوری کوشش سے غصہ پر قابو پانے کی جدوجہد کررہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسوقت ریوالور نکالنے کی کوشش خودکشی کے مترادف ہوگی۔

"ویٹو نے" اُس نے جواب دیا "ویٹو مجھے اسی نام سے پکارتا ہے۔"

"خوب۔ اس کے پاس دماغ ہو یا نہ ہو مگر مزاح کی حس ضرور ہے۔" موروِن برابر ہنسے جا رہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کی نال کچھ نیچے جھک گئی تھی۔

"کیا تم رقم لائے ہو؟" اُس نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا

پریٹی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُسے اپنے چہرے پر سُرخی پھیلتی محسوس ہورہی تھی۔ موروِن کی طنزیہ ہنسی اُسے بالکل پسند نہیں تھی وہ اپنی صورت کے بارے میں بہت حساس تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ رخصت ہونے سے قبل وہ اس کمبخت کے چہرے پر ایک گولی ضرور مار دے گا۔ ویٹو نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ موروِن کو ختم کرنا کیوں ضروری ہے۔ یہ اس کے لئے محض ایک کام کی حیثیت رکھتا تھا مگر اب اس فرض میں ذاتی وجوہات بھی شامل ہوگئی تھیں۔ موروِن نے اس کی توہین کی تھی اور وہ اسے اس گستاخی کی سزا دینا چاہتا تھا۔

"لاؤ رقم نکالو" موروِن نے کہا

ضرور۔ بڑی خوشی سے۔ اُس نے دل میں کہا۔ پریٹی نے جیکٹ کی اندرونی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سائیلنسر لگے ہوئے ریوالور کی نال اپنی طرف اُٹھتے اور ٹرائیگر پر موروِن کی انگلی کا دباؤ بڑھتے دیکھ کر فوراً رک گیا۔ اُس کی نظریں موروِن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اُس نے حتی الامکان اپنے لہجے کو ہموار رکھتے ہوئے کہا،

"تم اتنا بھڑک کیوں رہے ہو کیا تمہیں اپنی رقم نہیں چاہیئے۔"

وہ دم سادھے ہوئے موروِن کو گھور رہا تھا۔ یہ شیطان کی اولاد بہت ہوشیار ہے۔ اُس نے سوچا۔ مگر ہوسکتا ہے کہ اپنا رقم وصول کرنے کے بعد کچھ پُرسکون ہوجائے پھر شاید وہ اس طرح ایک ایک حرکت پر نہ بھڑکے اور میں اپنا کھیل ختم کرنے میں کامیاب ہوجاؤں۔

"اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔" پریٹی نے پھر کہا۔

موروِن ریوالور کی نال اس کے سر کی طرف اٹھاتے ہوئے آگے بڑھا۔

"رقم آہستہ آہستہ اطمینان سے نکالو برخوردار۔" وہ بولا "اتنی جلدی مت کرو کہ تمہارا سوٹ پھٹ جائے۔"

بہت احتیاط کے ساتھ جیب کے اندر ہاتھ ڈالتے ہوئے پریٹی نے لفافہ نکالا اور موروِن کو دیدیا جسے اُس نے اپنے خالی ہاتھ سے وصول کیا اور پھر پریٹی کو دوسری طرف گھومنے کی ہدایت کی تاکہ وہ لفافہ کھول کر رقم کا جائزہ لے سکے۔

"پورے پندرہ سو ہی معلوم ہوتے ہیں۔" موروِن نے مطمئن لہجہ میں کہا "اب تم میری طرف گھوم سکتے ہو۔"

پریٹی نے دوبارہ موروِن کی جانب منہ کرلیا۔ اسے حیرت تھی کہ وہ اتنی بڑی رقم لے کر آیا تھا پندرہ سو ڈالر صرف ایک آدمی کو قتل کرنے کے لئے۔ اسے اُمید نہیں تھی کہ کسی اور نے بھی ایسے کام کا اتنا معاوضہ وصول کیا ہو۔ پندرہ سو ڈالر افوہ۔ وہ تو بغیر کسی اُجرت کے لالچ کے موروِن کو قتل کرنے آیا تھا۔ صرف اس لئے کہ ویٹو نے اسے اس کا حکم دیا تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ ایک قابل اعتماد نشانہ باز ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں اس قسم کے کاموں سے کتنی دولت حاصل ہوتی ہوگی۔ شاید بہت زیادہ۔ خاص طور سے موروِن جیسے خطرناک آدمی کو قتل کرنے کے لئے۔

"مجھے اپنے سخت طرزِ عمل پر افسوس ہے" موروِن نے کہا۔ "مگر ظاہر ہے کہ مجھے ان لوگوں سے محتاط رہنا ہی پڑتا ہے جو ویٹو کیطرف سے آتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں" پریٹی نے جواب دیا۔ اسے توقع تھی کہ اب موروِن ریوالور الگ رکھ دے گا۔

"تم نے بُرا تو نہیں مانا۔"

"نہیں۔"

موروِن نے لفافہ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے ریوالور والا ہاتھ نیچے کرلیا۔ "کچھ پینے پلانے کے بارے میں کیا خیال ہے پریٹی۔" اُس

نے پوچھا۔

"جیسی تمہاری خوشی" پریٹی نے مورن کے قدم بہ قدم کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی میز کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

اُس نے نظر اُٹھا کر مورون کو دیکھا۔ وہ اپنے تصور میں اس لمبے چوڑے آدمی کو اپنے قدموں کے قریب فرش پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کن انکھیوں سے پریٹی کی طرف دیکھتے ہوئے مورن نے دو گلاسوں میں شراب انڈیلی۔ دوسرے ہاتھ میں وہ ابھی تک ریوالور پکڑے ہوئے تھا۔

"لو پیو برخوردار" اُس نے کہا

پریٹی نے گلاس اُٹھا لیا۔ اور بادل نخواستہ ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے حلق سے معدے تک آگ کی ایک لکیر سی کھنچتی چلی گئی اور اُس نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا تاکہ مورون ان آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے جو تیز وہسکی نے اُس کی آنکھوں میں بھر دیئے تھے۔ مورون نے اُس کا گلاس دوبارہ بھر دیا۔

"تم نے بڑی ہمت سے کام لیا ہے برخوردار" وہ بولا "یہاں آنے کے لئے ایک شخص کو فولادی اعصاب کا مالک ہونا چاہیئے، میں مضبوط دل گردے کے جوانوں کو پسند کرتا ہوں"

"میرے خیال میں میرے یہاں آنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا" پریٹی نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا "ظاہر ہے کہ میں صرف تمہاری رقم دینے کے ارادے سے ہی آیا ہوں"

مورن نے اُسے بڑی سنجیدہ نظروں سے دیکھا اور ایش ٹرے میں سلگتا ہوا سگریٹ اُٹھا لیا۔ "ہاں۔ میں جانتا ہوں" اُس نے جواب دیا "اور میرا خیال ہے کہ وبٹو نے اپنے گروہ کے دوسرے آدمیوں کی طرح تمہیں بھی اپنی بڑی بڑی باتوں سے مرعوب کر لیا ہے۔"

پریٹی نے مشکوک انداز میں مورن کی طرف دیکھا۔ مورن نے اپنا گلاس نیچے رکھتے ہوئے ہونٹوں پر لگی ہوئی وہسکی کو زبان سے صاف کیا۔

"یقیناً اُس نے سوچا ہوگا کہ تم ابھی بہت کم عمر ہو اور بڑی آسانی سے اُس کی باتوں میں آجاؤ گے۔" اُس نے پھر کہا۔

آخر مورن اُسے کس جھانسے میں لانے کی کوشش کر رہا ہے پریٹی سوچ رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُسے اس کے اصل ارادے کا علم ہو گیا ہو۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ مورن جیسے گھاگ سے یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ شک ہو جانے کے بعد کسی شخص کو اتنی دیر تک زندہ رہنے کا موقع دے گا۔

"مجھے مرعوب کر لیا ہے۔ کس بارے میں؟" اُس نے پوچھا۔

"تم جانتے ہی ہو۔ مثلاً ایک منظم گروہ کے ساتھ کام کرنے کی خوبیاں وفاداری۔ خلوص۔ ایمانداری یا پھر یہ بات کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو کسی مصیبت میں نہیں پھنسنے دیتا۔ تمہیں بھی پولیس کے ہاتھوں پکڑے جانے سے بچائے رکھے گا"

"یہ بات تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ وبٹو ایک مضبوط اور منظم گروہ کا سربراہ ہے"

"اور یہ ہر شخص کون ہے۔ تم اور وبٹو؟ کیا تم نے کسی اور سے بھی بات کر کے دیکھی ہے"

"کوئی وبٹو کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرتا۔ یہ اُس کی اپنی سلامتی کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے"

"مگر میں بھی تو اُس کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں۔ اور برخوردار میں تمہیں صحیح بات بتا رہا ہوں۔ میری تمام زندگی اِن ہی چکروں میں گزری ہے۔ بڑے بڑے تجربے حاصل کئے ہیں۔ وبٹو کے بارے میں بھی ایسی کوئی بات نہیں جو میں نہ جانتا ہوں۔ اچھی طرح سمجھ لو وہ ایسے وعدے کرتا ہے جو کبھی پورے نہیں ہوتے"

پریٹی نے اس موٹی رقم کا تصور کیا جو اُس نے ابھی مورن کے حوالے کی تھی۔

"مگر اُس نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ تو پورا کیا۔ کیا تم نے ابھی تک رقم وصول نہیں کی"

"ٹھیک کہتے ہو وہ چار سو میں اچھی طرح سمجھتا ہے کہ میری رقم مار کر وہ سخت گھاٹے میں رہے گا"

ایسا لگتا تھا جیسے مورن کو وبٹو کا اتنا سا بھی ڈر نہ ہو۔ پریٹی سوچ رہا تھا۔ ورنہ وہ اس طرح بے دھڑک اس کے خلاف باتیں نہ کرتا اور شاید یہی وجہ تھی کہ وبٹو کسی کو یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ مورن کو کیوں قتل کرانا چاہتا ہے۔ ممکن ہے خود وبٹو کسی وجہ سے مورون سے خوف کھاتا ہو۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ مورن یہ سب باتیں بلاوجہ نہیں کر رہا تھا اُس کا کوئی مقصد تھا۔ پریٹی وہ مقصد جاننے کے لئے بےچین تھا۔ یوں بھی مورن ابھی تک ریوالور سنبھالے ہوئے تھا۔ ایسی صورت میں اس پر حملہ کرنے کی کوشش کرنا حماقت ہی تھی چنانچہ پریٹی کے لئے ان باتوں میں حصہ لینے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

"تم مجھے یہ سب باتیں کیوں بتا رہے ہو موڑن"۔ اُس نے پوچھا
موڑن نے اپنے گلاس میں تیسری مرتبہ وہسکی انڈیلی اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ ریوالور اُس نے اپنے سامنے میز پر رکھ لیا تھا۔
"تمہیں میری باتوں سے واقعی دلچسپی پیدا ہو چلی ہے یا صرف اِس لئے سننا چاہتے ہو کہ واپس جا کر وہیٹو کے کان بھر سکو"۔ اُس نے پوچھا۔
"وہیٹو نے مجھے خرید نہیں لیا ہے"۔ پریٹی نے جواب دیا "تم جو کچھ بتاؤ گے میرے سینے میں محفوظ رہے گا"۔
"ہاں اب تم کچھ سمجھداری کی باتیں کر رہے ہو"۔ موروں مسکرایا "میرا خیال ہے کہ مجھے جس شخص کی تلاش تھی وہ تم ہی ہو"۔
"تمہیں کسی آدمی کی تلاش کیوں تھی؟"
موڑن نے گلاس کی باقی شراب بھی حلق سے نیچے اتاری اور ہاتھ کی پشت سے ہونٹ پونچھتے ہوئے پریٹی کی طرف دیکھا "وہیٹو کو قتل کرنے کے لئے"۔ اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔
یہ چند الفاظ کسی تیز چاقو کی طرح پریٹی کے کانوں میں اُترتے چلے گئے۔ سردی کی ایک لہر سی اُسے اپنے جسم میں رینگتی محسوس ہوئی۔ اُس نے کبھی وہیٹو کے بارے میں ایسی بات کا تصوّر تک نہیں کیا تھا۔ وہیٹو۔ ایک لاش۔ دفعتًا اسے محسوس ہوا کہ وہیٹو بھی دوسرے آدمیوں کی طرح گوشت پوست سے بنا ہوا ایک انسان ہی ہے۔ اُس نے اپنے جسم میں پھیلتی ہوئی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔
"کیا تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح اُس سے ڈرتے ہو"۔ موروں نے سوال کیا۔ پریٹی نے کوئی جواب نہیں دیا۔
موڑن نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر لفافہ نکال لیا اور پھر اُس میں سے گن کر پانچسو ڈالر کے نوٹ الگ کئے "کیا مجھے اپنی مرضی کا آدمی مل گیا ہے"۔ اُس نے نوٹ پریٹی کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا
پریٹی نے نوٹوں کو دیکھا مگر خاموش بیٹھا رہا۔
"دیکھ کیا رہے ہو انہیں اُٹھا لو"۔ موڑن نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔
"نہیں۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا"۔ پریٹی نے کہا "آخر تم وہیٹو کو ختم کرنے کے لئے اتنے بیتاب کیوں ہو"۔
موڑن نے قمیص کی جیب سے ایک سگرٹ برآمد کیا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے لوٹے سے اسے سلگا لیا۔
"کوئی وجہ نہیں کہ میں تمہیں اپنے راز میں کیوں نہ شریک کر لوں"۔ وہ بولا "صاف بات یہ ہے کہ میں وہیٹو کی جگہ گروہ کا سربراہ بننا چاہتا ہوں۔ میں نے اُس کے دوسرے آدمیوں کو بھی آمادہ کر لیا ہے اب صرف وہیٹو کو ختم کرنا باقی ہے"۔
"تم یہ کام خود کیوں نہیں کرتے"۔
"میں اس سے ڈرتا نہیں ہوں مگر آج تک وہیٹو نے مجھ سے براہِ راست ملاقات نہیں کی ہمیشہ اپنے کسی نہ کسی آدمی کو ہی بھیجتا رہا اب اگر میں اُس سے اچانک ملنے پہنچ جاؤں گا تو فطری بات ہے کہ وہ مشکوک ہو جائے گا لیکن تمہارے لئے یہ بات آسان ہے"۔
پریٹی کو یاد آ گیا کہ اُسے آج رات وہیٹو سے ملنا ہے۔ نہ صرف کام کو کامیابی کے ساتھ انجام تک پہونچانے کی اطلاع دینے بلکہ وہ رقم واپس کرنے کے لئے بھی۔ واقعی اس کے لئے بہت آسان ہے۔ اس نے سوچا۔
"لیکن تم نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا"۔ اُس نے پوچھا "جیسا کہ تم نے کہا اگر تم اس کے باقی ساتھیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا چکے ہو تو یہ کام کوئی اور بھی اسی آسانی سے کر سکتا ہے"۔
موڑن نے کندھے اچکاتے ہوئے پریٹی کے سامنے رکھے ہوئے نوٹوں میں پانچسو ڈالر کے نوٹوں کا اضافہ اور کر دیا۔
"اس کے کسی اور آدمی میں یہ کام کرنے کی ہمت ہے اور نہ حوصلہ"۔ اُس نے جواب دیا۔
"اگر وہیٹو مر جائے تو مجھے کیا فائدہ ہوگا"۔ پریٹی اپنی تعریف سُن کر خوش ہو گیا تھا۔
"تم میرا داہنا ہاتھ ہو گے پریٹی۔ باس نمبر ۲"۔
کم سے کم موروں نے اُس سے جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کی پریٹی نے سوچا۔ اُس نے یہ نہیں کہا کہ وہیٹو کے قتل ہونے کے بعد وہ اسے اپنا پارٹنر بنا لے گا۔ یوں پریٹی خود بھی محسوس کرتا تھا کہ وہ ابھی اتنا تجربہ کار نہیں کہ اپنی ذمّہ داری پر گروہ کو چلانے کی کوشش کرے۔ یہ ہی بات مناسب تھی کہ گروہ کا انچارج موڑن رہے اور وہ اس کا دستِ راست بن کر کام کرے
"ہو سکتا ہے کہ وہیٹو کو راستے سے ہٹانے کے بعد تم اپنا وعدہ بھول جاؤ"۔ اس نے کہا "مجھے کیسے یقین ہو کہ تم مجھے اپنی باتوں سے پھسلانے کی کوشش نہیں کر رہے ہو"۔
"میں تمہیں جو کچھ بتا چکا ہوں اُس کے بعد ہمارا ایک دوسرے پر اعتماد کرنا لازمی ہے"۔ موروں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
یہ بات بھی درست ہے۔ پریٹی نے سوچا۔ موروں اچھی طرح

جانتا ہے کہ اگر اُس نے مجھے فریب دینے کی کوشش کی تو یہ اس کے لئے بھی خطرناک ہوگا جس شخص میں اتنی ہمت ہو کہ وہ وہیٹو کو ٹھکانے لگا سکے وہ موروں پر گولی چلاتے ہوئے دوبارہ نہیں سوچے گا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھے ہوئے نوٹوں کو انگلیوں سے چھوا اور پھر آہستہ سے اُٹھا لیا اپنے ہاتھ میں اتنی رقم دیکھ کر اس کی رگوں میں سنسنی سی دوڑ گئی۔
"بولو کیا کہتے ہو برخوردار" موڑن نے اشتیاق سے پوچھا "میرا ساتھ دو گے"۔
"کام بہت خطرناک ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دوں"۔
"جتنا بڑا خطرہ ہے اتنی بڑی رقم بھی تو ہے"۔
"پھر بھی یہ کافی نہیں ہے مجھے کم سے کم پندرہ سو ڈالر طلب کرنے کا حق پہونچتا ہے"۔
"بہت ہوشیار ہو"۔ موڑن کی مسکراہٹ اور بڑھ گئی۔
"ہاں۔ میں نے کہہ دیا کہ یا تو پورے پندرہ سو ڈالر ادا کرو یا پھر میں یہ کام نہیں کر سکوں گا"۔
"اچھی بات ہے، پندرہ سو ہی سہی"۔
موڑن نے لفافہ پریٹی کے سامنے پھینک دیا۔
"مگر برخوردار کام مکمل ہونا چاہیئے"۔
پریٹی نے لفافہ اُٹھا لیا۔ وہ معاملات کی دلچسپ تبدیلی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کہاں تو اسے یہ توقع تھی کہ آج کی رات کے بعد وہ وہیٹو کے گروہ میں شامل کر لیا جائے گا اور پھر وہاں رفتہ رفتہ آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا اور کہاں دم بھر میں سب کچھ تبدیل ہو گیا۔ اب اسے چیونٹی کی چال سے ترقی کی منزلیں طے کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایک ہی جست میں موڑن کا دستِ راست بن جائے گا اور پھر کافی تجربہ حاصل کرنے کے بعد جب وہ اپنے اندر یہ صلاحیت محسوس کرے گا کہ اب وہ کسی کی مدد کے بغیر گروہ کو سنبھال سکتا ہے تو پھر موڑن کو اسی طرح ریٹائر ہونا پڑے گا جس طرح وہ آج وہیٹو کو اپنے راستے سے ہٹانے کا انتظام کر رہا ہے۔ اس دنیا میں اسی طرح ہوتا ہے۔ صرف حوصلے اور اُمنگ کی ضرورت ہے۔
اُس نے باقی نوٹ لفافے میں ڈال کر لفافہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔
"لو اور پیو"۔ موڑن نے گلاس بڑھایا۔
"نہیں شکریہ۔ بہتر ہوگا کہ اب میں تم سے اجازت چاہوں۔ وہیٹو میرا انتظار کر رہا ہوگا"۔
موڑن نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے پریٹی کا کندھا تھپتھپایا
"ٹھیک کہتے ہو۔ تمہیں اب جانا چاہیئے۔ گڈ لک"۔
"شکریہ۔ میں کام سے فارغ ہو کر تمہارے پاس آؤں گا"
"ضرور آنا"۔ پریٹی دروازے کی طرف چلا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ریوالور لیکر وہیٹو کے سامنے جانا چاہیئے۔ وہیٹو آخر پھر وہیٹو ہے! ایسا نہ ہو کہ وہ ریوالور نکالنے کا موقع بھی نہ دے۔ میں کوئی خطرہ مول لینا پسند نہیں کروں گا۔
"بات تو سنو پریٹی"۔ موڑن نے آواز دی
"بولو"۔ پریٹی گھومتے ہوئے بولا
"وہیٹو کو تمہارے ہاتھ سے گولی کھاتے ہوئے تعجب تو بہت ہوگا"۔ موروں نے کہا
"واقعی بہت تعجب ہوگا"۔ پریٹی نے قہقہہ لگایا۔ مگر دفعتًا اس کا قہقہہ جیسے گلے میں پھنس کر رہ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ سائیلنسر لگا ہوا ریوالور اُس کے سینے کی جانب اُٹھ گیا ہے
"وہیٹو کا خیال تھا کہ تم اس آزمائش میں ضرور کامیاب ہو گے"۔ موڑن کہہ رہا تھا "مگر اب اسے بیحد مایوسی ہوگی"۔
"آزمائش"۔ پریٹی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے موروں کی طرف دیکھا "مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ....."
"جہنم رسید ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ"۔ موروں دانت پیستے ہوئے بولا۔
پریٹی نے بڑی پھُرتی سے جیکٹ میں ہاتھ ڈال کر بغلی ہولسٹر سے اعشاریہ ۴۵ بور کا ریوالور نکال لیا۔ اور پھر تیزی سے گھومتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ اُس نے پھر لبلبی دبائی۔ اور پھر بڑھتے ہوئے خوف کے ساتھ دباتا ہی چلا گیا۔ دو بار تین بار چار بار لیکن ریوالور سے ایک فائر بھی نہیں ہوا۔ اور یہ وہ ریوالور تھا جو اسے وہیٹو نے دیا تھا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے موڑن کی طرف دیکھا۔
"نہیں" وہ گڑگڑایا "نہیں۔ خدا کے لئے مجھے....."
موڑن کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے ٹرائگر دبا دیا۔

ناگ بھوت

قسط ۱۵

سلطان محمد خان کی پراسرار آپ بیتی

سابقہ قسطوں کے خلاصے کے ساتھ
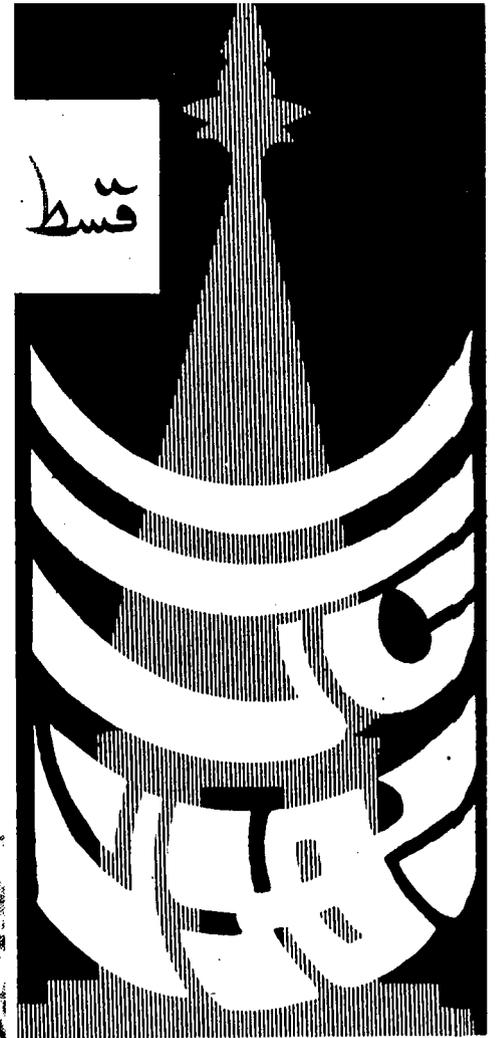
ناگ بھوت محض میری اس لرزہ خیز داستان کا عنوان ہی نہیں ہماری دنیا کی پُرہول حقیقتوں کا ایک ایسا ثبوت ہے جو میں آخری سانس تک نہ بھول سکوں گا۔ یہ کہانی "تاریکیوں اور دُھندلائی ہوئی روشنیوں میں ڈوبی ان خوف آور زمینوں کے گرد گھومتی ہے' جہاں ہر لمحہ اجل کے بے رحم ہاتھ مجھے اپنے چنگل میں دبوچ لینے کے لئے بے تاب رہے اور میں جنّت سے دھتکاری ہوئی حقیر' شیطانی مخلوق کے اشاروں کا غلام ہو کر رہ گیا۔ وہ مخلوق پُراسرار اور نادیدہ قوتوں پر حاوی تھی۔ اُن کی آگ اُگلتی اور شعلے برساتی گول گول آنکھیں جسم سے حرکت اور ذہن سے فکر سلب کر لیتی تھیں۔ غم و اندوہ' رُوحانی کرب' جسمانی عذاب' ذہنی بے چارگی' وقتی آسودگیوں' ہولناک حقیقتوں اور زندگی کی حرارت آگیں لذّتوں کے عبرتناک امتزاج میں ڈوبی میری یہ چند برسوں پر محیط کہانی اب مجھے صدیوں طویل ایک ڈراؤنا خواب معلوم ہوتی ہے۔ محض ایک خواب جسے نیکی اور بدی' مسرّت اور اذیت پر قادر قوتوں نے مل کر ترتیب دیا اور پھر اُس میں حقیقت کے رنگ بھرنے کے لئے قسمت کے بے رحم ہاتھوں نے مجھے مرکزی کردار کی صُورت میں اس میں دھکیل دیا۔

میں کٹنی کے ایک بڑھئی گھرانے کا چشم و چراغ تھا مفلسی کے باعث کمسنی ہی میں میرے والد نے مجھے کام پر لگا دیا لیکن سات برس کی عمر میں ایک لاولد گورے نے معقول رقم کے عوض مجھے میرے والدین سے گود لے لیا اور میری تعلیم و تربیت پر پُوری توجہ صرف کرنے لگا۔

یونیورسٹی کی آزاد فضاؤں میں ایک سُبک اندام اور خوبرو مشرقی دوشیزہ' ستارہ سے میری محبت پروان چڑھی تعلیم کے خاتمے پر ہم دونوں ازدواجی بندھن میں بندھ گئے اور شملہ کے ایک پُرسکون گوشے میں آ بسے جہاں میں حشرات الارض پر اپنے تجربات جاری رکھنا چاہتا تھا میرا منہ بولا باپ اپنے وطن لوٹتے ہوئے میرے لئے اتنی خطیر رقم چھوڑ گیا تھا جو مجھے ساری عمر کے لئے کافی تھی۔

سانپوں پر تجربات کے دوران میں ایک موذی اور کینہ پرور سیاہ ناگ نے ستارہ کو ڈس لیا۔ یہ المناک حادثہ میرے ذہن اور اعصاب پر بجلی بن کر گرا اور میں نے عہد کر لیا کہ سانپوں اور ناگوں کی پُوری نسل سے اپنی ستارہ کی موت کا ہولناک انتقام لوں گا۔ پھر میں نے ستارہ کو اپنے بنگلے کے لان ہی میں دفن کر دیا۔

جب میں نے اپنے عہد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انتقام کا پہلا وحشیانہ جشن منعقد کیا تو کہیں سے ایک پُرجلال، سفید ناگن نمودار ہوئی اور اپنے ہم نسلوں کو میرے پنجۂ انتقام سے صاف بچالے گئی۔ میں دل کا بوجھ ہلکا کرنے ستارہ کی قبر پر پہنچا تو قبر کھدی پڑی تھی اور ستارہ کی لاش کا کہیں پتہ نہیں تھا!

میری خلش اور نیم دیوانگی کے ان دنوں میں ستارہ کی ایک ہمشکل، اندراوتی میری خلوتوں میں در آئی۔ میں اپنا غم بھلانے کے لئے اُس کے حسین نسوانی پیکر سے زندگی کی رعنائیاں سمیٹنے لگا۔

ایک دن حیدر شاہ نامی ایک درویش صفت بزرگ نے اپنی روحانی قوت سے اندراوتی کی اصلیت کا بھرم کھول دیا۔ وہ دراصل وہی پُراسرار، سفید ناگن تھی جس نے میرے انتقام سے اپنے ہم نسلوں کو بچایا تھا۔ وہ ناگوں کی پُراسرار سرزمین کی عیاش فطرت ناگ رانی تھی اور انسانی روپ بدل لینے پر پوری طرح قادر تھی۔ وہ مجھ کو پسند کرچکی تھی اور محض رقابت کی خاطر ستارہ کو قبر سے نکال لے گئی تھی جو درحقیقت مری نہیں تھی بلکہ زہر کے اثر سے طویل سکتے کا شکار ہوگئی تھی۔ حیدر شاہ نے ناگ رانی سے چھینا ہوا منکا میرے حوالے کردیا اور ستارہ کی بازیابی کے لئے طویل ہدایات دیکر اپنی کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ ستارہ کی زندگی کی نوید پاکر مجھ میں نیا عزم پیدا ہوگیا اور میں نے ہر قیمت پر اُسے ناگ بھون کی ہولناک سرزمین سے نکالنے کا عہد کرلیا۔

اِس کے بعد ناگ رانی نے کئی بار مختلف عورتوں کے روپ میں میرے قریب آنا چاہا لیکن میں ان دنوں ستارہ کے فراق میں کرب و اذیت کے جہنم میں سُلگ رہا تھا میں اُس کے حسین جال میں نہ آسکا جن دنوں مجھ پر مایوسی کا حملہ ہوا، وہ ایک الھڑ بنجارن، چمپا کے روپ میں میری خوابگاہ تک آپہنچی۔ میں اُس کی اصلیت سے بے خبر کافی عرصے تک اُس کی دلربایانہ اداؤں کا شکار رہا، اِسی دوران میں چمپا کی آبرو پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں میرا ایک لاوارث ملازم ہری چند میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ایک روز ڈرامائی طور پر میں نے چمپا کو ناگ رانی کے اصلی روپ میں دیکھ لیا۔ میں نے اُس پر اس امر کا انکشاف نہیں کیا لیکن وہ اپنا چھنا ہوا منکا واپس لینے کے لئے اس قدر مضطرب تھی کہ میرے مقابلے پر آگئی۔ میں نے اپنی تمام صلاحیتوں اور درویش صفت حیدر شاہ کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کرکے ناگ رانی کو ہمیشہ کے لئے تسخیر کرلیا۔ اب وہ میری مرضی کی غلام ہوچکی تھی۔

پھر مجھ پر ہری چند کے قتل کے الزام میں شبہ کیا گیا۔ پولیس کی جماعت تفتیش کے لئے آئی اور میرے اشارے پر ناگ رانی نے انھیں اس قدر ہراساں کیا کہ وہ بھاگ نکلے۔ اسی تفتیش کی پشت پر ناگ رانی کی چھوٹی بہن سامنے آئی جو کوشیلا دیوی کا انسانی روپ دھارے شملہ کے اعلیٰ حلقوں میں معزز درجے پر فائز تھی۔ میری خاطر ان دونوں بہنوں میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی اور ناگ رانی اپنی بہن کو زندہ نگل گئی۔

ناگ رانی نے اب کوشیلا کا روپ دھار لیا اور میں شب و روز اُس کے ہمراہ دادِ عیش دیتا رہا۔ ایک روز میں نے دوٹوک الفاظ میں اس سے ناگ بھون سے ستارہ کو چھڑا لانے کی خواہش کا ذکر کیا۔ یہ سُن کر وہ کانپ اٹھی ستارہ کو ناگ بھون پہنچانے کے بعد وہ اس معاملے میں بے بس ہوکر رہ گئی تھی۔ ستارہ اب ناگ راجہ کی قیدی تھی اور وہ اس معصوم دوشیزہ کی عصمت دری کے درپے تھا ناگ رانی نے بتایا کہ ناگ بھون بہت ہی خوفناک اور ڈراؤنی سرزمین ہے جہاں کی ہر شئے پر ایک پُرانے شیش ناگ کی حکمرانی ہے جو ناگ راجہ کہلاتا ہے۔ اس پُرہیبت اور کینہ پرور ہستی سے جیتنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

اسی گفتگو کے دوران ناگ راجہ کا ایک معتمد گرگا شیو ناگ ہم دونوں کو پکڑ کر ناگ بھون لے جانے کے لئے آپہنچا۔ وہ بہت ہی ڈراؤنا انسان تھا۔ اس کے چہرے کی کھال جا بجا پھولی ہوئی تھی۔ مقناطیسی آنکھوں میں موت کی بے رونق زردی چھائی ہوئی تھی جسے دیکھ کر ہڈیوں تک میں سنسناہٹ ہونے لگتی تھی۔ اس کے بالوں کی جگہ بے شمار باریک اور سیاہ ناگ اُگے ہوئے تھے جو پوری طرح زندہ تھے ایک مقابلے میں اُس کی آنکھیں گل کر پانی کی طرح بہہ گئیں اور وہ فرار ہوگیا۔

میں وقتی تحفظ کے پیشِ نظر شملہ سے روانہ ہوگیا۔ ناگ رانی کی ایک سہیلی چترا ہر دم میرے ساتھ تھی۔ شیو ناگ نے چترا کو آلۂ کار بناکر مجھے سون ہاٹ کے مشرق میں۔ ایک بھیانک اور خوف آور مقام کے سفر کی ترغیب دلائی اور میں اس اُجاڑ ویرانے میں ایک بار پھر شیو ناگ کے بے رحم چنگل میں پھنس گیا۔ پھر ناگ رانی میری مدد کو آئی ایک طویل اور سنسنی خیز مقابلے کے بعد شیو ناگ منہ کی کھاکر سون مندر میں جا گھسا جہاں سے ایک راستہ ناگ بھون کو جاتا تھا۔ اس کشمکش میں چترا ماری گئی اور ناگ رانی نے اس کے بعد ایک نئی خوبصورت داسی جے سیکا میرے حوالے کردی۔

شیو ناگ کی شکستوں پر چراغپا ہوکر آخرکار ناگ راجہ خود ہماری سرکوبی کے لئے آپہنچا اور ناگ رانی اس سے پناہ حاصل کرنے کے لئے مجھے اور جے سیکا کو ہمراہ لے کر کالی بھومی نامی سمندری جزیرے سے جل منڈل نامی عجیب و غریب زیرِ سمندر دنیا میں جا چھپی۔ جل منڈل سمندر میں ڈیڑھ ہزار فیدم نیچے ایک عجیب و غریب گپھا میں واقع تھا جل ناگوں کی اس خوف آور سرزمین پر جل کماری کی حکمرانی تھی جو ہمیشہ ایک خوبرو عورت کے روپ میں میرے سامنے آئی۔

جل منڈل میں کبھی مجھ پر جل کماری کی عنایات رہیں اور کبھی میں شدید اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا۔ جب جل کماری نے یہ دیکھا کہ میں کسی طرح ناگ رانی کے مقابلے میں اُس کی جانب مائل نہیں ہوتا تو اُس نے ایک سازش کے ذریعے ناگ رانی کو جل منڈل سے نکل جانے پر مجبور کردیا اور مجھے اگن پوجا کے جشن پر ناگ کی بھینٹ چڑھانے کی قسم کھالی۔ جل منڈل میں یہ لرزہ خیز جشن ہر ہزار برس بعد ہوتا تھا!

تہوار کے موقع پر اگن دیوتا آگ کے بھیانک شعلوں میں رینگتا، اگن ناگ کے پُرشکوہ روپ میں نمودار ہوا اور میرے بدن کو سونگھ کر چلا گیا۔ ناگ رانی نے اروشی دیوی کے ذریعے میری جان بخشی کرادی تھی۔ رسم کے اختتام پر جل کماری نے شکست خوردہ لہجے میں مجھے بتایا کہ اب مجھے ایک برس کے اندر اندر مونگ کی دال سے اگن ناگ کا پُتلا بنا کر اُسے کسی کنواری کے زندہ خون سے غسل دینا پڑے گا ورنہ سوتیوں کے روپ میں میرے بدن میں گھسے ہوئے مذہبی سانپ مجھے تڑپا تڑپا کر ہلاک کردیں گے۔ ادھر جے سیکا نے میری بھینٹ کے صدمے سے دل برداشتہ ہوکر خودکشی کی ناکام کوشش کرڈالی اور یوں اس کا یہ راز افشا ہوگیا۔ وہ ناگن نہیں، بلکہ انسانوں کی نسل میں سے تھی اور ایک سپیرن کی اولاد تھی جسے ناگ رانی نے خوش ہوکر بہت سی پُراسرار قوتیں دے دی تھیں۔

جے سیکا کا راز افشا ہونے کے باعث میں ایک بار پھر جل کماری کے عتاب کا نشانہ بن گیا۔ جے سیکا کو بھی ایسی ایسی سزائیں سہنی پڑیں جن کا تصوّر تک محال تھا۔ اس دوران میں کئی بار میرے پیٹ میں گھسے ہوئے سانپوں نے بھی مجھے شدید اذیت میں مبتلا کیا۔ ایک موقع پر میری بے احتیاطی سے منکا جے سیکا کے پیٹ میں چلا گیا۔ یہ میری بدنصیبی کی ایک نئی ابتدا تھی۔ میں نے بہت مکاری سے کام لیتے ہوئے جل کماری کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ جے سیکا کو کالی بھومی پر ناگ رانی

کے قریب پہنچادے۔ اُس نے ایک منصوبے کے تحت اقرار کرلیا۔ جے سیکا کے چلے جانے کے بعد اُس نے اپنی حسین خوابگاہ میں مجھے شراب پلاکر مدہوش کیا پھر مجھ سے ناگ رانی کا منکا طلب کیا۔ میں نشے اور سفلی جذبات کی رَو میں اندھا ہورہا تھا۔ میں نے اُسے منکے کے چلے جانے کی کہانی سُنادی۔ وہ ناگ رانی پر غالب آنے کا منصوبہ یوں تباہ ہوتے دیکھ کر غصے میں اندھی ہوگئی۔ اُس کے ایک اشارے پر میرے اردگرد ہیبت ناک تاریکی پھیل گئی اور جل ناگوں کے ایک مشتعل انبوہ نے مجھ پر حملہ کردیا میرا نشہ ایک دم ہرن ہوگیا اور موت کی بھیانک تصویر آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔

جل کماری نے نہایت کامیابی کے ساتھ مجھے اپنا راز افشا کرنے پر مجبور کردیا تھا میری ساری مزاحمت بالکل بے سود ثابت ہوئی اور جل کماری نے نہایت اطمینان سے مجھے مغلوب کرلیا کیونکہ منکے کے بغیر میں اپنی ہر قوت سے محروم ہوچکا تھا پھر میرے اوپر ناقابلِ بیان اذیتوں کا دور شروع ہوا جس میں میری بائیں آنکھ جاتی رہی ان کٹھن لمحوں میں، جے سیکا سے اطلاع پاکر ناگ رانی جل منڈل میں آپہنچی، قہر و غضب اور انتقام کا ایک مہیب ٹکراؤ ہوا۔ جل منڈل کی سرزمین پر ناگ رانی اور جل ناگوں کی ایک خوفناک جنگ چھڑ گئی۔ ناگ رانی نے اُن پر خرگوشوں جیسی صورت والے کالے کالے چوپایوں کو چھوڑ دیا تھا۔ اس خونریز حیوانی معرکے کی افراتفری سے فائدہ اُٹھاکر ناگ رانی مجھے ہمراہ لے کر جل منڈل سے نکل گئی۔ سمندری گپھا میں کودنے سے قبل ناگ رانی نے اپنا منکا میرے حوالے کردیا۔ جو اُس نے شاید کسی طرح جے سیکا کے پیٹ سے برآمد کرلیا تھا۔ زیرِ آب سفر کے دوران میں کئی کٹھن مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہم آخرکار کالی بھومی پر جا پہنچے جہاں ناگ رانی جے سیکا کو چھوڑ گئی تھی۔ اپنی آزادی کا جشن میں نے بڑی فراخدلی سے منایا اس پُراسرار جزیرے پر جب میں ناگ رانی کے نسوانی پیکر میں ڈوبا ہوا تھا تو مکروہ صورت شیو ناگ وہاں آپہنچا۔ میں نے جونہی اُس کے مقابلے پر آنا چاہا میرے پیٹ میں گھسے ہوئے ان سانپوں نے حرکت کرنی شروع کردی جو اگن ناگ کی بھینٹ سے نجات کی نشانی تھے۔ میں ایک آنکھ سے محروم، کرب سے زمین پر تڑپ رہا تھا اور مکار شیو ناگ قہقہے مارتا میری طرف بڑھ رہا تھا۔

سخت مقابلے کے بعد شیو ناگ مغلوب ہوگیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اُس کے سر پر اُگے ہوئے سارے سانپ جڑ سے کاٹ دیئے۔ یوں سانپ دوبارہ پیدا ہونے تک اُس کی تمام شکتیاں ختم ہوگئیں۔ اس موقع پر ناگ رانی نے احمقانہ فراخدلی سے کام لیتے ہوئے اُسے ایک کالے کتے کے روپ میں کچھ عرصہ زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا اور وہ کالی بھومی سے سون ہاٹ جاتے ہوئے، موقع پاکر سون مندر میں جا گھسا جہاں ناگ رانی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اس چوٹ کے بعد ناگ رانی نے ایک سادہ لوح دہقانی کو اپنے دام میں پھانس کر اُس کی بائیں آنکھ کی روشنی سے میری پھوٹی ہوئی آنکھ کی بینائی بحال کردی۔ اب میری دونوں آنکھیں اِس دہقانی کی زندگی میں روشن رہتیں لیکن اُس کے مرتے ہی میری بائیں آنکھ دوبارہ ناکارہ ہوجاتی۔ اِس دوران میرے بدن میں گھسے ہوئے سانپوں نے بار بار مجھے جاں کنی کے عالم سے دوچار کیا تھا اس لئے ناگ رانی نے مشورہ دیا کہ سب سے پہلے ناگ دیوتا کو کسی کنواری کے خون کی بھینٹ دے کر اس مستقل روگ سے نجات حاصل کی جائے۔ پھر میں ناگ رانی اور جے سیکا کے ہمراہ ایک ویران اور پُراسرار آنند آشرم میں پہنچا جہاں ایک مدقوق اور برہنہ تن بوڑھا سانپوں کے ہجوم میں گھرا موجود تھا۔ اِس مہا پجاری نے جے سیکا کو اُس کی کھوئی ہوئی شکتیاں واپس دلانے کے لئے برفانی پہاڑوں سے اُبلنے والے ایک گرم چشمے پر شکتی کے اشنان کے لئے بھیجا جس سے وہ کامران لوٹی۔

مہا پجاری شنکر ناتھ غیر معمولی قوتوں کا مالک تھا، اُسکی ہدایت پر پوہاری کی ایک کنواری دوشیزہ کی بھینٹ دینے کی تیاریاں کی گئیں لیکن عین وقت پر حیدر شاہ آڑے آگئے شنکر ناتھ فرار ہوگیا اور حیدر شاہ نے کافی لعن طعن کے بعد مجھے ایک جگہ چھوڑ دیا پھر مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میری پرچھائیں غائب ہوچکی ہے، روشنی میں مجھ پر شدید کرب کا عالم طاری ہوگیا اور ناگ رانی مجھے سنیاسیوں کے ایک ڈیرے پر لے گئی، وہاں شنکر ناتھ نے مجھے بھیلوں کے ہاتھوں مروانے کی ناکام کوشش کی اور ایک کڑے مقابلے کے بعد میری پرچھائیں ہی میرے وجود پر مسلط کردی، مزید یہ کہ شنکر ناتھ نے میری بائیں آنکھ کی بینائی ایک کمینی حرکت سے دوبارہ زائل کردی، پرچھائیں کی اذیت کے باعث میرا روشنی میں رہنا دوبھر ہورہا تھا جس کے باعث ناگ رانی مجھے ایک تیرہ و تار پہاڑی غار میں لے گئی جس میں سے نکلنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی، تاریک غاروں کی اس بھول بھلیاں میں ناگ رانی ایک لڑکی کو بے رحمی کے ساتھ میرے حوالے کرکے جے سیکا سمیت لوٹ گئی، اُس لڑکی نے بے حجابی کے ساتھ مجھے اپنے بارے میں ایک عجیب و غریب کہانی سُنائی اور پھر اُس کو اچانک غیر فطری، ہذیانی ہنسی کا طویل دورہ پڑ گیا۔

وہ کافی دیر تک یوں ہی ہذیانی انداز میں ہنستی رہی اور میں خوفزدہ انداز میں غار کی دیوار سے چپکا بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے خاموش ہوگئی۔ پھر مہا پجاری شنکر ناتھ میرے ہمدرد کے روپ میں اس غار میں آپہنچا اس نے ناگ رانی کے خلاف زہر فشانی کرکے اور مجھے ناگ بھون پہنچانے کا وعدہ کرکے مجھ سے منکا لے لینا چاہا مگر میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ پھر میں نے ناگ رانی کو طلب کیا اور اس نے شنکر ناتھ کو بے رحمی سے جہنم واصل کردیا اسی کے ساتھ میرا سایہ بھی اس جہنمی بڈھے کی قید سے آزاد ہوگیا۔ اب میرے سائے کی مکمل آزادی کے لئے ناگ رانی کا کچھ کام باقی تھا۔

ناگ رانی کی ہدایت پر جے سیکا بے ہوش عورت کو اُٹھا لے گئی اور میں ناگ رانی کے ہمراہ باہر نکل آیا۔ اس خوفناک پہاڑی سلسلے میں سرد برفانی ہواؤں کا راج تھا اور آس پاس کی چوٹیوں پر برف بکھری پڑی تھی یہاں میرے ذہن میں ناگ رانی کے خلاف شکوک و شبہات سر اُبھارنے لگے اِدھر وہ مجھے اپنی وفاداری اور محبت کا یقین دلاتی رہی اور میں نے مشتعل ہوکر اس کے منہ پر تھپڑ رسید کردیا اور وہ پہاڑ کی خوفناک ڈھلان سے نیچے بے رحم وادی میں لڑھک گئی۔

میں اس رات بڑی بے چینی کے ساتھ برف باری میں گھرا ان پہاڑی سلسلوں میں بھٹکتا رہا۔ آخرکار ناگ رانی دوبارہ مجھ سے آملی۔ برف باری میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ مجھے اپنی قوت کے سہارے بلاسپور کی ایک ویران حویلی میں لے گئی۔ وہاں میری بائیں آنکھ کی بینائی ایک نوجوان کی آنکھ کی قربانی دے کر دوبارہ بحال کی گئی پھر ناگ دیوتا کے مجسمے کے سامنے اپنا سارا زہر خارج کرکے میرے سائے کی مکمل آزادی کے لئے ایک خاص پوجا کی اور میرا سایہ پوری طرح آزاد ہوگیا۔

اس وقت تک میری بیوی ستارہ ناگ بھون میں میرے لڑکے کو جنم دے چکی تھی اور جل کماری کے گرگے اسے لینے کے لئے چل پڑے تھے۔ ناگ رانی نے ان پر وار کرنے سے قبل سون مندر کی خیر خبر لینے کے ارادے سے مجھے وہیں چھوڑا اور خود بلاسپور کی اس ویران حویلی سے چلی گئی میں تنہائی میں اپنے ماضی اور مستقبل کے بھیانک اور موہوم تصوّرات میں کھویا ہوا تھا کہ یک بیک جے سیکا کی دہشت زدہ چیخ اور ایک جانے پہچانے بھیانک قہقہے نے مجھے چونکا دیا۔

آنے والا شیو ناگ تھا۔ بلاسپور کی اس ویران حویلی میں اس

نے بڑی بے دردی کے ساتھ مجھے زیر کر لیا اور ناگ رانی کا منکا میرے قبضے سے نکل گیا۔ اذیتناک بے ہوشی کے بعد میں نے خود کو حوالات میں قید پایا۔ شیو ناگ نے ہری چند سے قتل کے دبے ہوئے سلسلے میں مجھے انسپکٹر ہیرس کے حوالے کر دیا تھا۔ ہیرس نے اپنے پرانے زخموں کا انتقام لینے کے لئے مجھ پر کافی تشدد کیا اور میں ایک مسلمان سپاہی کی ہمدردی حاصل کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی دوران میں ناگ رانی بھی مجھ سے آملی اس کی حالت بہت ابتر تھی سون مندر کے نواح میں شیو ناگ نے اسے ہوسناک عزائم کا نشانہ بنایا تھا۔ فرار کی راہیں مسدود کرنے کے سلسلے میں ہیرس اور اس کے ماتحت شیو ناگ اور ناگ رانی کے ہاتھوں مارے گئے اور شیو ناگ نے مجھے ناگ رانی سمیت سون مندر میں قید کر لیا سون مندر میں شیو ناگ نے میرے بدن کو ہاتھ لگائے بغیر میرا سارا خون نچوڑ لیا اور پھر مجھے ایک ویرانے میں پھنکوا دیا۔ اس کے تیوروں سے ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ ناگ رانی کو سون مندر میں قید کر کے میری طرح پامال کرے گا منکا گم ہونے کا شاخسانہ نہ صرف میرا بلکہ ناگ رانی کا بھی مقدر بن چکا تھا۔

مایوسی اور بے بسی کے ان لمحات میں جے سیکا اس ویرانے میں آپہنچی اس کی زبانی مجھے علم ہوا کہ بلاسپور کی ویران حویلی شیو ناگ نے جلا کر خاکستر کر دی ہے اور اس کے گرگے ملبے کے گرد حصار باندھے منکے کی نگرانی کر رہے ہیں۔ منکا اب ایک بھولا ہوا خواب بنتا نظر آ رہا تھا۔

جے سیکا میری بدحالی کے پیش نظر مجھے اس ویرانے سے سرن گڑھ کے ایک مکان میں لے گئی۔ اس کا سہارا مل جانے پر میرے دل میں ایک بار پھر زندہ رہنے کی امنگ جاگ اٹھی تھی۔ اس رات ہم دونوں بستروں پر دراز باتیں کر رہے تھے کہ اچانک دروازے پر تیز دستکوں کی آواز سنائی دی اور ہم چونک پڑے۔

اب آپ پندرھویں قسط کے واقعات پڑھیے

دروازہ کھلتے ہی میری نگاہ حیدر شاہ کے نورانی چہرے پر پڑی۔ ان کے باریش چہرے پر تقدس اور جلال کا ایسا امتزاج ثبت تھا کہ میں ان سے نگاہیں چار نہ کر سکا اور مجرموں کی طرح سر جھکا کر اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔ اس وقت یک بیک مجھے یاد آیا کہ میں مسلمان ہوں۔ میں نے انھیں سلام کرنا چاہا لیکن منہ سے آواز نہ نکل سکی۔

اِدھر جے سیکا شیو ناگ سے ٹکراؤ کی توقع لے کر دروازہ کھولنے گئی تھی۔ خلافِ توقع حیدر شاہ کی بارعب شخصیت سامنے آئی تو وہ بے اختیار کئی قدم پیچھے ہٹ گئی اور ان کے اندر آنے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

"سلطان!" حیدر شاہ کی دھیمی مگر پرہیبت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی شیو ناگ کی ظالمانہ سزاؤں کے باعث اس وقت میری جسمانی حالت بہت زیادہ غیر تھی۔ میرے لئے ہلنا جلنا تک محال تھا۔ لیکن حیدر شاہ پر نظر پڑتے ہی میں بے اختیار بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جوں ہی انہوں نے میرا نام پکارا، مجھے احساس ہوا کہ میری پنڈلیاں کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح میرے بدن کے بوجھ سے کانپ رہی ہیں۔ میں نے مجرمانہ احساس کے ساتھ اپنی نظریں اوپر اٹھائیں تو حیدر شاہ ملامت بھری نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

"خدا کو بھول کر جھوٹی رنگینیوں اور کھوکھلی قوت پر ناز کرنے والوں کے مقدر میں آخر کار ذلت ہی آتی ہے۔" وہ اسی جگہ چوکھٹ پر کھڑے کہہ رہے تھے۔ "میں نے تجھے سمجھایا تھا کہ عیاشیوں سے اپنے دامن کو آلودہ کئے بغیر اگر تو ناگ بھون سے اپنی معصوم بیوی کی رہائی کے منصوبے پر کام کرے گا تو تجھے اپنا راستہ صاف ملے گا لیکن تو موذی کیڑوں کے بہروپ کے سامنے اپنے نفس کی جہنمی خواہشوں پر قابو نہ پا سکا، تیرا ہر لمحہ ذہنی اور جسمانی آوارگیوں میں گزرا ہے اور اسی لئے تو اس عبرتناک حال کو پہنچا ہے۔"

میرے دل پر رقت طاری ہونے لگی، آنکھوں کے سامنے چمکیلی دھند اڑنے لگی، نیم جان پنڈلیوں کی کپکپی اتنی بڑھ گئی کہ میں بے اختیار بستر پر گر گیا۔ "بیٹی! میں اندر آجاؤں؟" حیدر شاہ کی نرم اور مربیانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ جے سیکا سے اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔

وہ حیدر شاہ کے چہرے مہرے سے پہلے ہی مرعوب ہو چکی تھی۔ ان کی شفیقانہ آواز سنتے ہی حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس لڑکی کے لئے گفتگو کا یہ انداز اجنبی تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، کبھی کسی مرد نے اس کے جسم کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کے سوا اس کے دل کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کسی آنکھ نے اس کے بدن کی حجاب کی چادر کو تار تار کئے بغیر نہ چھوڑا تھا، کسی آواز نے اسے محبت بھرے لہجے میں بیٹی کہہ کر نہیں پکارا تھا، حیدر شاہ کے منہ سے اپنے لئے بیٹی کا خطاب سنتے ہی پہلے تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اور پھر اس کے نازک سے وجود میں قیامت پھٹ پڑی۔ یوں محسوس ہوا جیسے بیٹی کے خطاب نے اس کے دل پر گھونسہ لگایا ہو وہ کسی شیر خوار بچے کی طرح پھوٹ کر رو پڑی۔

"میں نوچی ہوں بابا..... میں بازاری ہوں، میری ماتا نے پاپ کما کر مجھے جنا تھا..... مجھے بیٹی نہ کہو، میرا خوبصورت بدن دیکھ کر.....!" وہ بری طرح روتی اور چیختی ہوئی حیدر شاہ کی طرف دوڑی اور ان کے سامنے پہنچ کر جنون کے عالم میں اپنے بدن سے کپڑے نوچنے لگی۔

حیدر شاہ نے بس چند سیکنڈ تک اسے گھورا اور پھر فضا ان کے طمانچے کی پرشور آواز سے گونج اٹھی۔

"ہوش میں رہ لڑکی" وہ اس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے بولے۔ "بے حیائی میرے مسلک میں روا نہیں ہے۔"

جے سیکا کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ میرے بابا، میرے بابا کہتی چوکھٹ پر گر کر حیدر شاہ کے قدموں سے دیوانہ وار لپٹ گئی۔

اپنے قدموں پر جے سیکا کی پیشانی محسوس کرتے ہی حیدر شاہ کانپ اٹھے، نیچے جھک کر جے سیکا کو زمین سے اٹھا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں اس سے بولے "دنیا میں ہر لڑکی بہن اور بیٹی بن کر ہی پیدا ہوتی ہے لیکن ہوس کے پجاری اس کو گناہوں کی دلدل میں غرق کر دیتے ہیں مگر مجھے خوشی ہے کہ تیری آنکھوں کا پانی ابھی باقی ہے جس آنکھ میں حیا کی ذرا بھی رمق باقی ہو وہ ایک نہ ایک دن سچائی کا راستہ ڈھونڈ لیتی ہے۔"

لیکن جے سیکا روئے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں حیدر شاہ کے پرجلال چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ پتھرا کر رہ گئی ہوں۔ چند ہی سیکنڈ میں روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"میں نے تجھے بیٹی کہا ہے اور اب میں تیری چوکھٹ میں قدم رکھ سکتا ہوں۔" حیدر شاہ اسے سہارا دے کر بستر کی جانب لاتے ہوئے بولے۔ "آج تو دل بھر کر رو لے تاکہ تیرے ضمیر کا بوجھ آنسوؤں میں بہہ جائے۔ تو اندھیروں میں رہ کر بھی روشنی سے محبت کرتی رہی ہے، خدا کی قسم تو بے گناہ ہے۔"

انھوں نے اسے بستر پر لٹا کر اس کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے جھانکتے ہوئے بدن پر چادر ڈال دی۔

"پنڈتوں اور پجاریوں نے بھی کبھی مجھے بیٹی نہیں کہا تھا بابا" جے سیکا پر اپنے ماضی کی خلش سوار تھی، وہ ہاتھ پیر تیخ پٹخ کر اپنی روح کے کرب کا اظہار کر رہی تھی "وہ سب بھیڑیے ہیں۔ ان کے چکر میں آئی ہوئی لڑکی، بس لڑکی ہوتی ہے وہ تو کسی کو بہن بیٹی نہیں سمجھتے، تم کیسے رشی ہو کہ میرے بدن کی تعریف نہیں کرتے! مجھے اپنے دھرم کا پجاری بنا لو بابا، تم نے میرے من میں آگ بھڑکا دی ہے۔" حیدر شاہ کی زبان سے نکلے ہوئے ایک پاکیزہ لفظ نے جے سیکا کے وجود میں طوفان جگا دیا تھا، وہ جے سیکا جو لذتوں اور گناہوں کے سوا کسی نیک جذبے سے شناسا تک نہ تھی، تڑپ تڑپ کر روئے جا رہی تھی۔ اس وقت اس کی حالت کسی ایسے اندھے کی طرح تھی جس نے کبھی روشنی نہ دیکھی ہو لیکن پھر بھی اپنے پرہول ظلمت کدے کی فضا میں ہاتھ لہرا لہرا کر، ٹھوکریں کھانے کے باوجود روشنی کی ایک اجنبی کرن کو تھام لینے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں اس انقلاب پر دم بخود تھا۔ اپنی حالت کو میں بھول چکا تھا۔ بلکہ مجھے اپنے وجود پر ندامت سی ہو رہی تھی اور میں حیدر شاہ سے نظریں چرائے بستر پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ میں حیدر شاہ کا ہم مذہب تھا لیکن میرے اور ان کے کردار میں رتی برابر بھی مماثلت نہیں تھی۔ میں اپنی پوری قوت سے جے سیکا کو گناہوں کی وادیوں میں کھینچتا رہا تھا لیکن انھوں نے ایک ہی اشارے میں اسے اپنی ذات، اپنی نسوانیت اور اپنے وقار کا عرفان دے دیا تھا! کمرے کی فضا مجھے بوجھل لگ رہی تھی۔ حیدر شاہ خاموش تھے اور جے سیکا کا سانس، فرطِ گریہ سے بار بار اکھڑے جا رہا تھا۔ آخر کار حیدر شاہ نے اسے پانی پلایا، دلاسا دیا اور پھر اس کی آواز دبی دبی سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔

"بابا میں بن باپ تو پیدا ہوئی تھی مگر آج یوں لگ رہا ہے جیسے میں بن دھرم بھی ہوں جس دھرم کے رکھوالے اتنے گھناؤنے ہوں کہ پجارنوں کی سیج سے ہر رات جسموں کی خوشبو چرا لیتے ہوں وہ دھرم میرا نہیں ہو سکتا۔ میں آج سے تم میں سے ہوں، تم ہی میری ماتا ہو اور تم ہی میرے بابا ہو!" چند ثانیوں تک گہرے گہرے سانس لینے کے بعد جے سیکا نے غم و اندوہ سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور بے اختیار حیدر شاہ کے گلے لگ گئی۔

"جو روشنی کی جستجو کرتے ہیں، روشنی خود ان کا پیچھا کرتی ہے بیٹی! ندامت کے آنسوؤں نے تیرا ہر داغ دھو دیا ہے۔ آج سے تو واقعی ہم میں سے ہے۔" حیدر شاہ نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا اور پھر اسے وہ کلمات پڑھوائے جن کی شہادت کائنات کا ہر ذرّہ دے رہا ہے۔

جے سیکا نے دل کی گہرائیوں سے اپنے خالق کی وحدانیت اور پھر اس کے محبوب کی رسالت کا اعتراف کیا اور جب حیدر شاہ نے اسے بتایا کہ وہ سچائی کی راہ پا چکی ہے تو فرطِ مسرت سے یکبارگی اس کا بدن کانپا اور اس نے حیدر شاہ کی نورانی پیشانی پر اپنے ہونٹوں سے بوسہ لیا اور پھر اسی حالت میں رہ گئی۔

حیدر شاہ نے چند ثانیوں کے انتظار کے بعد اسے پکارا لیکن آواز ندارد۔ اس کا بازو ہلایا لیکن وہ کسی بے جان پتلے کی طرح زمین پر گر گئی۔

اس کی آنکھیں وجد کے عالم میں مندی ہوئی تھیں، لبوں پر سکون اور کچھ پا لینے کی طمانیت ابدی مسکراہٹ کی صورت میں رقصاں تھی اور سانسوں کی لڑی ٹوٹ چکی تھی اس پر سکرات کا عالم نسیم سحری کے کسی لطیف جھونکے کی طرح آ کر گزر گیا تھا۔

حیدر شاہ نے اس کے بدن کو چادر سے ڈھانپ دیا۔ ان کے ہونٹوں کے گوشے کپکپائے اور آنکھوں سے دو شفاف موتی جے سیکا کے بے جان لاشے پر ٹپک پڑے۔

"تیری موت کس قدر رشک انگیز ہے بیٹی!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں یہ کہہ کر تیزی سے دوسری طرف گھوم گئے۔ شاید وہ اپنے آنسو مجھ سے چھپانا چاہتے تھے۔

میں بے حس و حرکت اپنی جگہ پر پڑا رہا۔ اس وقت حقیقی معنوں میں مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں لیکن نہ زمین نے مجھے قبول کیا نہ قدرت نے میری آرزو پر درِ قبولیت وا کیا۔ قسمت میری اس خواہش پر خنداں تھی اور میں آنے والے دنوں سے بے خبر تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ اس لرزا دینے والے واقعے کے بعد بھی مجھے کیسے کیسے ہولناک واقعات سے گزرنا ہے! کاش مجھے یہ معلوم ہو سکتا تو میں اسی وقت حیدر شاہ کے قدموں میں تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا، اپنا سر کسی دیوار سے پھوڑ لیتا لیکن خود کو مصائب و آلام کے ایک طویل سلسلے سے بچا لیتا۔

حیدر شاہ ابھی تک مجھ سے دوبارہ مخاطب نہیں ہوئے تھے مگر مجھے اُمید تھی کہ وہ اپنے الفاظ کے نکیلے نشتروں سے میرے کردار کے پرزے اُڑا کر رکھ دیں گے۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ حیدر شاہ نے اگر مجھ پر تیز و تند حملے کیے تو میں اپنی حالت کا واسطہ دے کر اُن سے رحم اور درگزر کی التجا کروں گا۔

میں یہ سب سوچتا ہی رہا مگر انھوں نے دوبارہ مجھ سے تلخ لہجے میں بات نہ کی۔ جے سیکا کے انجام کے باعث چھایا ہوا غبار ہلکا ہوا تو وہ میری جانب مڑے۔

"تمہاری حالت قابلِ رحم ہے"۔ اُن کی آواز بہت نرم اور دھیمی تھی اور اس میں ملامت کی ذرا بھی جھلک نہیں تھی "اللہ کے کلام میں بڑی قوت ہے۔ تم اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں موند لو، اللہ کا حکم ہوا تو تم ابھی اپنی اصلی حالت میں لوٹ آؤ گے تمہاری کھوئی ہوئی توانائیاں لوٹا دینا اس کے نزدیک کوئی بڑا کام نہیں ہے۔"

میں نے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں موند لیں۔ اس کمرے کی فضا میں حیدر شاہ کی دھیمی اور پُرسوز آواز اُبھری اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیر میرے دل میں ترازو ہو گیا ہو۔ وہ اللہ کے کلام کی تلاوت کر رہے تھے جوں جوں وہ پڑھتے رہے اُن کی آواز کا آہنگ بلند اور وجد سے سرشار ہونے لگا۔ میرے دل پر رقت طاری ہونے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ یہی عالم کچھ دیر اور باقی رہا تو میرا دل سینہ چیر کر باہر آ جائے گا۔

پھر ایک مرحلے پر پہنچ کر میرے دل و دماغ پر ناقابلِ بیان سرور طاری ہونے لگا مجھے اپنا وجود ہلکے بادلوں کی طرح فضاؤں میں اُڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں بادلوں سے بھی اوپر اُڑ رہا تھا اور میرے چاروں طرف روئی کے گالوں کی طرح سفید سفید پرندے اپنے پر پھیلائے اُڑ رہے تھے۔

جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میری ساری توانائیاں بحال ہو چکی تھیں۔ حیدر شاہ فرش پر بیٹھے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں بے اختیار مسہری سے اُترا اور اُن کے قدموں میں گر پڑا۔

"تو اپنے مذہب تک کو بھول چکا ہے سلطان!" وہ مجھے اُٹھاتے ہوئے دُکھ بھری آواز میں بولے "انسان کو سجدہ حرام ہے، مجھے گناہگار نہ کر!"

"میری رہبری کیجیے بابا — میں اندھیروں میں بھٹک رہا ہوں میری زندگی سرابوں میں گھری ہوئی ہے، مجھے بتایئے کہ میں اپنی ستارہ تک کیسے پہنچ سکوں گا!" میں نے بے اختیار اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"شیطان ہر طرف تیری گھات میں ہے"۔ وہ پُرسکون آواز میں بولے "اپنے دامن کو گندگی سے بچائے رکھ اور یہاں سے سیدھا شاکر پور میں حضرت صاحب کے مزار پر چلا جا، وہیں تیری رہبری کا سامان ہو سکے گا۔"

جے سیکا کا بے جان بدن ابھی تک وہیں مسہری پر پڑا ہوا تھا۔ حیدر شاہ کے تیوروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود ہی اس کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کریں گے۔ انھوں نے ایک منٹ بھی مجھے وہاں نہ رکنے دیا اور مختصر الفاظ میں حضرت صاحب کی درگاہ کا محلِ وقوع سمجھا کر مجھے رخصت کر دیا۔

مکان سے باہر آیا تو برگد کے درخت کے تنے سے ایک تازہ دم سفید گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ اُس کی پشت پر زین کسی ہوئی تھی اور تھیلے میں کچھ ضروری سامان بھی موجود تھا۔

حیدر شاہ کے پند و نصائح نے میرے دماغ کے گوشے روشن کر دیے تھے۔ اوہام اور وسوسوں میں گھری ہوئی میری پُرہول کہانی عزم اور یقین کا ایک نیا موڑ لیتی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور گھوڑی کی راسیں تھام کر اُس کی پشت پر مضبوطی کے ساتھ سوار ہو گیا۔

صبح کا تازہ دم سورج دھیرے دھیرے سرن گڑھ والوں کے لئے نئی سحر کی نوید لئے طلوع ہو رہا تھا۔ میری گھوڑی بڑی جانفشانی کے ساتھ سنگلاخ زمین پر اپنے سموں کا ساز بجاتی شاکر پور کی طرف دوڑی جا رہی تھی میں نے اُس کی راسیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں۔ مجھے بھروسا تھا کہ وہ جانور مجھے بحفاظت منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔

گنجان آبادی ختم ہوئی پھر سورج کی کرنوں میں حرارت پیدا ہونے تک اِکا دُکا مکانات کے سلسلے بھی عقب میں رہ گئے اور میری سفید گھوڑی سر جھکائے جنگل میں پگڈنڈی پر گھس پڑی۔

دوپہر آئی اور ڈھل گئی۔ گھوڑی مسلسل برق رفتاری سے دوڑے جا رہی تھی۔ اُس کے منہ سے سفید سفید جھاگ اُڑ رہے تھے اور سم پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر چنگاریاں اُڑانے لگے تھے۔ میں بھی اس کا سانس نہ توڑنا چاہتا تھا، اس لئے کھانے پینے کا ارادہ سفر کے اختتام تک ملتوی کر دیا۔

جب سورج مغربی افق میں جھکنے لگا تو مجھے قدرے پریشانی ہوئی اس وقت میں میدانی علاقہ پیچھے چھوڑ کر شاکر پور کے اردگرد دُور دُور تک پھیلے ہوئے گھنے جنگلات میں سے گزر رہا تھا جہاں بندروں اور بھیڑیوں کی خاصی تعداد پائی جاتی تھی۔ اِکا دُکا گیدڑوں کی ہُوا ہُو بھی سُنائی دے رہی تھی۔ اگر رات اسی جنگل میں بسر کرنی پڑ جاتی تو میرے لئے بڑی جان گُسل دشواریاں پیدا ہونے کا امکان تھا۔ میں نے راسیں کھینچ کر گھوڑی کو ایڑ لگائی، وہ بُری طرح بدکی اور ایک جھٹکا لے کر پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ پڑی۔ اس کی سمت درست اور چال متوازن تھی ورنہ رفتار کی تیزی نے ایک ثانیے کے لئے مجھے پریشان کر دیا تھا کہ کہیں وہ بھڑک نہ گئی ہو۔

اسی دوران میں شام بھی ڈھلنے لگی جنگل ابھی تک گھنا تھا اور آثار سے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ اندھیرا پھیلنے تک میں اس وحشت انگیز جنگل سے نہ نکل سکوں گا۔

سورج کی روشنی تیزی کے ساتھ ماند پڑتی جا رہی تھی اور میں آنے والی رات کے دامن میں پوشیدہ خطرات سے بچاؤ کی تدبیروں میں اُلجھا ہوا تھا کہ جنگل کی نمناک فضا ایک دہشتناک نسوانی چیخ سے گونج اُٹھی۔

آس پاس کے درختوں پر سے بے شمار پرندوں کے غول کے غول سراسیمہ انداز میں چیختے ہوئے آسمان کی جانب اُڑ گئے، بندروں کی چیخیں فضا کو خوف آور بنانے لگیں۔ میں نے آواز کی سمت کا اندازہ لگانے کے لئے گھوڑی کی باگیں کھینچ لیں اور وہ پچھلے پیروں پر اُٹھ کر تیزی سے ہنہنانے لگی۔ اسی وقت کہیں قریب سے کسی عورت کی بچاؤ بچاؤ کی دردناک چیخیں سُنائی دیں اور میں بے اختیار گھوڑی کی پیٹھ پر سے اُتر پڑا۔

اُس کے نتھنوں سے گرم گرم سانسوں کی آندھیاں خارج ہو رہی تھیں اور وہ بڑی بے چینی کے ساتھ بار بار اپنے سم زمین پر مارے جا رہی تھی جیسے سفر کا یوں رک جانا اُسے پسند نہ آیا ہو۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اُس کی باگیں ایک درخت کے تنے سے باندھ دیں۔ اسی وقت نامعلوم عورت کی چیخیں قریب ہی سے سُنائی دیں یوں لگ رہا تھا کہ وہ جان کے خوف سے جنگل میں بھاگتی پھر رہی ہے۔

میں اس ستم رسیدہ عورت کی آواز سے سمت کا اندازہ کر چکا تھا بندروں اور گیدڑوں کے شور میں اب تسلسل کے ساتھ اس کی چیخیں سُنائی دے رہی تھیں۔ میں نے بلا تامل بائیں جانب کی جھاڑیوں پر نگاہ ڈالی اور فوراً ہی اُن میں گھس پڑا۔ بظاہر خاردار نظر آنے والی ان سخت و بھوری جھاڑیوں کے سلسلے کو عبور کرتے ہی میں ڈھلان دار جنگل کے اوپری حصے پر نکل آیا اور میری نگاہ نچلی ڈھلان میں دوڑتے ہوئے دو سایوں پر پڑی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث میں زیادہ تفصیل تو نہ دیکھ سکا لیکن یہ اندازہ ہو گیا کہ ان میں آگے آگے ایک عورت ہے اور اُس کے تعاقب میں ایک جھلایا ہوا مرد دوڑ رہا ہے۔

میں نے اس ڈھلان پر نگاہیں دوڑا کر ان دونوں تک اُترنے کیلئے اپنے راستے کا انتخاب کیا اور پھر محتاط ہو کر نیچے اُترنے لگا۔

وہ لڑکی دہشت زدہ آواز میں مسلسل چیخے جا رہی تھی کئی بار میں نے سوچا کہ چیخ کر اسے اپنی مدد سے باخبر کر دوں لیکن ایسی صورت میں وہ مرد ہوشیار ہو کر کسی طرف نکل جاتا۔ جبکہ میں کسی قیمت پر بھی اسے فرار کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

وہ لڑکی درختوں کی آڑ میں اس سے اپنا بچاؤ کرتی پھر رہی تھی، ذرا قریب ہونے پر مجھے صورتِ حال کا صحیح اندازہ ہو گیا۔

وہ مضبوط کاٹھی کی کوئی قبائلی لڑکی تھی۔ اُس کے بدن سے سارا لباس نوچا جا چکا تھا اور وہ شاید زخمی بھی تھی، مرد اندھوں کی طرح، جھلائے ہوئے انداز میں اُس پر جھپٹ پڑنے کے لئے بے چین تھا اس سے اس وحشیانہ مقابلے کا پس منظر واضح ہو چکا تھا۔ مرد گناہ کی لذت میں ڈوبا ہوا اس کا تعاقب کر رہا تھا اور وہ اس کی درندگی سے فرار حاصل کرنے کی سر توڑ کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔

ابھی میں ان دونوں سے تھوڑی ہی دُور تھا کہ پناہ اور مدد کی متلاشی، مظلوم لڑکی کی بے چین نگاہوں نے مجھے دیکھ لیا اور وہ چیخ مار کر میری طرف دوڑنے لگی۔ مرد نے بھی اوپر دیکھا اور میری طرف بڑھنے لگا، اس کا سیاہ چہرہ پسینوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ سردی کے باوجود اُس کی یہ حالت بتا رہی تھی کہ کافی دیر سے وہ اپنے شکار کے تعاقب میں ہے۔

اس ڈھلان پر چڑھنا بہت دشوار تھا۔ لڑکی کے قدموں کی رفتار سست پڑنے لگی اور ایک جگہ وہ جونہی جھاڑیوں سے بچنے کی کوشش میں لڑکھڑائی اس ہوسناک بھیڑیئے نے جست لگا کر اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا اور وہ لڑکی اسے خود سے دُور رکھنے کی کوشش میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگی۔

میں نے غصّے سے بے قابو ہو کر اس شخص کو للکارا لیکن اُس نے میری آواز کی پرواہ نہیں کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہرا ہو چکا ہو۔

پھر میں نے اُس کے بازوؤں میں دبی ہوئی لڑکی کو زمین پر گرتے دیکھا۔ وہ مرد خونخوار عقاب کی طرح اُس پر سوار ہو گیا۔ لڑکی نے پہلو بدل کر اسے گرا دینا چاہا لیکن بے سود، وہ اُس کے ہاتھوں میں بالکل بے بس ہو چکی تھی پھر اُس کے حلق سے اذیت میں ڈوبی ہوئی بے ساختہ چیخ آزاد ہوئی۔ میں نے پاگلوں کی طرح دو چار چھلانگوں میں ہی درمیانی فاصلہ عبور کر لیا اور لڑکی پر چھائے ہوئے مرد کے جبڑے پر ٹھوکر مارتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔

اس مرد کی چیخ بہت کریہہ تھی۔ میرے پلٹنے سے قبل ہی وہ لڑکی

کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں اور ناک سے خون کی دھاریں بہہ نکلی تھیں اور وہ ہاتھوں میں ایک بڑا پتھر اٹھائے، مجھے کچل دینے کی گھات لگا رہا تھا۔ لڑکی اپنی ٹانگیں سمیٹ کر تھکے ہوئے انداز میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ دہشت سے اُس کا رنگ زرد پڑا ہوا تھا اور بدن پر کپکپی چھائی ہوئی تھی۔

میں اپنے حریف کے مقابل کھڑا اُس کی خونی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اُس نے دو تین مرتبہ قدم بدل کر میری پھرتی کا اندازہ لگایا اور اچانک اپنے ہاتھوں پر اُٹھایا ہوا پتھر میرے سینے کی طرف اُچھال دیا۔ اس وقت اگر مجھ سے ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہوتی تو وہ پتھر مجھے مہلک ڈھلان کا لقمہ بنا دیتا۔ میں تیزی کے ساتھ زمین پر گرا اور وہ پتھر تیز آواز کے ساتھ نیچے لڑھکتا چلا گیا۔

میرے حریف کو پہل کا فائدہ مل چکا تھا۔ میں زمین پر گر کر پتھر کی زد سے تو بچ گیا لیکن اُس کی وحشیانہ گرفت سے نہ بچ سکا۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے لپک کر جونک کی طرح میرے بدن سے لپٹ گیا۔

میرے سامنے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ میں نے اپنی تمام تر قوت سے کام لے کر اُس کا گلا دبوچ لیا اور گھٹنے سے اُس کے پیٹ میں شدید ضرب لگائی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کی گرفت کمزور ہوئی اور میں اُسے نیچے گرا کر اُس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اب اُس کا نرخرا میری بے رحم انگلیوں کی گرفت میں تھا جب میری انگلیوں کا حلقہ تنگ ہونے کے باعث اس کا دم گھٹنے لگا تو اُس نے تڑپ کر میری کنپٹی پر ایک گھونسہ رسید کیا جس کے باعث میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے اور وہ زمین سے اُٹھ گیا۔

پھر ان جنگلاتی ڈھلانوں پر زندگی اور موت کی بھیانک جنگ چھڑ گئی۔ ہم دونوں بے رحمی کے ساتھ ایک دوسرے کا بدن نوچ رہے تھے۔ اس کا چہرہ تو میرے پہلے وار ہی میں خون میں نہا گیا تھا لیکن اس نے بھی کسر نہ چھوڑی اور ایک گھونسے میں میرا داہنا جبڑا ادھیڑ کر رکھ دیا۔

سُورج کی روشنی اب بہت زیادہ دُھندلا چکی تھی۔ پُورا جنگل بھانت بھانت کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ وہ لڑکی بدستور درخت کے تنے سے لگی کانپ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُسے سکتہ ہو گیا ہو۔

تھوڑی ہی دیر میں میں بُری طرح تھک کر ہانپنے لگا، میرے سخت جان حریف کی حالت بھی بہتر نہیں تھی۔ اچانک میری نظر ایک درخت کی مضبوط ٹہنی پر پڑی جو جھاڑیوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ میں اپنے حریف کو سمجھنے کا موقع دیئے بغیر اس ٹہنی تک پہنچنے کا موقعہ تلاش کرنے لگا۔

ایک بار جوں ہی اُس نے میری پسلیوں میں گھونسہ مار کر میری ٹانگوں سے لپٹ جانے کی کوشش کی، میں نے ایک طرف سرک کر اس کا وار خالی

دیا اور اگلے ہی لمحے میں وہ مضبوط ٹہنی میرے ہاتھ میں تھی۔

اب میں اپنے نہتّے دشمن سے دور رہ کر اسے لہو لہان کر سکتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ بڑی ثابت قدمی کے ساتھ میرے مقابلے میں جما رہا لیکن پھر لکڑی کی شدید ضربوں نے اسے بدحواس کر دیا اور وہ مقابلے سے گریز کر کے فرار کی راہ تلاش کرنے لگا۔

میری کوشش تھی کہ وہ ڈھلان کی نچلی جانب بھاگے تاکہ میں اُسے نیچے لڑھکا کر اُس کا قصّہ ہی تمام کر سکوں لیکن وہ بھی اتنا احمق نہیں تھا۔ اپنی ٹانگوں پر پڑنے والی پے درپے ضربوں کی پرواہ کیے بغیر وہ ڈھلان پر اوپر کی جانب دوڑنے لگا، میں بھی اس کے پیچھے لپکا لیکن اتنی دیر میں وہ خاصی دُور نکل چکا تھا۔

مجھ سے محفوظ فاصلے پر پہنچ کر وہ پلٹا اور جب اُس نے دیکھا کہ میں بھی اُس کے تعاقب میں ہوں تو وہ میری جانب پتھر لڑھکانے لگا اسی کے ساتھ وہ مجھ سے دُور بھی ہوتا جا رہا تھا۔ کئی پتھروں نے مجھے شدید زخمی کیا مگر میں اُس کے پیچھے لگا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے اندازہ ہوا کہ میری یہ بھاگ دوڑ اب بے سود ہے۔ وہ کافی اوپر پہنچ کر میری زد سے نکل چکا تھا۔

جب وہ اوپر جا کر میری نگاہوں سے روپوش ہو گیا تو میں سنبھل سنبھل کر نیچے اُترنے لگا تاکہ اس مظلوم لڑکی کی خیر خبر لے سکوں جس کی قبائے آبرو کو وہ درندہ تار تار کرنے کے درپے تھا۔

جنگل میں اب سورج کی الوداعی کرنوں کی خون آلود سُرخی پھیلی ہوئی تھی۔ فضا میں رچی ہوئی خنکی ہڈیوں تک میں سما جانے پر آمادہ نظر آ رہی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ لڑکی اس خطرناک جنگل میں رات کی سیاہی اور ناقابلِ برداشت سردی سے بچاؤ کے لئے کسی پناہ گاہ تک رہنمائی کر سکے گی۔

میں قریب پہنچا تو وہ لڑکی ابھی تک اسی حالت میں درخت کے تنے سے ٹکی ہوئی بیٹھی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ سُن کر بھی وہ نہ چونکی تو میں نے نرمی سے اُس کا شانہ چھُوا اور وہ ہلکی سی چیخ مار کر اچھل پڑی۔ چند ثانیوں تک وہ مجھے متحیّرانہ نظروں سے گھورتی رہی اور پھر بے اختیار مجھ سے لپٹ پڑی۔

"تم کون ہو؟ اس ویران جنگل میں کیسے آ نکلیں؟" میں نے اُس کی پشت سہلاتے ہوئے نرم اور مشفقانہ آمیز آواز میں کہا۔

"یہاں سے تین میل دُور میرا گاؤں ہے۔ میں نیچے ترائی میں بہنے والے چشمے پر نہانے اور کپڑے دھونے کے لئے آئی تھی۔ کپڑے دھونے کے بعد جب میں نہانے کے لئے چشمے کے پانی میں اُتری تو کسی طرف سے وہ پاپی نکل آیا۔ میں اسے دیکھ کر گھبرا گئی پھر اُس نے مجھے اشارے کرنے شروع کر دیئے تو میں وہاں سے بھاگ نکلی۔ اگر تم ادھر نہ آ نکلتے تو آج وہ میری آبرو اجاڑے

بغیر باز نہ آتا، وہ کسی بھیڑیئے کی طرح میرے پیچھے لگا ہوا تھا!" وہ زور زور سے ہانپتے ہوئے بولی۔

اس کے چڑھتے ہوئے سانسوں کے زیر و بم کے باعث میں اپنی چھاتی پر لطیف اور پُرکیف لرزشیں محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے بدن کا لمس مجھے بھی اس وحشی کی تقلید پر اُبھار رہا تھا جو ابھی میرے ہاتھوں رسوا ہو کر گھنے جنگلات میں اپنا منہ چھپا لینے پر مجبور ہوا تھا!

میں نے مربیانہ ہمدردی کی آڑ میں اُس کے سُرخ بھبھوکا رخسار کا بوسہ لے ڈالا "تم فکر نہ کرو۔ اب وہ ادھر کا رُخ کرنے کی بھی جرارت نہیں کرے گا۔"

اس لڑکی نے میری جسارت پر اعتراض نہیں کیا مگر میں نے اچانک جھرجھری لے کر اُسے اپنے بدن سے دُور ہٹا دیا۔ حیدر شاہ کے الفاظ میرے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح گرے تھے۔ انھوں نے مجھ کو دنیا کے خوبصورت ترین گناہ سے اپنا دامن بچائے رکھنے کی سخت تلقین کی تھی۔

"تم مُسافر معلوم ہوتے ہو؟" لڑکی اپنی حالت پر سخت مضطرب نظر آنے لگی تھی۔

"لو یہ بدن پر ڈال لو" میں نے اپنے کندھے سے چادر اُتار کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اوپر جنگل میں میری گھوڑی موجود ہے، میں تمہیں تمہارے گاؤں تک پہنچا دوں گا۔"

جنگل کی تنہائی میں اس لڑکی کا قرب اور اُس کے حسن کا کھلا اظہار مجھے گناہ پر اکسا رہا تھا۔ میں نے اپنی نظریں دوسری جانب پھیر لیں اور اوپر چڑھنے لگا۔ وہ لڑکی بھی میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔

میں اوپر پہنچا تو میرا دل دھک سے رہ گیا میری گھوڑی اس جگہ سے غائب تھی جہاں میں اُسے باندھ کر آیا تھا۔ شام کے ابتدائی دُھندلکے میں زمین پر اُس کے سموں کے نشانات نظر آ رہے تھے!

میں نے اس لڑکی کے ہمراہ آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا لیکن وہ گھوڑی نظر نہ آئی۔ سُورج غروب ہو چکا تھا۔ رات کی سیاہ چادر تیزی کے ساتھ شام کے دُھندلکے پر غالب آتی جا رہی تھی جنگل پُرخطر تھا اور اس لڑکی کا گاؤں کئی میل کی مسافت پر تھا۔ مجھے شب گزاری کی فکر شدت سے ستانے لگی!

"تمہاری گھوڑی غائب ہے، یہ بہت بُرا ہوا۔" وہ لڑکی دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی "اندھیرا بہت گہرا ہے، ایسے میں تو میں بھی اپنے گاؤں نہ پہنچ سکوں گی"

"یہ رات تو کہیں نہ کہیں بسر کرنی ہی ہو گی" میں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ مجھ پر اب ایک نیا خوف مسلّط ہونے لگا تھا۔ میری دانست میں میری گھوڑی کی گمشدگی میں میرے مفرور حریف کا ہاتھ تھا۔ جنگل میں شب بسری کی صورت میں وہ کسی بھی وقت پشت سے وار کر کے اپنی شکست کا انتقام لے سکتا تھا۔ ایسی صورت میں نہ صرف یہ کہ میں ہلاکت میں پڑ جاتا بلکہ وہ لڑکی بھی دوبارہ

اُس کے چنگل میں پھنس جاتی۔

"سردی بہت زیادہ ہے۔ کھُلے جنگل میں رات گزارنا آسان نہ ہو گی" وہ لڑکی پُرتشویش آواز میں کہہ رہی تھی "یہاں تو گیدڑ اور بھیڑیئے بھی بہت زیادہ ہیں۔ رات گزارنے کے لئے نیچے چشمے پر ہی جانا ہو گا۔ وہاں کھلی جگہ ہے۔ کم از کم بے خبری کے عالم میں کوئی جانور حملہ نہ کر سکے گا۔"

اس کی تجویز معقول تھی اور مجھے عذر کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور پھر تاریکی میں ڈوبے ہوئے جنگل میں ایک طرف چل پڑی۔ بسیرا کرنے والے پرندوں اور کمین گاہوں میں دبکے ہوئے جانوروں کا شور اب دم توڑ چکا تھا۔ ہاں ہمارے قدموں کی آہٹوں پر آس پاس کے درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے خوفزدہ آوازوں میں شور مچانے لگتے تھے جس کے جواب میں کبھی کبھار اکادکا بندر کی چیخیں سُنائی دے جاتی تھیں۔

"تم کدھر جا رہے تھے اجنبی؟" لڑکی نے بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے سوال کیا۔

اس کا نرم گداز بدن بار بار میرے بدن سے ٹکرا کر میری کنپٹیوں میں چنگاریاں بکھیر رہا تھا اور میں اس لڑکی کی ہمراہی میں آنے والے لمحوں کے تصوّر میں کھویا ہوا تھا۔ اُس نے زبان کھولی تو میں ایک دم چونک پڑا۔

"تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

"تمہاری منزل کس طرف ہے؟" اُس نے ایک گرے ہوئے درخت کے تنے کو عبور کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

"شاکر پورا" میں نے مختصر الفاظ میں جواب دیا۔

"بیوی بچّوں کے پاس جا رہے ہو گے!" اُس نے تائید طلب لہجے میں پوچھا۔ میرے منہ سے بے اختیار ایک گہرا سانس آزاد ہو گیا "میری بیوی مجھ سے بچھڑ چکی ہے، اسی کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہوں، نہ جانے میرا لڈّکا اب کہاں اور کس حال میں ہو گا۔"

میرے لہجے میں دل کا کرب نمایاں تھا۔ شاید اسے احساس ہو گیا کہ اُس کے سوال نے میرے دل کے تار چھیڑ دیئے ہیں، اس لئے وہ خاموش ہو گئی۔ اور اس موضوع پر دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" ڈھلان اُترتے ہوئے میں نے اس سے سوال کیا۔

"میرا نام فاخی ہے!" وہ جلدی سے بولی "تمہیں شاید پیاس لگ رہی ہے، حلق سوکھا معلوم ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں ہم چشمے پر پہنچ جائیں گے!"

میں اُس کی بیوقوفی پر مسکرا کر رہ گیا۔ وہ میرا حلق خشک ہونے کا مطلب تک نہیں سمجھ سکی تھی۔ میں نے اندھیرے میں نگاہیں پھیر کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ سر جھکائے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ تاریکی کے باعث میرے چہرے پر اُبھری ہوئی بھیکی بھیکی تحریر کو پڑھ لینا اُس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد پتھروں کے درمیان سے پانی بہنے کا دھیما دھیما

گنگناتا ہوا شور سُنائی دینے لگا جو بتدریج واضح ہوتا جا رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد ہم چشمے کے پاٹ پر جا پہنچے۔

"یہ کافی اوپر سے بہتا ہوا آتا ہے۔ اس کا پانی بہت ٹھنڈا اور مزیدار ہے۔ تم پانی پیو، میں ذرا اپنے کپڑے جمع کر لوں۔ اب تک تو سوکھ چکے ہوں گے!" وہ یہ کہہ کر ایک طرف چلی گئی۔

اس چشمے کا پانی واقعی بہت سرد تھا۔ میں نے کئی چلّو منہ پر ڈالے اور قدرے سکون کا احساس ہوا۔ میرا بدن اور چہرہ جذبات کی تمازت سے انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔

ذرا دیر بعد وہ لوٹ آئی۔ اُس کے ہاتھوں میں بہت سے کپڑے تھے۔ "اُس نے مجھے کپڑے پھیلانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا، یہ سب گیلے ہیں۔" وہ کپڑوں کا ڈھیر ایک طرف ڈالتے ہوئے بولی "اب مجھے یہ رات تمہاری چادر میں ہی بسر کرنی ہوگی، تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی!"

"مجھے تکان محسوس ہو رہی ہے، آؤ آرام کے لئے کوئی جگہ تلاش کریں!" میں نے اُس کا بازو تھامتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آؤ اِدھر ایک ٹیلا ہے، اس کی اوٹ میں ہم ہوا سے بچے رہیں گے" وہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

میں کسلمندانہ انداز میں انگڑائی لے کر ٹھنڈی زمین پر لیٹ گیا اُس نے مجھ سے چند قدم دُور لیٹنا چاہا لیکن میں نے اسے اپنے قریب ہی بُلا لیا "یہیں لیٹ جاؤ۔ اس طرح ہم بہتر طریقے پر ایک دوسرے کی حفاظت کر سکیں گے۔"

اُس نے کوئی تعرض نہ کیا اور میرے داہنے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ "ارے تمہارا بدن تو ٹھنڈا اکڑا ہوا ہے!" میں نے اُس کے شانے کو چھوتے ہوئے دانستہ جھوٹ بولا "اس چادر میں تم یہ رات کیسے گزار سکو گی؟" اُس نے میری جانب کروٹ لے لی اور میرے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "میں ٹھیک ہوں، میری فکر نہ کرو بابو!"

اُس کا لمس، اُس کے بدن کی دعوت انگیز مہکار مجھے پاگل کئے دے رہی تھی مگر مجھے اندیشہ تھا کہ میری دست درازی پر وہ بھڑک نہ اُٹھے اس لئے میں نے آہستگی سے اُس کی پیشانی پر اپنی بائیں ہتھیلی رکھی اور اُس کی جانب پہلو بدل لیا۔

اُس کی خاموشی نے میرے حوصلوں کو زبان دے دی۔ "تم خوبصورت گڑیا ہو فامی!" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی سے اُس کے رخساروں پر ڈھلکا دیا۔

اُس پر یکبارگی جنون کا دورہ سا پڑ گیا، اُس نے والہانہ انداز میں میرے ہاتھ کا بوسہ لیا اور بازو پھیلا کر میرے بدن سے ہم آغوش ہو گئی چادر اُس کے بدن سے سرک چکی تھی!

میرے ذہن میں چلتی ہوئی آندھیاں یک بیک تیز ہو گئیں اور مجھ میں سویا ہوا رنگین مزاج انسان انگڑائی لیکر پوری طرح بیدار ہو گیا

رات میں کسی وقت مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور میں اپنا سر اُس کی گود میں رکھ کر سو گیا۔ اُس نے میری چادر بھی میرے بدن پر ہی ڈال دی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسی علاقے کی باشندہ ہونے کے باعث ٹھنڈ کی عادی ہو چکی ہو۔

چہرے پر براہِ راست پڑنے والی سُورج کی کرنوں سے میں ہڑبڑا کر بیدار ہوا تو وہ غائب تھی۔ میں کافی دیر تک خالی الذہنی کے عالم میں زمین پر پڑا پلکیں جھپکاتا رہا پھر اُٹھ کر اُسے تلاش کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں، میں نے چپّہ چپّہ چھان مارا لیکن وہ پُراسرار طریقے پر روپوش ہو چکی تھی۔ اُس کے کپڑوں کا بھی دُور دُور پتہ نہیں تھا۔

میں نے چشمے کے شفاف پانی سے منہ دھویا اور محرومی کے احساس کے ساتھ ایک طرف چل پڑا۔ مجھے فامی کی گمشدگی پر تشویش سے زیادہ حیرت تھی حالات سے ظاہر تھا کہ وہ خود ہی غائب ہوئی ہے۔ اگر اس کی گمشدگی میں میرے ہاتھوں زخمی ہونے والے شخص کا ہاتھ ہوتا تو وہ فامی کو اُٹھا لے جانے سے قبل مجھے سوتے ہوئے قتل کرنے یا کم از کم بُری طرح زخمی کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ اپنے تجربے کی بنا پر اس شخص کے بارے میں میری رائے یہی تھی کہ وہ نہایت کینہ پرور اور دشمن کو نہ بھولنے والا انسان ہے۔

ان ہی خیالات میں کھویا، میں کافی دیر بعد اس مقام پر پہنچا جہاں سے میری گھوڑی غائب ہوئی تھی کیونکہ میں اسی مقام سے اپنے سفر کی راہ کا تعین کر سکتا تھا اس روز میں نے مانوس قسم کے جنگلی پھلوں پر ہی گزارا کیا اور شام ہونے کے قریب ان جنگلات کو خاصا دُور چھوڑ آیا۔ میری دانست میں اب شاکر پور زیادہ مسافت پر نہیں تھا۔

سُورج غروب ہونے کے بعد بھی میں چلتا ہی رہا۔ دن بھر پیدل چلنے کے باعث میرے پیروں پر ہلکا سا ورم آ چکا تھا اور تکان سے جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا لیکن ڈوبتے ہوئے سُورج کی آخری کرنوں کی روشنی میں مٹی سے بنی ہوئی ایک بڑی سی عمارت کا ہیولا دیکھ چکا تھا اور مجھے اُمید تھی کہ وہاں پہنچ کر میں آرام سے رات گزار سکوں گا۔

خدا خدا کر کے میں رات کے دس بجے کے قریب اس عمارت کے نزدیک پہنچا۔ وہاں دِیوں کی پھیکی پھیکی یرقان زدہ روشنی کا راج تھا اور رات کے گہرے سنّاٹے میں ہولناک پھنکاروں اور سیٹیوں کا شور سُنائی دے رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر میرے قدموں کی رفتار سست پڑنے لگی اور دل غیر یقینی حالات کے تصوّر سے ڈوبنے لگا۔ ایک مرتبہ پھر سانپوں اور ناگوں کا کوئی پُرہیبت مسکن میری راہ میں حائل ہو چکا تھا۔

میں اس عمارت کے مٹی سے بنے ہوئے احاطے کی دیواروں کے قریب ہی ٹھہر گیا۔ مٹی کی دیواروں کے پیچھے ایک گنبد دار عمارت نظر آ رہی تھی۔ وہ پُوری عمارت اور اُس کا گنبد بھی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اُس پر رنگوں سے نقش و نگار بنائے گئے تھے جو اب دُھندلا کر اپنی انفرادیت کھو چکے تھے۔ عمارت کی خستہ حالی اور پھیکے رنگ اس کی صدیوں طویل کہانی سُنا رہے تھے۔ ان اطراف میں دُور دُور تک کوئی مکان یا آبادی نہیں تھی اور سیاہ رات کے وحشتناک سنّاٹے میں اندر سے اُبھرنے والی پُرہول پھنکاریں اور سیٹیاں رگ و پے میں خوف کی سنسنی دوڑا رہی تھیں۔

میں کافی دیر تک باہر ہی کھڑا رہا اور اندر جانے کا حوصلہ نہ کر سکا ناگ رانی کے منکے سے محروم ہو جانے کے بعد میں نے پہلی بار خود کو اس کے ہم نسلوں کے قریب ایسی صورتِ حال میں پایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ منکا نہ ہونے کے باعث میں اپنے اوپر حملہ آور ہونے والے کسی بھی سانپ کے زہر سے محفوظ نہ رہ سکوں گا۔

آخر کار مجھے ایک تجویز سوجھی۔ اِس پُرہول عمارت میں اگر کوئی انسان موجود تھا تو وہ یقیناً میری مدد کر سکتا تھا۔ میں نے چند ثانیوں تک اپنے حواس مجتمع کئے اور پھر پُوری قوت سے چلّایا "اِس جگہ کوئی ہے؟"

رات کے سنّاٹے میں میری آواز دیر تک گونجتی رہی۔ اندر سے اُبھرنے والی پھنکاروں اور سیٹیوں پر میری آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

کئی سیکنڈ گزر گئے لیکن مجھے اپنی آواز کا کوئی جواب نہیں سنائی دیا۔ جب میں مایوس ہو کر وہاں سے روانہ ہو جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو کچھ دُور، چوبی دروازے سے ایک انسانی ہیولا باہر آتا نظر آیا۔

میں سانس روکے اپنی جگہ کھڑا، آنے والے کا منتظر رہا۔ وہ احاطے کے دروازے سے نکل کر میری ہی جانب آ رہا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں لالٹین لٹکی ہوئی تھی جس کی روشنی بمشکل چند فٹ تک ہی پھیل رہی تھی۔

وہ میرے قریب آیا تو میں چونک پڑا۔ وہ بھاری بدن کا مالک تھا۔ رنگت نکھری ہوئی تھی۔ قدرے فربہی مائل جسم پر معمولی کپڑے کا پیوند دار والا لباس نظر آ رہا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں دراز زلفیں شانوں پر لاپروائی سے بکھری ہوئی تھیں اور چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ بالوں کی سفیدی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی طرح پچاس سال سے کم نہیں ہے۔ اُس کے گلے میں زرد اور سیاہ رنگ کی کئی لمبی لمبی مالائیں اور کلائیوں میں وزنی آہنی کڑے نظر آ رہے تھے۔ مجموعی طور پر وہ کسی درگاہ کا مجاور لگ رہا تھا۔

اُس نے میرے قریب آ کر لالٹین قدرے اوپر اُٹھائی اور میرے سراپا کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اُس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے جیسے اسے میرے چہرے پر کوئی ناپسندیدہ تحریر نظر آ گئی ہو۔ میں نے پریشان ہو کر نظریں جھکا لیں۔

"بندوں سے شرماتا ہے اور خدا کا خوف نہیں ہے۔" وہ بھاری اور تحقیر آمیز آواز میں بولا "تیرے چہرے پر گناہ کی تازہ سیاہی مجھے بہت کچھ بتا رہی ہے۔"

"میں بھٹکا ہوا مسافر ہوں" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "اگر تم آج رات مجھے پناہ دے سکو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔"

"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ تو بھٹکا ہوا ہے۔" اس قوی بوڑھے کی آواز میں طنز نمایاں تھا "مگر میں حضرت صاحب کی چھت کے نیچے کسی زانی کو پناہ نہیں دے سکتا۔"

حضرت صاحب کا نام سنتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ نادانستگی میں میں سیدھا اپنی منزل مقصود پر آ پہونچا تھا۔ میں نے ندامت سے بوجھل نگاہیں اس شخص کے چہرے کی طرف اُٹھائیں اور التجا آمیز لہجے میں بولا۔

"میں حضرت صاحب کی درگاہ پر ہی آیا ہوں۔ میں بہت دکھی اور پریشان ہوں۔ مجھے ایک بزرگ نے رہنمائی حاصل کرنے کیلئے یہاں بھیجا ہے۔"

"تیرے ہر سانس سے گناہ کی بُو آ رہی ہے۔" وہ بوڑھا مجھے گھورتا ہوا نفرین آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ "تجھے جس نے بھی یہاں بھیجا ہے اُس نے تجھے یہاں کے آداب بھی بتائے ہوں گے۔"

"مجھے حیدر شاہ نے یہاں بھیجا ہے۔" میں نے مضمحل آواز میں کہا۔ "راستے میں ایک شیطانی جال میرے آڑے آ گیا اور میں حیدر شاہ کی ہدایت بھول کر گناہ کر بیٹھا، میں مجبور تھا بابا!"

"حیدر شاہ کے بھیجے ہوئے کتّوں کو بھی میں نہیں روک سکتا۔" بوڑھا مجاور جلدی سے بولا "اِس درگاہ کے دروازے تجھ پر کھلے ہوئے ہیں۔"

وہ یہ کہہ کر پلٹا اور دروازے کی طرف چل دیا۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ مٹی سے بنے ہوئے احاطے سے اندر داخل ہوا تو ایک وسیع میدان خودرو جھاڑیوں اور درختوں سے پٹا ہوا نظر آیا۔ اُن کے درمیان ایک تنگ سی پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی درگاہ کی اصل عمارت تک جا رہی تھی۔

احاطے میں بے ترتیبی سے اُگے ہوئے خودرو جنگل میں اچانک جھینگروں کا تیز شور گونجنے لگا۔ اُن کی سائیں سائیں درگاہ سے آنے والے سانپوں کے شور سے مل کر ماحول کی ہیبت کو لرزہ خیز بنا رہی تھی۔

پھر ہم درگاہ تک جا پہنچے۔ چبوترہ عبور کرتے ہی مٹی سے بنی ہوئی عمارت کا چوبی دروازہ سامنے آ گیا جس میں سے پھیکی اور زرد روشنی باہر تک آ رہی تھی۔

میں ایک قدم اور آگے بڑھا اور پھر میرے قدم لڑکھڑا کر رہ گئے۔

مٹی کے وسیع گنبد کے نیچے بنی ہوئی درگاہ کے وسط میں ایک اونچی مگر سادہ سی قبر نظر آ رہی تھی جس پر گلاب کے تازہ پھولوں کا انبار لگا ہوا تھا اور فرش پر بے شمار زندہ لکیریں، ہر رنگ اور جسامت کی لکیریں سہمے ہوئے انداز میں رینگ رہی تھیں۔ قبر کے نیچے رینگتے ہوئے وہ سانپ ہی بے چینی کے ساتھ پھنکار رہے تھے۔ حضرت صاحب کی درگاہ کا مجاور میری نگاہوں کے سامنے بے خوف و خطر اندر داخل ہوا۔ اُس کے بھاری قدم سانپوں پر پڑے لیکن میری

حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اُن میں سے کسی موذی نے پلٹ کر اُس پر وار نہیں کیا۔ وہ کچی زمین پر رینگتے ہوئے بے شمار سانپوں پر چلتا گلاب کے پھولوں سے لدی ہوئی قبر تک گیا مؤدّب انداز میں سر کو خم دے کر چند ثانیوں تک زیرِ لب کچھ پڑھتا رہا اور پھر قبر پر سے گلاب کا ایک تازہ پھول اُٹھا کر واپس لوٹ آیا۔

"تم پر غسل واجب ہو چکا ہے۔" وہ میرے نزدیک آ کر سرگوشیانہ آواز میں بولا "تمہارے دل کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔ تم میری کوٹھری میں چل کر اپنے جسم کو پاک کر لو اس کے بعد ہی تم حضرت صاحب کی درگاہ میں قدم رکھ سکو گے۔" میں ایک طویل چکر کاٹ کر اس مجاور کے ہمراہ اس کی کشادہ کوٹھری میں پہنچا۔ وہاں ضروریاتِ زندگی کا مختصر ترین سامان موجود تھا۔ بوڑھے مجاور نے اپنی کوٹھری کے ایک گوشے میں بنے ہوئے غسل خانے تک میری رہنمائی کی۔ اور میں قدرے جھجک کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

اس روز میں نے ایک طویل مدت کے بعد شرعی انداز میں غسل کیا۔ بدن پر پڑنے والے پانی کی ہر بوند سے عجیب سی ناقابلِ بیان تازگی اور فرحت حاصل ہو رہی تھی۔ کافی دیر تک نہانے کے بعد میں باہر آیا تو بوڑھا مجاور دسترخوان پر گیہوں کی گرم گرم روٹیاں اور تازہ پکی ہوئی دال سجائے میرا منتظر تھا۔ میں نے متجسّسانہ انداز میں ہر طرف نظریں دوڑائیں لیکن گرم روٹیوں اور تازہ دال کا کوئی جواز نظر نہ آ سکا، مجاور کے چولھے میں پڑی ہوئی سرد راکھ سے ظاہر تھا کہ اُس میں کئی پہر سے آگ نہیں جلائی گئی ہے

"یہ درویشوں کے کھیل ہیں لڑکے۔" بوڑھے مجاور نے سنجیدہ لہجے میں مجھے مخاطب کیا "حضرت صاحب کی درگاہ میں کسی وقت کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔"

میں نے خاموشی کے ساتھ خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور جب پانی کا آخری گھونٹ لے کر مٹی کا بدھنا زمین پر رکھا تو مجاور نے گفتگو چھیڑ دی۔

"تم کسی بڑی مصیبت کا شکار معلوم ہوتے ہو!"

"میں کئی مہینوں سے اپنی بیوی کے فراق میں جل رہا ہوں بابا" میں نے دلی کرب کے ساتھ کہا اور اس وقت پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ناگ بھون کا نام میرے ذہن سے پھسل چکا ہے۔

"یہاں تم کو سکون ملے گا لڑکے!" بوڑھے مجاور کی آواز نرم اور لہجہ ہمدردانہ تھا۔ "کیا تمہاری بیوی زندہ سلامت ہے؟"

"میں کچھ نہیں جانتا، وہ میرے دشمنوں کی قید میں ہے۔ وہ کہاں قید ہے، یہ میں بھول چکا ہوں۔ حیدر شاہ سے مُلاقات تک مجھے خوب یاد تھا وہ ایک اجنبی اور خوفناک دُنیا ہے۔ وہاں موذیوں کی حکمرانی ہے اور اُس کا ایک راستہ سون مندر سے بھی جاتا ہے، اُف! میں اُس جگہ کا نام ہی بھول چکا ہوں۔" میں اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے بولا۔ کوشش کے باوجود ناگ بھون کا نام میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی میں اس مجاور سے درگاہ میں نظر آنے والے سانپوں کے بارے میں گفتگو کی ہمّت پا رہا تھا۔

"جاؤ تم حضرت صاحب کی درگاہ میں جاؤ"، بوڑھا مجاور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "وہاں جا کر تمہیں سکون ملے گا۔ تمہاری حالت بہت زیادہ ابتر ہے۔"

میں سخت کوفت اور اُلجھن کے عالم میں وہاں سے اُٹھا، میرا ذہن ابھی تک اس پُراسرار جگہ کے نام کی تلاش میں سرگرداں تھا جہاں ستارہ قید تھی مجھے یقین تھا کہ میرے نابکار دشمن، شیو ناگ نے اپنی ماورائی قوتوں کے ذریعے ناگ بھون کا نام میرے حافظے سے یکسر مٹا دیا ہے تاکہ میں وہاں کی کہانیاں عام نہ کر سکوں مجھے اپنی کہانی کا ہر کردار اور ہر مقام بخوبی یاد تھا۔ جے سیکا اور اُس کی حسرتناک موت اچھی طرح یاد تھی، ناگ رانی کی آخری مجبوریاں اور شیو ناگ کی بدمست گستاخیاں بخوبی یاد تھیں لیکن خوفناک اژدہوں اور زہریلے ناگوں کے بھیانک مسکن ناگ بھون کا نام میں بھول چکا تھا۔

میں حالات کے بے رحم منجدھار میں پھنس کر بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا، ستارہ ناگ بھون میں قید تھی، میرے لڑکے کو یرغمال کے طور پر لینے کے لئے جل کماری کے گرگے ستارہ کے عفونت کدے میں پہنچ چکے تھے۔ ستارہ کی عصمت کو داغدار کرنے کے لئے ناگ راجہ چکر پُوجا کا جشن منانے والا تھا، ناگ رانی سون مندر میں شیو ناگ کی قید میں ذلّت اور تحقیر کے عذاب میں مبتلا کر کے پامال کی جا رہی تھی، اُس کا بے شمار پُراسرار قوتوں والا منکا بلا سپو کی ویران حویلی کے جلے ہوئے ملبے میں دبا پڑا تھا جس کی نگہبانی شیو ناگ کے خون آشام گرگے کر رہے تھے، انسانی نسل سے تعلق رکھنے والی پُراسرار قوتوں کی مالک جے سیکا اپنی ذات کا عرفان حاصل کر کے زندگی اور اُس کے بکھیڑوں سے نجات پا چکی تھی اور میری حالت اس قدر رحم انگیز تھی کہ میں ناگ بھون کا نام تک بھول جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں، میں حضرت صاحب کی درگاہ کے دروازے پر جا پہنچا۔

اندر گلاب کے پھولوں سے لدی ہوئی قبر کے نیچے فرش پر زندہ سانپ ابھی تک پھنکاریں مارتے رینگ رہے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے قدم اندر رکھا۔ میرے قدموں کے نیچے آنے والے سانپ کلبلا کر رہ گئے۔ پھر میں ان زندہ سانپوں پر چلتا ہوا حضرت صاحب کی قبر تک پہنچا وہاں سے خوشبوؤں کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ مٹی کی اس عمارت کا ماحول اس قدر گمبھیر اور ڈراؤنا تھا کہ میرے دل پر رقّت سی طاری ہونے لگی۔ میں نے قبر کے پہلو میں ٹھہر کر حیدر شاہ کے بتائے ہوئے مقدّس کلمات مخصوص ترتیب کے ساتھ دہرائے۔ درگاہ میں اچانک دھماکا ہوا جیسے قبر شق ہوئی ہو۔ میں نے خوفزدہ ہو کر سر اُٹھایا لیکن وہاں ہر چیز معمول پر

تھی۔ کہیں بھی زمین شق ہونے یا کوئی حصّہ زمین بوس ہونے کے آثار نہیں تھے۔

میں چند سیکنڈ تک سہما ہوا اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر کسی تائیدِ غیبی کے تحت آہستہ آہستہ قبر کے سرہانے لوح کی جانب بڑھنے لگا

لوح کے قریب پہنچ کر میرے دل کی دھڑکن یک بیک تیز ہو گئی قبر کے سرہانے بنے ہوئے خاکی چبوترے پر ایک متحرک سا سایہ نظر آ رہا تھا جس کے خدوخال کسی پتلے سے سانپ سے مشابہ تھے۔ میں نے خوفزدہ نگاہوں سے ہر طرف دیکھا لیکن کہیں بھی کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے وہ سایہ پڑنے کا گمان ہوتا۔

نہ صرف یہ کہ وہ زمینی سایہ کسی زندہ سانپ کی طرح ہلکورے لے رہا تھا بلکہ اُس کے منہ سے بار بار زبان کا سایہ باہر لپکتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس پر غور کیا تو میں لرز اُٹھا۔ اُس سائے میں سے پھنکاروں کی آوازیں بھی خارج ہو رہی تھیں۔

"تیرے اعمال تیرے اعصاب پر مسلّط ہیں سلطان" اچانک میرے کانوں میں کوئی غیبی ندا گونجی "تو نے سانپوں کے حصار میں اور ناگنوں کے بستر پر جو دن گزارے ہیں وہ وہم بن کر تیرا تعاقب کر رہے ہیں، یہاں کوئی سانپ ہے نہ سانپ کا سایہ، یہ سب تیری گنہگار آنکھوں کا فریب ہے جس سے نجات ملنی آسان نہیں ہے۔"

پھر اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے قدموں میں رینگتے ہوئے سانپ سرسراتے ہوئے میرے بدن پر چڑھ رہے ہیں۔ میں نے اُن کے جسموں کا کراہت انگیز لمس اپنی ٹانگوں پر محسوس کیا، پھر وہ میرے پیٹ اور پشت پر رینگتے ہوئے گردن سے لپٹنے لگے۔ میں دہشت زدہ درگاہ کے فرش پر گر گیا اور میرے ہونٹوں، نتھنوں اور کانوں میں سرسراہٹیں رینگنے لگیں۔ درگاہ کے فرش پر رینگتے ہوئے بے شمار سانپ میرے بدن میں گھستے جا رہے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ بھینچ کر پے در پے کئی چیخیں ماریں اور پھر فرطِ دہشت سے بے ہوش ہو گیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں درگاہ کے کچے فرش پر پڑا ہوا تھا اور سُورج کی شعاعیں فضا کو منوّر کر رہی تھیں۔ حضرت صاحب کی قبر بدستور گلاب کے تازہ پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ فرش پر دُور دُور تک کسی سانپ تو کیا کیڑے تک کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں تازگی کے احساس کے ساتھ فرش سے اٹھا اور قبر کے سرہانے نظر ڈالی تو وہاں بھی مٹی کے چبوترے پر کوئی پُراسرار سایہ نہیں تھا۔

رات کے پُرہول تجربے اور غیبی ندا کے بعد درگاہ کا یہ منظر میرے لئے بے حد مسرّت افزا تھا۔ مجھے اپنا وجود کسی پھول کی طرح ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ ذہن پر کسی نامعلوم قید سے رہائی کا لطیف احساس طاری تھا۔

میں نے پلٹ کر قبر پر پڑے ہوئے گلاب کے تازہ پھولوں میں سے ایک اٹھانا چاہا لیکن میرا ہاتھ مس ہوتے ہی وہ سارے پھول ببول کے کانٹوں میں تبدیل ہو گئے، فضا میں ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور درگاہ میں دھول کا غبار اُمڈ آیا۔ نتھنوں میں مٹی گھسنے کے باعث مجھ پر شدید کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

جب غبار کا وہ طوفان صاف ہوا تو نہ وہ قبر تھی اور نہ ہی اُس کی گنبددار چھت رہ گئی تھی۔ سر پر کھلا آسمان نظر آ رہا تھا مٹی کی دیواروں میں گھرے ہوئے میں نے وحشت زدہ نظریں گھمائیں تو رگوں میں خون جم کر رہ گیا۔ داخلی دروازے پر منحوس شیو ناگ بڑے سکون سے کھڑا ہوا تھا۔

"شاکر پورا ابھی یہاں سے چھ سات میل آگے ہے سلطان جی!" وہ میری بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے زہریلی آواز میں بولا۔ راستے میں فامی نام کی وہ لڑکی بلاسبب نہیں ملی تھی۔ عورت تیری سب سے بڑی کمزوری ہے میرا یہ وار بھی کامیاب رہا۔ تو جنگل کی تنہائی میں اس لڑکی کے قریب جا کر اب پھر تنہا رہ گیا ہے۔ تجھ جیسے پاپی کی مدد کرنا حیدر شاہ کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔"

مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ میری پھٹی پھٹی آنکھیں بے یقینی کے عالم میں اندھے شیو ناگ کے چہرے اور اُس کے بالوں کی جگہ لہراتے ہوئے باریک باریک سانپوں پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں تیری راہ پر لگ چکا ہوں اور تو لکھ کر رکھ لے کہ میں تجھے سسکا سسکا کر ماروں گا۔ اب تو ہر طرف سے گھیرا جا چکا ہے!" وہ قہقہہ مار کر آگے بڑھتے ہوئے بولا اب سارا کھیل میری سمجھ میں آ چکا تھا۔ مجھے بہکا کر حیدر شاہ کی ہدایت کی خلاف ورزی کرانے کے لئے شیو ناگ نے جنگلات میں ایک جھوٹا کھیل رچایا تھا۔ حالات ایسے پیدا کئے گئے تھے کہ میں اس لڑکی کے مقصد پر شبہ تک نہ کر سکا۔ مجھے یقین تھا کہ شیو ناگ ہی نے میری گھوڑی غائب کی تھی تاکہ میں تنہائی میں اس جوان لڑکی کے ساتھ شب بسری پر مجبور ہو جاؤں۔ اس کے بعد سب کچھ اُس کی مرضی کے مطابق ہوا اور اُس نے مجھے حضرت صاحب کی درگاہ کا نام استعمال کرتے ہوئے فریب کے ساتھ اس عمارت میں قید کر دیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تو اذیتوں کے باوجود زندہ بچ گیا۔ واقعی تو آسانی سے نہ مر سکے گا۔ تیری ناگ رانی سون مندر کی کوٹھری میں بے ہوش پڑی ہے۔ اُس کے بدن سے خون جاری ہے اور وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں ہے۔ اُس کے بغیر تو یتیم ہو کر رہ گیا ہے" شیو ناگ اندر داخل ہوتے ہوئے سرد اور جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔

"آخر تو میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے!" میں نے یہ کہتے ہوئے اپنی آواز میں ہلکی سی لرزش محسوس کی۔

"تو نے ناگ رانی اور منکے کے سہارے مجھے چوٹ پر چوٹ دی ہے" وہ یک بیک تیز آواز میں بولا "ہماری دُنیا کے بہت سے راز تو جان گیا تھا۔ مگر اب میں نے اپنی قوت کے سہارے وہ نام ہی تیرے ذہن سے مٹا دیا ہے۔ تیری

پتنی تیرے ہاتھوں سے نکل چکی ہے۔ ناگ رانی کا منکا نہ اب تیرے قبضے میں آسکتا ہے نہ میرے پاس ہے۔ وہ میرے گرگوں کی نگرانی میں جلی ہوئی حویلی کے ملبے میں پڑا ہے۔ تیری اجازت کے بغیر میں اسے نہیں لے سکتا۔ تو وہ منکا مجھے لینے کی اجازت دیدے تو میں تجھے چھوڑ دوں گا۔ تیرے لئے اتنی سزا ہی کافی ہے لیکن ابھی ناگ رانی سے نمٹنا باقی ہے۔ تیری خاطر اُس نے اپنی جنم بھومی سے غدّاری کی ہے، ناگ راجہ کو چھوڑ دیا ہے، مجھ پر وار کئے ہیں، میں اپنی پگھلی ہوئی آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ابھی میں نے اسے بہت ذلیل کیا ہے لیکن منکا قبضے میں آئے بغیر میں اُس پر اپنی شکتیاں نہیں آزما سکتا.... اس وقت منکا بالکل بے کار ہے، نہ وہ تیرے کام کا ہے، نہ ناگ رانی کے پاس آسکتا ہے، نہ میں اسے چھو سکتا ہوں، وہ مجھے دے کر تو اپنی جان بچا سکتا ہے!"

اُس کی تقریر خاصی موثر تھی لیکن میں خوب جانتا تھا کہ شیو ناگ جھوٹا، مکّار اور فریبی ہے۔ ایک مرتبہ منکا ہاتھ آتے ہی وہ نہ صرف ناگ رانی بلکہ مجھے بھی ناقابلِ بیان اذیتوں میں بتلا کر دیتا۔ میرے لئے زندگی کی موہوم سی اُمید اسی وقت تک باقی تھی جب تک منکا شیو ناگ کے ہاتھوں سے بچا ہوا تھا۔ ایسی صورت میں ممکن تھا کہ حیدر شاہ کی جانب سے میرے گناہ کو نظرانداز کر دیا جاتا اور میں کسی طرح حضرت صاحب کی درگاہ تک پہنچ جاتا۔ مجھے یقین تھا کہ حضرت صاحب کی درگاہ پر میرے مصائب کا ازالہ ہو سکے گا۔

"وہ منکا وہیں رہے گا" میں نے چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد کہا "ناگ رانی کے لئے یہی سزا کافی ہے کہ اُس کے بدن پر تجھ جیسے آوارہ اور مکّار کا تصرف ہے۔" "تیرے دماغ کا کیڑا ابھی تک کلبلا رہا ہے۔" وہ غضبناک آواز میں دہاڑا "تو اب تو تیار ہو جا۔ جکڑ پُوجا اسی جگہ ہوگی اور تو اپنی آنکھوں سے ناگ راجہ کے ہاتھوں اپنی پتنی، ستارہ کی آبرو لٹتی دیکھے گا۔ تو موت کی آرزو کرے گا لیکن تو زندہ رہے گا۔ یہاں انسانوں کا رُوپ بدلنے والے ناگ اور ناگنیں جمع ہوں گی اُن کے جھرمٹ میں تیری نسل کی خوبصورت لڑکیاں اور کڑیل جوان بھی ہوں گے اور پھر یہاں عیش کی محفل سجے گی۔"

"نہیں .... یہ نہیں ہو سکتا" میں ہذیانی انداز میں چیخا۔ "ستارہ مر جائے گی مگر کسی ناگ کو اپنے قریب نہیں آنے دے گی، چاہے وہ ناگ راجہ ہی کیوں نہ ہو۔" وہ بے رحمانہ انداز میں زور سے ہنسا "ناگ راجہ ایک کڑیل اور خوبرو جوان کے رُوپ میں ہوگا۔ تیری پتنی ایک برس سے تیری خاطر اپنے ارمانوں کا خون کر رہی ہے۔ وہ بھی عورت ہی ہے، جب اُس پر تیز شراب کا نشہ چڑھے گا تو وہ خود اپنے کپڑے پھاڑ کر ناگ راجہ کی باہنوں میں آگرے گی۔"

"تو جھوٹا ہے.... یہ نہیں ہوگا، میں اپنے ہاتھوں سے ستارہ کو مار دوں گا" مجھ پر وحشت سوار ہو گئی تھی اور آواز احساسِ بے بسی سے کپکپائی ہوئی تھی۔ "تو ہاتھ پیر بھی نہ ہلا سکے گا، تیرے حواس کام کریں گے، تو سب کچھ دیکھے اور سمجھے گا لیکن نہ تیری زبان حرکت کرے گی، نہ بدن حرکت کرے گا۔ اس وقت تک میں تجھے ایذا دے دے کر ہڈیوں کا ایسا ڈھانچہ بنا دوں گا کہ ستارہ تجھے قریب سے دیکھ کر بھی نہ پہچان سکے گی۔" اس کی آواز سرد اور لہجہ بے رحمانہ تھا۔

"تو اُس کی آنکھوں کو فریب دے سکتا ہے لیکن تو جذبوں کو دھوکا نہیں دے سکتا شیو ناگ!" اُس کی ہرزہ سرائی پر میں دیوانہ وار اُس کی طرف چیختا ہوا لپکا۔ اُس نے قہقہہ لگا کر دونوں ہاتھ فضا میں اُچھالے اور اُس کے طاقتور تھپیڑوں نے میرے حواس پراگندہ کر دیئے۔ ایک ثانئے کے لئے میری آنکھوں کے سامنے تاروں کی کہکشاں کوندی اور میں زمین پر رینگ کر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اِس سے پہلے بھی کئی بار شیو ناگ سے میرا دست بدست مقابلہ ہو چکا تھا لیکن اِس بار تو اس اندھے موذی کا رویّہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے اُس کا حریف کوئی ناسمجھ، جوشیلا بچّہ ہو۔ میں اُس کی پنڈلیوں سے لپٹا اسے زمین پر گرا دینے کی سرتوڑ کوشش کرتا رہا لیکن یا تو غصّے اور خوف کے باعث میری توانائی منتشر ہو چکی تھی یا اس بار وہ زیادہ شہ زور ہو چکا تھا کہ میں اُس کے قدم نہ اکھاڑ سکا اور وہ زور زور سے پاگلوں کی طرح ہنستا رہا۔

پھر اُس نے نیچے جھک کر میرے بال اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں جکڑ لے، میرے منہ سے مغلظات اور کرب میں ڈوبی ہوئی چیخوں کا طوفان اُمڈ پڑا لیکن وہ مجھے اوپر اُٹھاتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ میرے قدم زمین سے اُٹھ گئے، میرے بال اُس کی مٹھیوں میں دبے ہوئے تھے اور بدن فضا میں معلّق تڑپ رہا تھا۔

میں نے اُس کے جا بجا پھولے ہوئے، سیاہ چہرے پر نظر ڈالی۔ اُس کی بصارت سے محروم، پگھلی ہوئی آنکھوں کا رُخ میری ہی جانب تھا جیسے وہ میری حالت بخوبی دیکھ رہا ہو۔

میں نے تکلیف سے تڑپ کر اُس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا چٹاخ کی آواز کے ساتھ ہی اُس کے چہرے کی سیاہی کچھ اور زیادہ گہری ہو گئی۔ اُس کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے۔ اُس نے بے رحمی کے ساتھ مجھے فرش کے وسط میں اچھال دیا اور خود مزید کچھ کہے بغیر تیز تیز قدموں سے وہاں سے لوٹ گیا۔

زمین پر گرنے کے بعد میں کئی منٹ تک نہ اُٹھ سکا۔ میری کمر اور کولہے کی ہڈیوں پر شدید ضرب آئی تھی۔ آخر میں نے کراہتے ہوئے سر گھمایا تو مٹی کی اس عمارت کا وہ دروازہ غائب ہو چکا تھا جس سے پچھلی رات میں اور تھوڑی دیر قبل شیو ناگ اندر داخل ہوا تھا۔ مٹی کی اونچی اونچی دیواروں پر ناقابلِ بیان ویرانی اور ڈراؤنے پن کا راج تھا۔ جاڑوں کا سردی سے کانپتا ہوا سورج کھلی ہوئی چھت میں سے جھکتا نظر آرہا تھا۔

میں کافی کوشش کے بعد لنگڑاتا ہوا زمین پر سے اُٹھا۔ حالات کی بے رحمی اور اپنی بے بسی پر میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ستارہ کی محبت ابھی تک میرے دل میں عزم کی مشعل کو فروزاں کئے ہوئے تھی۔ یونیورسٹی کی آزاد فضاؤں میں پروان چڑھی ہوئی میری محبت مجھ سے بچھڑ چکی تھی اور میں اپنی گمشدہ محبت کی تلاش میں در بدر کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ وقتی طور پر کئی بار مجھے اپنی منزل سامنے نظر آنے لگی تھی لیکن پھر بھی وہ غیر یقینی دھندلکوں میں تحلیل ہو گئی ناکامیوں، محرومیوں اور مجبوریوں کے ڈراؤنے ہیولے میرے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔ کبھی وہ ناگ راجہ کے رُوپ میں مجھے جل منڈل میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتے تھے، کبھی جل کماری کے ہوس پرست بہروپ میں اپنی محبت سے دستبردار ہونے پر مجبور کرتے تھے کبھی وہ شنکر ناتھ کے رُوپ میں میرے ہاتھوں کو پاکیزہ دوشیزہ کے خون سے آلودہ کرنے کی کوشش کرتے تھے اور کبھی شیو ناگ کے کریہہ پیکر میں مجھے راہ سے بھٹکا کر بے بس و مجبور کر دیتے تھے۔

"میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں میرے مولا!" میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بھرّائی ہوئی آواز میں کراہا۔ میری نگاہوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور میں چکرا کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

میں کافی دیر تک یوں ہی زمین پر بیٹھا رہا پھر اچانک میرے بدن پر کراہت آمیز سرسراہٹیں رینگنے لگیں۔ میں نے خوفزدہ نگاہوں سے اپنے جسم کی طرف دیکھا تو بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں غیر ارادی طور پر زمین سے اُٹھ کر ایک طرف دوڑ پڑا۔

مٹی کے اس احاطے میں زمین سے مکروہ حشرات الارض کے غول کے غول اُمڈ پڑے تھے۔ کئی کئی انچ لمبے، کلبلاتے ہوئے، سُرخ اور سیاہ کنکھجورے میرے بدن پر چڑھ کر کھال میں اپنے نوکیلے پنجے گاڑ رہے تھے۔ بڑی بڑی خون آشام جونکیں میرے بدن سے لپٹ پڑی تھیں۔

میں کرب اور خوف سے چیختا ہوا اُس بے رحم احاطے میں اندھوں کی طرح دوڑتا رہا لیکن میری آوازیں اُبھر اُبھر کر اس ویرانے میں ڈوبتی رہیں۔ وہاں کوئی نہ تھا جو میری مظلومیت پر رحم کھاتا۔

آخر کار میں بُری طرح تھک کر، ہانپتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ خون آشام کیڑے مجھ پر فتح پا چکے تھے میرے ہاتھ پیروں کی ناکام حرکتیں انہیں نہ روک سکیں اور وہ میری جلد میں پیوست ہو کر میری شریانوں میں دوڑتا ہوا گرم گرم، زندہ خون چوسنے لگے، ناقابلِ برداشت ٹیسیں میرے ایک ایک ریشے میں سرایت کرنے لگیں۔ نقاہت کی چادر تیزی کے ساتھ میرے حواس کے گرد لپٹتی جا رہی تھی اور مجھے شیو ناگ کے بھیانک عزائم پورے ہوتے نظر آرہے تھے۔

دو دن اور دو طویل راتیں میں نے زندگی اور موت کے درمیان گزاریں۔ وہ خون آشام حشرات الارض میری شریانوں سے جوہرِ حیات چوس کر ذرا ہی دیر میں غائب ہو گئے تھے۔ اس کے بعد میں زمین پر رینگ رینگ کر اپنی تکلیف کو بھلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن بے سود۔ بھوک اور پیاس سے نقاہت کا احساس اور گہرا ہوتا رہا۔ رات کی سخت سردی میں پیاس کے باعث میری زبان حلق سے باہر نکل پڑی۔ آنکھوں میں درد کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ سر میں شدید دھمک ہو رہی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا کی تمام صعوبتیں شیو ناگ کے اشارے پر یکجا ہو کر مجھ پر ٹوٹ پڑی ہوں۔

تیسری شام ایک سیاہ رنگ کا بڑا سا پرندہ آسمان پر پرواز کرتا اس احاطے میں آیا۔ پروں کی پھڑپھڑاہٹ پر میں نے چونک کر آنکھیں پھاڑیں مجھے ایک موہوم سا خیال گزرا کہ شاید میں مر چکا ہوں اور کوئی مُردہ خور گدھ میری بُو پاکر اپنی چونچ سے لاش اُدھیڑنے کے لئے آپہنچا ہے لیکن میرا خیال جلد ہی باطل ثابت ہو گیا۔ وہ سیاہ پرندہ زمین پر اُترتے ہی کریہہ چیخ مار کر خاک میں پھڑپھڑایا اور اگلے ہی لمحہ میں وہاں میرا ازلی دشمن شیو ناگ موجود تھا۔

وہ تضحیک آمیز انداز میں مسکراتا ہوا میرے قریب آیا اور میری ہونٹوں سے باہر لٹکی ہوئی زبان کو زور سے کھینچ کر بولا "تو سمجھ رہا ہے کہ اب جلد ہی مر جائے گا مگر ایسا نہ ہونے دوں گا۔"

میری نگاہوں میں فریاد اور التجا سمٹ آئی لیکن اس کے چہرے پر رحم کے آثار نظر نہ آئے۔ اس وقت پہلی بار وہ اندھا محسوس ہو رہا تھا جوشِ انتقام میں وہ ہر لطیف جذبے کو خیرباد کہہ چکا تھا۔

اُس کے ایک اشارے پر، پُراسرار طور پر، کہیں سے ایک دُبلا پتلا منحنی سا شخص ایک صراحی اور پیمانہ لئے نمودار ہوا۔ اُس کے پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ قریب آکر اُس نے صراحی سے زردی مائل سیال شیشے کے پیمانے میں اُنڈیلا اور پیمانہ میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے دل میں سوچا کہ اپنی تمام تر بہیمیت اور درندگی کے باوجود بھی شیو ناگ کے دل میں رحم کی رمق موجود ہے، میں نے نقاہت سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے، بے صبری کے ساتھ وہ پیمانہ لیا۔ انگور کی شراب کی لطیف بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی، میں نے بیتابی کے ساتھ پیمانہ اپنے پیاسے ہونٹوں کی طرف بڑھایا۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ کے باعث پیمانے میں سے آدھی شراب زمین پر گر چکی تھی۔

جوں ہی شراب کا وہ ساغر میرے ہونٹوں کے قریب پہنچا اور میری باہر لٹکی ہوئی پیاسی زبان پیمانے کو چھونے کے لئے آگے کی طرف لپکی شیو ناگ کی داہنی ٹانگ حرکت میں آئی اور شیشے کا پیمانہ میرے ہاتھوں سے اُڑ کر خاک پر گر کر بے شمار ننھے ننھے ریزوں میں تبدیل ہو گیا۔

میری آنکھوں میں یک بیک نفرت کے الاؤ دہک اُٹھے اور پیاس

ایک دم ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ حلق میں کانٹوں کی چبھن اور آنتوں میں شدید اینٹھن ہونے لگی۔

میرا جی چاہا کہ میں اپنے دانتوں سے شیوناگ کا نرخرا چیر ڈالوں اور اُس کے ناپاک خون سے اپنا گلا تر کر دوں لیکن میں بے بسی کے ساتھ زمین پر پڑا، غصّے کے عالم میں کانپتا رہا۔ میرے لئے اپنی جگہ سے جنبش کرنی بھی دشوار تھی۔ پھر شیوناگ کے اشارے پر وہ منحنی شخص میری پیاسی زبان سے ذرا دُور، صراحی سے شراب کے قطرے خشک زمین پر ٹپکانے لگا۔ میں نے سخت اذیت کے باوجود اپنے بدن کو قدرے آگے گھسیٹا تاکہ شراب کی ایک آدھ بوند ہی سے اپنا حلق تر کر سکوں لیکن وہ سفاک شخص صراحی کو اور پیچھے ہٹا لے گیا۔ اُس کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔

میں کافی دیر تک یونہی ترستا رہا، اُس نے صراحی کا آخری قطرہ تک پیاسی زمین پر اُنڈیل دیا لیکن میری اینٹھی ہوئی زبان کو اس کی حیات آفریں نمی تک نہ پہنچنے دی۔

سورج ڈھلنے تک شیوناگ مجھے ستا ستا کر، میرے احساس بے بسی کو بیدار کر کے خوش ہوتا رہا اور جب ہر سُو ظلمات کی چادر پھیل گئی تو اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا، فضا میں گرد و غبار کا ایک مہیب بگولا بلند ہوا۔ میرے حلق اور نتھنوں میں مٹی کے ذرّات کے باعث خارش ہونے لگی۔ کھانسی کے ہر دورے کے ساتھ مجھے اپنی خشک آنتیں حلق میں آتی محسوس ہو رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔

جب غبار کا وہ طوفان تھما تو میں نے دیکھا کہ چھت کے سائے سے محروم مٹی کی دیواروں والا وہ احاطہ سیاہ پتھر سے بنے ہوئے ایک مندر میں بدل چکا ہے۔ در و دیوار پر، ہر طرف دیوی دیوتاؤں کے شرمناک مجسّمے اُبھرے ہوئے تھے۔ دیوار گیر مشعلوں کی روشنی میں پتّھر کا ہر بُت انسان میں چھپے ہوئے حیوانی جذبوں کی علامت بنا ہوا تھا۔

اس مندر کے ایک سرے پر لکڑی کی اونچی سی مسند تھی جس کے قریب ہی دیوار میں ایک قدِ آدم طاق نظر آ رہا تھا۔ شیوناگ نے نیچے جھک کر بے رحمی کے ساتھ میرا ہاتھ تھاما اور میرے زخمی بدن کو پختہ فرش پر گھسیٹتا اس طاق کی طرف لے چلا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے میری بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے اس طاق میں بٹھا دیا۔ اس وقت نقاہت اور پیاس کے باعث میرے لئے سیدھا رہنا دشوار تھا، میری ریڑھ کی ہڈی کے مہرے اپنی جگہ سے سرکتے محسوس ہو رہے تھے لیکن شیوناگ کی پُراسرار قوتوں کے زیرِ اثر میں اس طاق میں سیدھا بیٹھا رہا۔

پھر شیوناگ میرے سامنے کھڑا ہو کر بلند آواز میں کچھ اجنبی بول پڑھنے لگا۔ میرے بدن سے آہستہ آہستہ رہی سہی توانائیاں بھی تحلیل ہونے لگیں اور جب وہ خاموش ہوا تو میں دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے علاوہ ہر قوت سے محروم ہو چکا تھا۔

خوف اور آنے والے لمحوں کی دہشت سے میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ میں عمل کی قوتوں سے محروم ہو چکا تھا اور آثار سے صاف ظاہر تھا کہ شیوناگ اب وہ سب کرنے والا ہے جس کے تذکرے ہی سے میرے وجود میں تھرتھری پیدا ہو گئی تھی۔ شاید چکر پُوجا شروع ہونے والی تھی۔

اِس پُرہیبت مندر میں سکوت کے کچھ لمحے اور گزرے پھر فضا کسی نادیدہ سنکھ کے شور سے گونج اٹھی۔ اسی کے ساتھ مجھے مندر کی فضا میں عجیب سی بے چینی اُبھرتی محسوس ہوئی جیسے کچھ نامعلوم اور پُراسرار سائے مندر کی فضا میں اِدھر اُدھر سرسراتے پھر رہے ہوں۔

آخر کار سنکھ کی وہ آواز دم توڑ گئی۔ شیوناگ یک بیک فضا میں اُچھلا اور چھت کی گولائی میں اُبھرے ہوئے کالی کے مجسّمے کو چھوتا ہوا مندر کے دروازے کے قریب فرش پر جا ٹکا۔ باہر بہت سے قدموں کی غیر فطری آہٹیں گونج رہی تھیں۔ اُن کا آہنگ بتا رہا تھا کہ آنے والوں کا رُخ اسی جانب ہے۔

پھر یک بیک میرا دل دھڑک کر حلق میں آ گیا۔ میں نے چیخنا چاہا لیکن آواز ساتھ چھوڑ چکی تھی، میری آنکھیں دہشت، مسرت، خوف اور بے بسی کے ملے جلے امتزاج سے کشادہ ہو گئیں۔

اس دروازے سے میری محبوب بیوی، ستارہ مندر میں داخل ہو رہی تھی۔ تقریباً ایک برس کی طویل مدت کے بعد میری پیاسی اور بیقرار نگاہوں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ اجنبی دنیا کی قیدی تھی اور آج پہلی بار آزاد فضاؤں میں نظر آئی تھی۔ اُس کی لمبی لمبی غزالی آنکھوں میں بلا کی تازگی اور معصومیت رچی ہوئی تھی۔ چہرے پر حیا کی سُرخی شفق کے دلفریب لہریئے بکھیر رہی تھی، اُس کا سبک اور گداز بدن آج بھی یوں ہی رعنائی کا شاہکار نظر آ رہا تھا جیسے اُس کے بدن پر کسی کی نظریں تک نہ پڑی ہوں اُس کے انداز خرام میں بلا کی بے نیازی اور عزم نمایاں تھا۔ چہرے پر گمبھیر سنجیدگی طاری تھی۔ اور ہونٹ قدرے بھینچے ہوئے تھے اُس کا سیاہ لباس اُس کے حُسن کو سوز اور جلا بخش رہا تھا۔

اُس کے پہلو میں ہی ایک طویل قامت اور خوبرو مرد چلا آ رہا تھا۔ اس کے شانے چوڑے اور بدن کسرتی تھا۔ رنگ سرخ و سپید اور نقوش دلفریب تھے سرخ بالوں کے خمدار لہریوں کے نیچے کشادہ پیشانی پر سیاہ رنگ کا ایک ننھا سا داغ تھا۔ اُس کی نیلگوں آنکھوں میں جوش اور جوانی کی چمک نمایاں تھی۔ اونچی سی عقابی ناک کے نیچے پتلے پتلے ہونٹوں پر زندہ مسکراہٹ رقصاں تھی اور اس کا داہنا ہاتھ میری پیاری بیوی، ستارہ کی کمر کے گرد حائل تھا۔

جوں ہی وہ دونوں اندر گھسے شیوناگ نے بے اختیار مرد کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اُس نے تکبّر اور نخوت کے ساتھ شیوناگ کے سر پر بالوں کی جگہ اُگے ہوئے ننھے ننھے بے شمار سانپوں کو اپنے ہاتھ سے چھُوا اور مسند کی طرف بڑھنے لگا۔ ستارہ کی آنکھیں بے قراری کے ساتھ اس مندر میں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اُس نے کئی بار میری جانب دیکھا لیکن اس کی نگاہیں سرسری طور پر مجھ سے پھسلتی چلی گئیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یا تو وہ مجھے پہچان ہی نہیں سکی ہے یا شیوناگ کی پُراسرار قوتوں کے زیر اثر میں اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہوں۔

ستارہ اور اُس کے ہمراہی کے پیچھے حسن و شباب کا نگاہوں کو خیرہ کر دینے والا ایک ہجوم تھا جس میں بہت سی نوجوان اور طرح دار لڑکیاں سروں کو ادب سے جھکائے چلی آ رہی تھیں۔ اُن کے بعد مردوں کا ایک گروہ اندر آیا۔ وہ سب بھی وجاہت اور مردانگی کے اعتبار سے ہزاروں میں یکتا تھے!

جب یہ جلوس اندر داخل ہو گیا تو ستارہ کا ہمراہی مرد، تحکمانہ انداز میں چوبی مسند پر بیٹھ گیا۔ شیوناگ اُس کے قدموں میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ستارہ کھوئے کھوئے انداز میں اپنی جگہ کھڑی بے چینی سے کسی کو تلاش کرتی رہی اور جب اُسے کوئی شناسا نظر نہ آیا تو اُس کی آنکھوں میں محرومی کے سائے لرزنے لگے۔

"کہاں ہے.... وہ مجھے تو کہیں نظر نہیں آتا!" ستارہ مسند نشین کی طرف مڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور میرا رواں رواں کانپ اُٹھا۔ شاید اس بدنصیب کو مجھ سے ملاقات کا فریب دے کر چکر پُوجا کے لئے یہاں تک لایا گیا تھا۔ میرے دل میں ہوک سی اُٹھی۔ میرا جی چاہا کہ لپک کر ستارہ کو سینے سے لگا لوں۔ چیخ کر اسے بتاؤں کہ میں اُس کی نگاہوں کے سامنے عذاب اور محرومی میں مبتلا کر کے طاق میں سجا دیا گیا ہوں لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ شیوناگ کی ہر پیشین گوئی درست تھی۔ میرے اعصاب پر موت کا سا جمود چھایا ہوا تھا۔

"اسے بھُول جاؤ ستارہ" مسند پر بیٹھے ہوئے شخص نے بارعب آواز میں اس سے کہا "وہ ہرجائی تھا، وہ تمہیں بھُول کر اپنی راتیں لڑکیوں کے ہجوموں میں گزار رہا ہے اور اب اِس کی آوارگی رنگ لا رہی ہے۔ وہ کسی خارش زدہ پلے کی طرح موت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے اور موت اس کے سائے تک سے خوفزدہ ہے۔"

"نہیں نہیں۔ تم جھوٹے ہو!" وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو پڑی "سلطان ایسے نہیں ہو سکتے۔ وہ مر کر بھی بے وفائی نہیں کر سکتے، بتاؤ وہ کہاں ہیں!"

"سنکھ شروع کر دو!" مسند والے نے ستارہ کو نظر انداز کرتے ہوئے بے رحمانہ آواز میں کسی کو حکم دیا اور مندر کی فضا سنکھ و ناقوس کی منحوس آوازوں سے لرز اٹھی۔

ستارہ روتی ہوئی، زمین پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے درمیان جا گری، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا دل کٹ رہا ہو۔ میں تیز چھریوں کی دھار اپنے ہر سانس کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ وہ لوگ بلا کے سنگدل اور سفاک تھے۔ ان کے نزدیک نہ جذبے قابلِ احترام تھے نہ آبرو کی قدر تھی۔ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ مسند پر بیٹھا ہوا شخص ہی ناگ راجہ ہے۔ وہی میرا رقیب اور ستارہ کی آبرو کا دشمن ہے اس نے ستارہ کو زیر کرنے کے لئے یہ بھیانک کھیل رچایا ہے۔

ناگ راجہ کی مسند کے عقب میں شیودیو کا ایک بے ہنگم اور کراہت آمیز سنگی مجسّمہ نصب تھا اس کے دائیں بائیں اس کی عورتوں کے حیا سوز مجسّمے سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ پاربتی کا بدن لباس سے یکسر محروم اور پوری طرح نمایاں تھا، درگا مائی، کالی دیوی اور راد مادیوی کے مجسّمے بھی اس سے کچھ کم نہ تھے۔ ان سنگی دیوی دیوتاؤں کے ہوس میں ڈوبے ہوئے وہ پیکر، مندر میں موجود مردوں اور عورتوں کی آنکھوں میں جھانکتے عزائم کی خاموش تصویریں تھیں۔

سنکھ کی بھیانک آواز زیر و بم کے ساتھ اُبھر رہی تھی۔ مندر کے فرش پر بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکیوں کے چہرے آتش شوق سے بھبھوکا ہوئے جا رہے تھے۔ خمار کی سُرخی میں ڈوبی ہوئی آنکھیں حریصانہ انداز میں شیودیو کے کراہت آمیز مجسّمے کی جانب نگراں تھیں۔ مردوں میں بھی دباد با ہیجان پھیلا ہوا تھا۔ ان کے کانپتے ہوئے ہونٹ، پھڑکتے ہوئے بازو اور بے چین بدن مجھے آنے والے لمحوں کی اَن کہی کہانی سُنا رہے تھے۔

میری محبوب بیوی ستارہ اس ہجوم کے درمیان میں دیوانوں کی طرح ہکا بکا ایک ایک کا منہ تک رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ اس اجتماع کا مقصد ابھی تک نہیں سمجھ سکی ہے۔

پھر یک بیک سنکھ کی آواز تیز ہوئی اور اسی کے ساتھ شیوناگ پُوری قوت سے ایک چیخ مار کر اُٹھ گیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں اچانک سُست پڑ گئیں۔ میں نے اپنی آنکھیں کھینچ لینی چاہیں لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ میرے پپوٹے کسی نادیدہ قوت کے زیرِ اثر مستقل کھلے ہوئے تھے۔

شیوناگ کے یوں اُٹھتے ہی مندر میں ایک گھناؤنا کھیل شروع ہو گیا۔

——— چکر پُوجا کی لرزہ خیز تفصیل اور کہانی کا چونکا دینے والا موڑ

——— ستارہ کی مجبوری اور سلطان محمّد خاں کی جانکنی

——— ناگ پھَوَن کا بھولا ہوا نام کیا دوبارہ سلطان محمّد خاں کو یاد آسکا

یہ تمام سنسنی خیز واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے۔

برن

کے پہلے جام پر اسے رخشاں یاد آئی۔ دبلی پتلی کامنی سی لڑکی، جس کی کمر کی تلاش میں خاصی دقت پیش آتی تھی۔ اس کے ڈھلے ڈھلے چہرے پر الجھے ہوئے سیاہ اور چمکدار بال کیسے حسین لگتے تھے اور اس کے مسکراتے ہونٹ جو کسی کو غلط فہمی میں ڈال دینے کے لئے کافی تھے اور اس کی غلافی آنکھیں اور ... اُف۔ اس نے پریشان ہو کر بیرے کو اشارہ کیا اور برن کا دوسرا جام طلب کر لیا۔! دوسرے جام میں اس نے رخشاں کی یاد ڈبو دی اور جب رخشاں کا وجود شراب میں حل ہو گیا تو اس نے وہ جام حلق میں انڈیل لیا۔

رخشاں معدے میں اتر گئی، لیکن سامنے بیٹھی ہوئی لمبے قد کی حسین سی لڑکی نے سمن کے نقوش اجاگر کر دیئے۔ سمن، وہ شرمیلی سی لڑکی جس کا قد دراز تھا اور جب وہ شاخ گل کی طرح لچکتی ہوئی چلتی تو بہت سے دل اس کے قدموں میں لوٹنے لگتے اور جب سمن نے لجاتے ہوئے خود کو اس کے سپرد کر دیا تو وہ دنیا کو بھول بیٹھا۔ اسے کچھ یاد نہ رہا اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ سمن کے ساتھ شادی کر لے گا اور اپنے وجود کی اس تشنگی کو مٹا دے گا جو اسے بے کل رکھتی ہے۔ سمن ہو گی اور وہ۔ اور ایک خوبصورت ماحول۔ لیکن لڑکیوں کے بارے میں اس کے تجربات بیحد تلخ تھے۔ نہ جانے کیوں یہ لڑکیاں ہوا کے جھونکوں کی طرح آتی ہیں، زندگی میں ہلچل مچاتی ہیں اور پھر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ سمن بھی ہوا کا ایک جھونکا تھا جس نے اس کی زندگی کے چند لمحات معطر کیے اور پھر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ افوہ۔ کس قدر بیقرار رہا تھا وہ اس کے لئے ... اور جب اس کا نشان نہ مل سکا تو اس نے سمن کی یاد کو دل سے کھرچ پھینکنے کی کوشش شروع کر دی۔ بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے اس کو بھلانے میں۔ اس کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ کسی لڑکی کو دل سے قریب آنے دیگا۔ اور وہ اس فیصلے پر عمل پیرا تھا۔ بیشمار لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں لیکن وہ غور سے ان کی شکل بھی نہیں دیکھتا تھا۔ وہ کسی لڑکی کو اب ذہن میں جگہ دینے کیلئے تیار نہیں تھا لیکن اس وقت برن کے سرور نے اس کے ذہن میں بیشمار یادیں تازہ کر دیں۔ یہ کیسی شراب ہے؟۔ اس نے برن کے تیسرے جام کو گھورا۔ شراب تو سکون بخشتی ہے، یادوں کو بھلانے میں ساتھ دیتی ہے لیکن یہ شراب ان یادوں کو لاشعور سے شعور میں لا رہی ہے۔ اس نے جام ایک طرف سرکا دیا جیب سے چند نوٹ نکالے جو شراب کی قیمت سے کہیں زیادہ تھے اور انہیں میز پر پھینک کر اٹھ گیا۔ اس نے دراز قد لڑکی کو دیکھا جو اپنے ساتھی سے ہنس ہنس کر گفتگو کر رہی تھی اور اس کا ساتھی محبت بھری نظروں سے ان چمکتی ہوئی آنکھوں اور دمکتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا!۔

بے وقوف کہیں کا۔ اس بات سے بے خبر ہے کہ کچھ عرصے کے بعد یہ مسکراہٹ قصہ پارینہ ہو گی۔ یہ ہنسی خواب بن جائے گی۔ اس نے ان کے نزدیک سے گزرتے ہوئے سوچا اور بار سے نکل آیا۔!

اس کی خوبصورت اسپورٹس کار سڑک پر دوڑنے لگی۔ ابھی تو رات کی رنگینیاں ابھری تھیں، بلکہ بعض جگہوں پر تو ابھی رات شروع بھی نہیں ہوئی تھی، وہ سڑکوں پر چکراتا پھرتا رہا۔ کہاں جائے؟ کیا کرے؟ گھر جانے کو ابھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہاں ہے ہی کون۔ سوائے بوڑھی ملازمہ کے، جو اسے ماں کی طرح چاہتی ہے، لیکن جو اپنی حدود سے کبھی آگے نہیں بڑھی، شاید اس کی خشک فطرت کی وجہ سے۔ اس نے آج تک بوڑھی سے کوئی غیر ضروری بات نہیں کی تھی۔ صرف کھانا مانگتا، اس کی ضروریات پوچھتا، اور بس!

شہر کے ایک بارونق علاقے میں اس نے کار ایک فٹ پاتھ کے سہارے روک دی۔ اچانک ہی اس کا دل چہل قدمی کرنے کے لئے چاہا تھا وہ انجن بند کر کے نیچے اتر آیا اور چابی گھماتا ہوا فٹ پاتھ پر آگے بڑھنے لگا اسکی نظریں جگمگاتی دوکانوں میں سجے ہوئے شوکیسوں اور ان شوکیسوں پر منڈلاتی ہوئی حسین تتلیوں کو گھور رہی تھیں، ہر چہرہ مسرور، زندگی سے پر تھا وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔ یہ کونسی دنیا کے لوگ ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں یہ سب۔ ان کی مسرت کا راز کیا ہے۔ کیا غم دنیا ان سے کترا کر نکل گیا ہے۔؟ مگر کیوں، کیسے۔؟ وہ ان چہروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ ان کی اصلیت تلاش کر رہا تھا۔

اس کے اس طرح گھورنے سے مختلف لوگوں کے مختلف ردِ عمل ظاہر ہوتے۔ خوبصورت لڑکیوں کے بدصورت ساتھیوں نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا۔ جوان بیویوں کے بوڑھے شوہر گھبرائے ہوئے انداز میں بیویوں کے بازو پکڑ کر آگے بڑھ گئے جیسے جتا رہے ہوں کہ وہ جیسے بھی ہوں، یہ حوریں ان کی ملکیت ہیں۔ حسین لڑکیوں کی گردنیں تن گئیں، غرور حسن کچھ اور بڑھ گیا۔ چہرے کچھ اور تمتما گئے۔ لیکن اسے بدصورت ساتھیوں کے ساتھ ان خوبصورت لڑکیوں کی موجودگی پر حیرت نہ ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ ان کے چہروں کا حسن جیبوں میں چھپا ہوا ہے، بوڑھے شوہر کے ساتھ نوجوان اور حسین بیوی کے چہرے پر مایوسی اور غم کے تاثرات نہ دیکھ کر اسے کوئی اچنبھا نہ ہوا۔ شوہر بوڑھا ضرور تھا لیکن اس کی کار جوان سڈول اور خوبصورت تھی اور سڑکوں پر خوب تیز دوڑتی تھی۔ کیا ہوا شوہر بوڑھا ہے۔ اس کے قویٰ کمزور ہیں، اسے پیدل تو بھاگنا نہیں ہے۔!

وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سب اسی دنیا کے لوگ ہیں۔ انکے دمکتے ہوئے پرسکون چہروں کے نیچے درد کا دریا موجزن ہے لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے یہ تلاطم چھپا رکھے ہیں۔ بلاشبہ وہ باکمال لوگ ہیں!۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔ اور اچانک اسے اپنی پشت پر ایک مترنم آواز سنائی دی۔

"ایک پیسہ بابو جی۔!"

ان آوازوں سے کہیں چھٹکارہ نہیں ہے۔ عام حالات میں ان آوازوں پر توجہ دینا ضروری بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اس آواز کے ترنم نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اور۔ وہ دیکھتا رہ گیا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

بھکارن بالکل نوجوان تھی، بے حد حسین تھی لیکن اس کے ساتھ چالاک بھی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر غلاظت کی تہیں چڑھا رکھی تھیں۔ اسکی نرگسی آنکھوں میں بے تحاشہ بھرا ہوا کاجل گالوں کو بھی سیاہ کر گیا تھا۔ چہرے پر گرد کی میلی تہہ چڑھی ہوئی، جس نے اس کا اصل رنگ چھپا دیا تھا ورنہ وہ رنگ کندنی تھا، شہابی تھا اور اس جلد کے نیچے خون کے گلابی دریا موجزن تھے۔ یاقوت کی طرح سرخ ہونٹوں پر کتھے کی گندی تہہ موجود تھی اور سنگ مرمر سے ترشے ہوئے جسم پر میلے چیکٹ ڈھیلے ڈھالے کپڑے تھے جن سے ہلکا سا تعفن اٹھ رہا تھا۔ بلاشبہ کوئی عام نگاہ اسے نظر انداز کر سکتی تھی لیکن وہ حسن شناس تھا۔ بلاشبہ یہ لڑکی وہ نہ تھی جو خود کو ظاہر کر رہی تھی۔ اسے اپنی قیامت خیز جوانی کا احساس تھا، اسے اپنے بے پناہ حسن کا احساس تھا۔ لیکن اس کی مجبوریاں اسے بھیک مانگنے پر مجبور کر چکی تھیں۔ نہ جانے کیا کہانی ہو۔ نہ جانے کیا حالات ہوں۔ اس کے دل میں بے اختیار ایک خواہش مچل اٹھی، اس کی مدد کرے اور اس سے اس کا راز معلوم کرے۔ اور وہ اس خواہش کو دبا نہ سکا۔

"ایک پیسہ بابو جی۔" بھکارن کی آواز پھر گونجی۔

"کیا کرو گی ایک پیسے کا۔؟"

"بھوکی ہوں بابوجی۔ چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں۔"

"کہاں ہیں بہن بھائی؟"

"گھر پر ہیں بابوجی۔ ایک پیسہ۔" بھکارن نے مخصوص آواز میں کہا

"میرے ساتھ چلو۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا اور بھکارن عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ "چلو گی۔؟" اس نے پوچھا اور بھکارن نے اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ حیران رہ گیا۔ اسے بھکارن کے اس طرح راضی ہوجانے کی امید نہیں تھی۔ جس جوانی کو اس نے چھپانے کی کوشش کی تھی، اسے لٹانے پر کیوں آمادہ تھی۔ کوئی بھی شخص اس طرح دھوکہ دے کر لیجا سکتا تھا اور اس کا تمام مجاہدہ خاک میں ملا سکتا تھا۔ یا پھر۔ وہ ہے ہی پیشہ ور۔!

لیکن اسے خود ہی اپنے اس خیال کی تردید کرنا پڑی۔ اگر وہ پیشہ ور ہوتی تو اس کے حسن و جوانی کے آگے بہتوں کے چراغ گل ہوجاتے۔ وہ لاکھوں کماتی، اس طرح سڑکوں پر بھیک نہ مانگتی۔ پھر۔ وہ شاید بہت معصوم ہے اس کا واسطہ دنیا کے درندوں سے نہیں پڑا ہے۔ ممکن ہے وہ اس پیشے میں بالکل نئی ہو۔! اوہ۔ اچھا ہوا وہ کسی اور کے ہاتھ نہیں لگی ورنہ نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔ "آؤ۔" اس نے کہا اور بھکارن اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ فٹ پاتھ پر چلنے والے بہت سے لوگوں نے بھکارن کو کار میں بیٹھتے دیکھ کر آوازے کسے لیکن اس کا ذہن ان آوازوں کی طرف متوجہ نہیں تھا وہ تو پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی بھکارن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اگر وہ غسل کر کے ایک خوبصورت لباس پہن لے تو حسن کی اعلیٰ مثال بن جائے۔ کیا وہ اس کی اصل شکل دیکھ سکے گا اور کیا وہ اس پر آمادہ ہوجائے گی۔ ممکن ہے اچھے لباس کا لالچ اسے خود سے بیگانہ کردے، اور اگر وہ تیار نہ ہوئی تو۔!

اونہہ۔ دیکھا جائیگا۔ وہ اسے بُری نیّت سے نہیں لایا تھا اسے صرف حقیقت جاننے کی خواہش تھی۔ اگر وہ بتانے پر تیار ہوگئی تو ٹھیک ہے ورنہ اسے کچھ دے دلا کر ٹال دے گا۔

کار برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی اس کے چھوٹے سے بنگلے میں داخل ہوگئی۔ پورٹیکو میں کار روک کر اس نے بھکارن سے نیچے اترنے کے لئے کہا اور وہ دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔

"آؤ۔" وہ صاف لہجے میں بولا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی اندر پہنچ گئی! بوڑھی ملازمہ نے حیرت سے اسے دیکھا تھا لیکن اس کی کچھ سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ "اسے اپنا کوئی لباس دو اور غسل خانے لیجاؤ۔" اس نے ملازمہ کو حکم دیا اور خود اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے لباس تبدیل کیا اور سلیپنگ سوٹ پر گون پہننے کے بعد

ایک آرام کرسی پر دراز ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ملازمہ نے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔

"آجاؤ۔" اس نے کہا اور ملازمہ اندر داخل ہوگئی۔ "کیا بات ہے؟" اس نے ملازمہ کے چہرے پر ہچکچاہٹ دیکھ کر پوچھا۔

"وہ غسل کرنے کے لئے تیار نہیں ہے جناب، کپڑے بھی نہیں بدل رہی۔"

"ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ شاید اسے خطرے کا احساس ہوگیا۔ اس نے دل میں سوچا۔ پھر ملازمہ سے بولا "ٹھیک ہے اسے لے آؤ۔" اور ملازمہ باہر نکل گئی۔ چند لمحات کے بعد وہ ہچکچاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر وہی معصومیت پھیلی ہوئی تھی۔ ملازمہ اسے چھوڑ کر واپس چلی گئی اور وہ اُسے گھورتا رہا۔ "تم نے لباس کیوں نہیں بدلا؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے لباس نہیں چاہیئے بابوجی۔ کچھ پیسے دیدیجئے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بہن بھائی بھوکے ہیں۔" اس نے کہا۔

"یہاں آتے وقت تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں تمہارے ساتھ دھوکہ بھی کرسکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ لیکن بھکارن نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔؟" چند لمحات کے بعد اس نے پوچھا۔

"اللہ رکھی!" بھکارن نے جوابدیا۔

"میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنے حسن پر گندگی کا غلاف کیوں چڑھایا ہے۔ کیا ہوس پرست نگاہوں سے بچنے کے لئے۔؟ اگر تمہارے ذہن میں یہ خیال تھا تو پھر تم اس طرح میرے ساتھ کیوں چلی آئیں۔ یہاں تم تنہا ہو اور میں تمہارے ساتھ برا سلوک بھی کرسکتا ہوں۔"

"میرا نام اللہ رکھی ہے بابوجی۔ میرا نام میری حفاظت کا ضامن ہے۔ آپ براہ کرم میری مدد کردیں میں اپنے بہن بھائیوں کے لئے۔۔"

"کسی اور کے ساتھ اس طرح کبھی نہیں جانا اللہ رکھی۔ تم بیحد خوبصورت ہو۔ کوئی بھی تمہیں دیکھ کر مچل سکتا ہے۔ میں بھی تمہارے حسن سے بے اختیار ہوگیا ہوں، لیکن میں تمہاری مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھاؤں گا البتہ میں تمہاری اصل سیکھنے کا خواہشمند تھا، کیا تم اپنے چہرے سے یہ غلاف ہٹا کر سامنے نہیں آؤ گی؟"

"اللہ کے نام پر بابوجی" اس نے تمام باتوں کے جواب میں کہا۔

"صرف چند منٹ اللہ رکھی۔ صرف چند منٹ مجھے دیدو۔

مجھے اپنے بارے میں بتادو۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ کام کیوں شروع کیا؟"

"غریبوں کی ایک ہی کہانی ہوتی ہے بابوجی۔ کسی بھی غریب کی کہانی تصوّر کرلو۔ کسی بھی مجبور کا خیال کرلو۔ میری کہانی تمہیں خود بخود معلوم ہوجائے گی۔ میں زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔ مجھے جانا ہے بابوجی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور وہ ششدر رہ گیا۔ اس نے کیسے حقیقی الفاظ میں اپنی کہانی بیان کردی تھی۔

وہ اسے دیکھتا رہا۔ اور اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ اس بھکارن کے اعتماد کو آزمایا جائے۔ کم از کم دیکھا تو جائے کہ وہ اپنی حفاظت کس طرح کرتی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک دلچسپ تجربہ ہوگا اور وہ اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ وہ خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھا، اور اس نے دروازہ بند کردیا۔ بھکارن جو پہلے اس کے اٹھنے کا مطلب نہیں سمجھی تھی، دروازہ بند ہوتے دیکھ کر بُری طرح چونک پڑی۔ وہ دروازہ بند کرکے مڑا اور بھکارن کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"میں تمہیں بہت کچھ دوں گا لڑکی۔ اتنا کچھ کہ پھر تمہیں بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن میں تمہاری اصلیت بھی ضرور دیکھوں گا میں یہ بات معلوم کئے بغیر نہ رہوں گا کہ تم اتنے اعتماد سے یہاں تک کیسے چلی آئیں"

"غریب پر ظلم مت کرو بابوجی۔" وہ لجاجت سے بولی۔

"میں تمہارے اوپر ظلم نہیں کروں گا۔ لیکن۔!" وہ آگے بڑھا اور بھکارن پیچھے ہٹ کر دیوار سے چپک گئی۔ "لیکن میں تمہیں تمہاری اصل شکل میں ضرور دیکھوں گا۔ یہ لباس اتار دو۔ وہ باتھ روم ہے وہاں جا کر منہ ہاتھ دھولو۔ اور پھر میرے ساتھ کچھ وقت گزارو۔ بولو تیار ہو؟"

"نہیں بابوجی۔ نہیں۔ ہم پر ظلم مت کرو۔" بھکارن بدستور التجا بھرے لہجے میں بولی۔ وہ دیوار سے چپکی کھڑی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس کے چہرے پر خوف کے آثار اب بھی نہیں تھے۔

وہ آگے بڑھتا رہا اور پھر وہ بھکارن کے بالکل قریب پہنچ گیا

"تمہیں یہ لباس اتارنا ہوگا۔" وہ بولا اور اچانک اس نے بھکارن کے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک تیز چمک پیدا ہوگئی اور جوں ہی اس کے ہاتھ بھکارن کے لباس کی طرف بڑھے، اچانک وہ سانپ کی طرح بل کھا گئی اس کا نرم و نازک ہاتھ اس کی گردن کی رگ پر پڑا اور ایک لمحے کیلئے اس کا ذہن جھنجھنا گیا۔ یہ کراٹے کا ہاتھ تھا۔ اگر ہاتھ نرم و نازک نہ ہوتا تو وہ یقیناً بیہوش ہوگیا ہوتا لیکن پھر بھی اس کی آنکھوں میں تاریکی چھاگئی اور بھکارن تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔ اب وہ دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کرکے گردن جھٹکی اور پھر منہجرانہ انداز میں سامنے کھڑی بھکارن کی طرف دیکھا۔ لیکن اب اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا خوبصورت پستول نظر آرہا تھا۔ جس کا رخ اسی کی طرف تھا۔ بھکارن کا چہرہ اب بھی پرسکون تھا اور اس کے خوبصورت ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچی ہوئی تھی۔ وہ پستول دیکھ کر اور بھی حیران ہوگیا۔!

"اس تجربے کے لئے میں تمہارا شکریہ ضرور ادا کروں گی۔ اور اب تمہیں میرے چند سوالات کے جواب دینا ہوں گے۔" بھکارن کی مترنم آواز سنائی دی۔ وہ اس دلچسپ لیکن حیرت انگیز سچویشن سے پوری طرح متاثر تھا۔ بھکارن کا یہ دوسرا روپ پہلے سے کہیں زیادہ حیرت انگیز تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" بھکارن نے پوچھا۔

"احمد ناصر۔!" اس نے جوابدیا۔

"کیا کرتے ہو؟"

"سرکاری ملازم ہوں۔"

"تنہا ہو۔؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"اس کا کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس۔"

"اس سے قبل بھی میری جیسی لڑکیاں یہاں آتی رہی ہیں؟"

اس سوال کے جواب میں وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔ "نہیں۔ تم اپنی نوعیت کی پہلی لڑکی ہو۔"

"وضاحت کرو۔"

"یہاں لڑکیاں آتی رہتی ہیں۔ یہاں رخشاں بھی آئی تھی جسے میں نے پسند کیا تھا اور پھر سمن بھی، رخشاں کی بیوفائی کے بعد میں نے خود کو سمن میں گم کردیا تھا، لیکن وہ بھی سراب تھی، ان دونوں کے بعد ان جیسی کوئی لڑکی یہاں نہیں آئی۔ ہاں دوسری بیشمار لڑکیاں یہاں آئیں۔ میں نے ان میں سے کسی کا چہرہ نہیں دیکھا۔ وہ رات کی تاریکی میں یہاں آتی ہیں اور صبح ہونے سے پہلے چلی جاتی ہیں۔ تمہیں میں نے ان میں سے کسی لڑکی کی حیثیت نہیں دی تھی۔ لیکن تمہارے بارے میں میرا تجسس حد سے بڑھا ہوا تھا اور میں ہر قیمت پر تمہارے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔"

"پھر اب؟" وہ مسکرائی۔

"میرا تجسس کچھ اور بڑھ گیا ہے اور میں کچھ اور بے چین ہوگیا ہوں لیکن۔ اس وقت مجھے شکست ہوئی ہے۔ آئندہ کے بارے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا کروں گا۔"

"مستقل مزاج ہو؟" بھکارن نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس شکست سے بددل ہو کر اپنا تجسس فراموش کردو گے یا میرے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے رہو گے۔"

"یہ حالات پر منحصر ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ بہرحال میرا چیلنج قبول کرو۔ میں تمہیں اپنے بارے میں جاننے کی دعوت دیتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ تم سے بہت زیادہ دور نہیں رہوں گی۔ منظور۔؟"

اس نے لڑکی کے چیلنج کے بارے میں سوچا۔ بلاشبہ وہ پراسرار شخصیت کی مالک ہے۔ اب تو اس کے بھکارن ہونے پر بھی یقین نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں نہ اس بالکل مختلف صورت حال میں دلچسپی لی جائے، ماحول کا جمود ٹوٹ جائیگا اور خاصی تفریح رہے گی۔ اس نے مسکراتے ہوئے گردن ہلادی۔ "منظور ہے۔!"

"تب ٹھیک ہے۔ میں اپنے وعدے کا خیال رکھوں گی اور تم بھی اپنے وعدے پر قائم رہو گے۔ اچھا خدا حافظ۔" وہ دروازہ کھولکر باہر نکل گئی۔ اور ناصر دروازے کی جانب جھپٹا۔ لیکن اس جیسی لڑکیاں احمق نہیں ہوتیں۔ اس نے دروازہ باہر سے بند ہونیکی آواز صاف سنی تھی۔

رات کے نہ جانے کون سے پہر اسے نیند آئی تھی۔ لڑکی کے جانے کے بعد بوڑھی ملازمہ نے دروازہ کھولا تھا، لیکن وہ بیچاری اسوقت بھی اس سے کچھ نہ پوچھ سکی تھی۔ وہ اپنے بیڈ روم میں آکر خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا تھا اور پھر انتہائی کوشش کے باوجود وہ اس خوبصورت اور پراسرار لڑکی کے خیال کو ذہن سے نہیں جھٹک سکا تھا۔!

بلاشبہ وہ وہ نہ تھی جو نظر آئی تھی۔ وہ بھکارن بھی نہیں تھی۔ پھر کون تھی۔ اس کے پاس پستول بھی موجود تھا۔ کیا وہ چوروں کے کسی گروہ سے تعلق رکھتی ہے جو مختلف طریقوں سے چوریاں کرتا ہے۔ یعنی وہ بھکارن بنکر آئی اسے اس طرح بند کیا اور خاموشی سے سامان باندھکر چل پڑی۔ ممکن ہے اس کے کچھ اور ساتھی بھی ہوں جنہوں نے ان کا یہاں تک تعاقب کیا ہو۔ اور پھر سامان لے جانے میں انھوں نے لڑکی کی مدد کی ہو۔ اس کے دل میں یہ خواہش نہ ابھری کہ وہ بنگلے کے دوسرے کمروں میں جاکر سامان چیک کرے۔ اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ کچھ لے گئی ہے تو اب لیجا چکی ہے اس کے بارے میں تردد بیکار ہے لیکن چوری کرنے کے بعد وہ اپنے اس چیلنج پر قائم نہ رہ سکے گی جو اس نے کیا ہے۔ ممکن ہے اس کی گفتگو کو اس ہوا اور اب وہ کبھی اس کے سامنے نہ آئے۔

نہ جانے کیوں اس تصور سے اسے کوفت ہوئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ایکبار اس سے اور ملے اور اس سے کہے کہ بیشک وہ باقی سامان بھی چوری کرکے لے جائے، لیکن اپنے چیلنج پر قائم رہے۔ انہیں خیالات میں وہ سوگیا۔ اور صبح کو آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے اسے اسی کا خیال آیا تھا۔ وہ بستر سے اتر گیا۔ کوئی دوسرا کام کئے بغیر سب سے پہلے اس نے پورے بنگلے میں گھوم پھر کر سامان چیک کیا اور یہ دیکھکر اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا کہ کوئی چیز غائب نہیں ہوئی تھی۔ یہ خوشی نقصان نہ ہونے کی نہیں تھی، بلکہ وہ اس بات سے خوش تھا کہ لڑکی کی حیثیت چور کے علاوہ کچھ اور ہے اور اگر وہ چور نہیں ہے تو اپنے چیلنج کے مطابق اس کے سامنے ضرور آئے گی۔

باتھ روم میں جاکر اس نے غسل کیا اور پھر ناشتہ کرنے سے قبل اس نے اپنی فرم کے منیجر کے گھر فون کرکے کہا کہ وہ آج آفس نہیں آئے گا وہ خیال رکھے۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر اس نے لباس تبدیل کیا اور اسپورٹس کار لیکر چل پڑا۔ ایک پیٹرول پمپ سے اس نے ٹنکی بھروائی اور پھر سڑک گردی کرنے لگا۔ ایک ایک بازار ایک ایک گلی اور ایسے تمام علاقے چھان مارے، جہاں غریب اور فقیر رہتے تھے۔ لیکن کہیں اس کی جھلک نظر نہ آئی۔ دوپہر کو ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد وہ پھر نکل پڑا۔ اس بازار میں دو گھنٹے تک گھومتا پھرا جہاں وہ کل ملی تھی لیکن بے سود۔ شام تک وہ بری طرح تھک گیا تھا۔

اسے اپنی حماقت کا احساس تھا۔ بھلا وہ پراسرار لڑکی ایسے گلی کوچوں میں تو نہیں گھوم رہی ہوگی۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی وہ آفس نہ گیا اور یونہی آوارہ گردی کرتا رہا۔ اب اس کے انداز میں مایوسی جھلکنے لگی تھی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ اب وہ نہیں ملے گی اور نہ جانے کیوں اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ دن بھر آوارہ گردی کرنے کے بعد وہ بری طرح تھک جاتا اور گھر آکر افسردہ سا لیٹ جاتا۔ چوتھے دن اس کے منیجر نے اسے فون کیا کہ آفس میں اس کی ضرورت ہے تب وہ تیار ہو کر چل پڑا۔ کچھ ضروری کام رکے پڑے تھے بڑی بددلی سے اس نے وہ کام کئے اور پھر وہاں سے اٹھ گیا۔

اس کی کار نے اس بار دنوں بازار کے کئی چکر لگائے، جہاں وہ ملی تھی۔ لیکن بیسود۔ وہ گھر واپس آگیا اور تھکا تھکا سا ایک کوچ پر گر گیا پھر کوچ پر لیٹے لیٹے اس نے اپنی افسردگی اور لگن کے بارے میں سوچا۔ اور بری طرح چونک پڑا۔ کیا مطلب؟ اس افسردگی، اس بے کلی کا کیا مقصد ہے کیا یہ صرف اس بھکارن کی حقیقت جاننے کا تجسس ہے، یا کچھ اور۔! اوہ۔ بات کسی اور طرف چل نکلی ہے۔ وہ میلے کچیلے لباس میں ملبوس، گرد آلود چہرے والی وہ لڑکی تو کسی اور ہی راستے پر گامزن ہے۔ وہ زہتاں اور سمن کی جگہ لینا چاہتی ہے۔ یہ ناممکن ہے، دیوانگی ہے۔ اس نے گردن جھٹک دی۔ وہ ذہنی طور پر بھٹک رہا ہے۔ بھلا کسی لڑکی کے لیئے اب یہ دیوانگی کیوں۔ وہ پھر اپنی وحشت کو آواز کیوں دے رہا ہے۔!

اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ پھر سے ماحول میں گم ہو جائیگا۔ آج رات پھر کوئی خوبصورت لڑکی اس کے بستر کی زینت ہوگی اور صبح کو وہ اسے بھول جائیگا۔ یہی اصول درست ہے۔ خوامخواہ پاگل پن سے کیا فائدہ۔!

شام ہوتے ہی اس نے کلب جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔ اخبارات میں اس نے آج کے پروگرام دیکھے اور ایک پروگرام کا انتخاب کرلیا اور پھر پوری طرح بن سنور کر وہ گیلارڈ کی طرف چل پڑا۔ گیلارڈ کا خوبصورت ہال پوری طرح آباد تھا۔ چاروں طرف قہقہے ابل رہے تھے ٹرالیاں چل رہی تھیں، ماحول ہشاش بشاش تھا وہ خود بھی ان رنگینیوں میں گم ہوگیا۔ گیمز روم میں جاکر اس نے جوا کھیلا اور خاصی رقم ہار گیا۔ پھر بار میں آبیٹھا اور ہلکی شراب کے چند پیگ پیئے۔ پھر ڈائننگ ہال میں آگیا۔ ڈنر کے وقت پر ڈنر لیا اور پھر پروگرام ہال میں پہنچ گیا۔ اسٹیج پر حسین لڑکیاں علاقائی رقص پیش کررہی تھیں وہ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے ان حسین لڑکیوں کے تھرکتے جسم دیکھنے لگا ساتھ ہی اس کی نظریں ہال میں بیٹھی ہوئی کسی ایسی لڑکی کو منتخب کررہی تھیں جو اس رات کی ساتھی بن سکے۔

پیشہ ور لڑکیاں ہال میں منڈلا رہی تھیں۔ بہت سی لڑکیوں نے اس کی طرف دعوت دینے والی نگاہوں سے دیکھا بھی تھا، لیکن ابھی وہ فیصلہ نہیں کرپایا تھا۔ دفعتاً اسے اپنے پیچھے ایک سرگوشی سنائی دی۔

"اس کا پروگرام ٹھیک بارہ بجے ہوگا۔ بارہ سے ساڑھے بارہ تک۔ وہ ٹھیک ایک بجے یہاں سے جاتی ہے ہم اس کا پروگرام ختم ہوتے ہی یہاں سے اٹھ جائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک۔ دلاور کو اس کا پروگرام شروع ہوتے ہی اشارہ کردینا۔"

"ٹھیک ہے لیکن اسے پہنچانے کے بعد ہم پھر یہاں واپس آجائیں گے، میں پورا پروگرام دیکھوں گا۔"

"مال کب ملے گا؟"

"سیٹھ نقد کاروبار کرتا ہے۔ اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو۔"

"تب پھر میں تمہارے ساتھ نہیں آؤں گا میری جیب میں جب مال ہوتا ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ کوئی سالی پوری رقم ہتھیا لے گی اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں گا۔ آجکل مجھے رقم کی ضرورت ہے۔"

"تمہاری مرضی۔" دوسری آواز سنائی دی۔ گفتگو کچھ پراسرار تھی۔ احمد ناصر کے کان کھڑے ہوگئے۔ کسی رقاصہ کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی جس کا پروگرام بارہ بجے شروع ہوگا ایک بجے وہ یہاں سے جاتی ہے اور اس کے بعد وہ لوگ اس کے لئے کچھ کریں گے۔ کیا کریں گے، اس کا اندازہ لگانے میں ناصر کو کوئی دقت نہ ہوئی۔ اور نہ جانے کیوں اس کے دل میں خواہش پیدا ہوگئی کہ وہ ان لوگوں پر نگاہ رکھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے چالاکی سے ان دونوں کی شکل بھی دیکھ لی۔ وہ مہذب لباس میں تھے لیکن چہروں سے بدمعاش معلوم ہوتے تھے احمد ناصر نے ایک گہری سانس لی اور بارہ بجنے کا انتظار کرنے لگا۔

پروگرام ہوتے رہے۔ رقاصائیں اپنا اور اپنے حسین جسموں کا کمال دکھاتی رہیں اور پھر ٹھیک بارہ بجے روشنیوں کے رنگ بدل گئے۔ اناؤنسر نے ایک خوبصورت قبائلی رقص کا اعلان کیا اور قبائلی لباس میں ملبوس ایک رقاصہ اسٹیج پر آگئی۔ اس نے رقاصہ کو دیکھا اور یکبارگی اس کا دل دھڑک اٹھا روشنیاں رقاصہ کے سراپا کو اجاگر کررہی تھیں اور جب وہ رقاصہ کے چہرے پر پہنچیں تو رقاصہ کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ لیکن وہ چہرہ۔ وہ چہرہ اس کے دل میں ہلچل مچا گیا۔ چشم تصور سے اس نے اس چہرے پر پھیلا ہوا کاجل، سیب جیسے گالوں پر چڑھی ہوئی گرد کی تہہ دیکھی اور کتھے سے رنگین ہونٹ دیکھے۔ اور بھکارن اس کے سامنے آگئی۔! اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بھکارن رقاصہ! رقاصہ، بھکارن۔ کیا۔ کیا یہ وہی ہے یا اس سے ملتی جلتی کوئی اور لڑکی۔! وہ بے چین ہوگیا۔ اس نے ایک ویٹر کو اشارے سے بلایا اور جیب سے ایک بڑا نوٹ نکالکر اس کی مٹھی میں دباتے ہوئے بولا۔

"میں اس رقاصہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"پیشہ ور نہیں ہے صاحب۔" بیرے نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ایک بہت بڑے سیٹھ صاحب نے اس کے لئے منیجر صاحب کو ایک لاکھ روپے کی پیشکش کی تھی۔ منیجر صاحب نے اس سے بات کی تو اس نے جوتے سے منیجر صاحب کی پٹائی کرڈالی۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ وہ شوقیہ آرٹسٹ ہے اور قبائلی علاقے کا رقص پیش کرتی ہے۔"

"کب سے آئی ہے؟"

"آج اس کا چوتھا پروگرام ہے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور ویٹر اسے سلام کرکے چلا گیا۔

رقاصہ رقص پیش کرتی رہی۔ یہ رقص دوسرے رقصوں سے مختلف تھا، اسمیں جسمانی کشش سے متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی بلکہ ایک خاص انداز سے عورت کے تقدس پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ رقاصہ کے بے پناہ حسن نے تماشائیوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ اور وہ سکتے کے عالم میں رقص دیکھ رہے تھے۔ کافی دیر تک رقص جاری رہا۔ پھر تالیوں کی گونج میں رقاصہ داد تحسین وصول کرکے اندر چلی گئی۔

اور اسی وقت احمد ناصر نے اپنے پیچھے کرسیاں کھسکنے کی آوازیں سنیں۔ اس نے پلٹ کر ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا اور انکے باہر نکلتے ہی اس نے اپنی سیٹ بھی چھوڑ دی۔ وہ خاموشی سے لان میں نکل آیا اور اپنی کار کے قریب پہنچکر اس میں بیٹھ گیا۔ وہ دونوں نگاہوں سے روپوش ہو گئے تھے۔ بہرحال وہ کار لیکر باہر آگیا اور پھر کلب کے گیٹ سے کچھ دور نکل کر اس نے کار سڑک سے اتار کر روک دی اور اس کی روشنیاں بند کر کے انتظار کرنے لگا۔ اس کی نگاہیں گیٹ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔!

گھڑی کی سوئیوں نے ایک بجادیا اور پھر اس نے گیٹ سے ایک کار نکلتے ہوئے دیکھی۔ ایک چھوٹی سی آسٹن تھی جس پر ایک ہوٹل کا نام لکھا ہوا تھا۔ یقیناً وہ رقاصہ کی کار تھی اور اسے ہوٹل سے کرائے پر حاصل کیا گیا تھا اس کے پیچھے ہی ناصر نے ایک پرانے ماڈل کی کار نکلتے دیکھی۔ وہ بالکل چھوٹی اور دو دروازوں والی تھی۔ دوسری کار پہلی کار کے پیچھے چل پڑی۔ اور پھر ناصر نے بھی اپنی کار اسٹارٹ کر کے ان کے پیچھے ڈال دی۔ اس نے اپنی کار کی روشنیاں گل کر رکھی تھیں اور آگے جانے والی کاروں کی عقبی روشنیوں کے سہارے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ کلب سے کافی دور ایک سنسان سڑک پر پرانے ماڈل کی کار کی رفتار تیز ہو گئی اور اس نے دو تین بار ہارن بھی دیا۔ چنانچہ آگے جانے والی کار نے اسے راستہ دیدیا اور پرانے ماڈل کی کار آگے نکل گئی۔

لیکن آگے نکلتے ہی وہ سڑک پر ترچھی ہو کر رک گئی اور پھر دوسری کار کی بریکیں بھی چرچرائیں۔ پرانے ماڈل کی کار سے تین افراد باہر نکلے اور پچھلی کار پر جھپٹ پڑے۔ اور پھر وہ لڑکی کو کار سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ "بچاؤ" ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی اور اسکے ساتھ ہی اسے اغوا کرنے والوں نے اس کا منہ بھینچ دیا۔ پھر وہ اسے اٹھا کر اپنی کار میں لے گئے اور کار آناً فاناً ہی اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ احمد ناصر نے بھی کار آگے بڑھادی۔ وہ اپنے آئندہ قدم کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ان لوگوں نے لڑکی کو اغوا کر لیا تھا' ایک شکل یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ صرف ان کا تعاقب کرتا اور ان کے ٹھکانے پر پہنچ کر کچھ کرنے کی کوشش کرتا' لیکن یہ بات خطرناک بھی ہو سکتی تھی۔ ممکن ہے ان کے ٹھکانے پر زیادہ لوگ ہوتے اور ان سے نپٹنا مشکل ہو جاتا۔ چنانچہ ابھی اسی وقت کچھ کر لینا مناسب ہے۔ اس نے اچانک کار کی رفتار تیز کر دی۔ روشنیاں اس نے اب بھی نہیں جلائی تھیں۔ پرانے ماڈل کی کار کے نزدیک پہنچنا زیادہ مشکل نہ ہوا اور وہ اپنی کار اس کے برابر دوڑانے لگا۔ پھر اس نے گرجدار آواز میں کہا۔ "کار روک دو ورنہ گولی مار دوں گا۔"

گولی مارنے کی صرف دھمکی ہی تھی ورنہ اس کے پاس پستول وغیرہ کہاں تھا۔ لڑکی کو اغوا کرنے والے بوکھلا گئے اور رفتار بہت تیز ہو گئی لیکن

نئی کار کا مقابلہ کہاں' ناصر پھر ان کے برابر پہنچ گیا اور اس وقت کوئی چیز اس کے کان کے پاس سے سن سے نکل گئی اور سامنے باڈی سے ٹکرا کر نیچے گر پڑی۔ یہ چاقو تھا جو پھینک کر مارا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ پستول ان کے پاس بھی نہیں ہے ورنہ وہ گولی چلانے کی کوشش کرتے۔ ناصر کی ہمت اور بڑھ گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب کار کو سائڈ مار کر روکنے کی کوشش کریگا چنانچہ ایکبار اسکی کار کی رفتار پھر تیز ہوئی اور ناصر نے نہایت ہوشیاری سے اگلی کار میں سائڈ مار دیا۔

کار کے بریک چرچرائے۔ لیکن اسے فوراً ہی سنبھال لیا گیا تھا ناصر کو کار میں موجود لڑکی کا بھی احساس تھا' اس لئے اس نے سائڈ زوردار نہیں مارا تھا۔ دوسری بار پھر وہ اپنی کار کو آگے نکال لے گیا اور اس نے پھر آگے والی کار میں ٹکر مار دی۔ وہ لوگ بھی اب صورت حال سے ہوشیار ہو گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے کار کو پھر سنبھال لیا۔ لیکن تیسری ٹکر پر کار قابو میں نہ رہ سکی۔ بریکوں کی خوفناک چرچراہٹ کے باوجود وہ سڑک سے اتر کر ایک درخت سے ٹکرا گئی اور اسکی کار آگے نکل گئی۔ لیکن ناصر نے اسے ریورس کیا اور کار کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے کار کا دروازہ کھولکر دو آدمیوں کو بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ پھرتی سے نیچے اتر آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور زخمی پڑا تھا اور پچھلی سیٹ پر بیہوش رقاصہ۔!

اس نے رقاصہ کو دیکھا اور پھر ڈرائیور کو۔ ڈرائیور شدید زخمی نہیں تھا اور رقاصہ بھی شاید صدمے سے بیہوش ہو گئی تھی۔ اس نے پچھلا دروازہ کھولکر رقاصہ کو اٹھا لیا اور اسے لئے ہوئے اپنی کار میں پہنچ گیا۔ پھر اس نے احتیاط سے اسے پچھلی سیٹ پر ڈالا اور کار لیکر چل پڑا۔ اس کے ذہن میں ہیجان برپا تھا۔

کیا یہ وہی بھکارن ہے۔ لیکن یہ ایک رقاصہ کے روپ میں۔ کیا اسرار ہے۔ پراسرار بھکارن کون کون سے روپ رکھتی ہے۔ وہ حقیقت میں کیا ہے۔ بنگلے پہنچنے پر بھی رقاصہ کو ہوش نہیں آیا اور وہ اس کے نیم و نازک جسم کو بازوؤں میں اٹھائے اندر پہنچ گیا۔ نرم بستر پر اسے لٹانے کے بعد اس نے تیز روشنی کر دی اور رقاصہ کے خدوخال دیکھنے لگا۔

ہاں۔ سو فیصدی یہ وہی حسین بھکارن تھی۔ یہ اس کا دوسرا روپ تھا۔ تو اس نے غلط نہیں کہا تھا کہ وہ اس سے زیادہ دور نہیں رہے گی۔ اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ رقاصہ کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد اسے ہوش آگیا۔ اس نے کراہ کر کروٹ بدلی اور پھر آنکھیں کھولدیں۔ چند لمحات وہ خلاء الذہنی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر اسکی نگاہ ناصر پر پڑی اور وہ بری طرح اچھل پڑی۔

"میں کہاں ہوں۔؟" اس نے ایک غیر ملکی زبان میں پوچھا لیکن ناصر وہ زبان نہیں جانتا تھا۔ "میں کہاں ہوں؟" رقاصہ نے اس بار انگریزی میں پوچھا۔ لہجہ اجنبی تھا۔ لیکن ناصر کو سب سے زیادہ حیرت اس کی آواز پر ہوئی تھی یہ آواز بھکارن کی نہیں تھی۔ سو فیصدی بدلی ہوئی آواز تھی۔

"خوب۔ تو تم مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔" ناصر نے سنبھل کر کہا۔ لیکن رقاصہ کے چہرے پر ایسی الجھن نظر آئی جیسے وہ اس کے الفاظ نہیں سمجھی ہو۔

"کیا تم انگریزی بھی نہیں بول سکتے۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ لہجے میں مایوسی تھی۔

"بیوقوف مت بناؤ اللہ رکھی۔ تمہارا خیال ہے میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔ لیکن میں نے تمہاری تلاش میں کئی دن برباد کئے ہیں۔ یقین کرو میں ایک رات بھی سکون سے نہیں سو سکا!"

"میرے خدا، اب کیا کروں۔" رقاصہ پریشانی سے بولی۔ اس بار زبان پھر اجنبی تھی۔ اس نے انتشار سے پوچھا۔ "یہ کونسی جگہ ہے اور تم کون ہو"

"ہوں۔ تو تم اجنبیت کا اظہار کرتی رہو گی۔ تمہاری مرضی بہرحال وہ لوگ تمہیں اغوا کر کے لے جا رہے تھے لیکن ہماری تمہاری تھوڑی سی دوستی ضرور ہے چنانچہ میں نے دوستی کا فرض پورا کیا۔" اس بار ناصر نے انگریزی میں کہا اور وہ خوشی سے اچھل پڑی۔

"تو تم انگریزی بول سکتے ہو۔؟ مگر تم کیا کہہ رہے ہو میں نہیں سمجھی۔"

"تم اللہ رکھی نہیں ہو۔"

"نہیں۔ میرا نام شائیلا مارکو ہے۔ رقاصہ ہوں اور دنیا کا دورہ کر رہی ہوں۔ تمہیں شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

اس کے لہجے سے ذرا بھی بناوٹ کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ناصر سوچ میں پڑ گیا۔ کیا درحقیقت وہ درست کہہ رہی ہے۔ وہی خدوخال تھے لیکن اس وقت کی اور اب کی شکل میں زمین آسمان کا فرق تھا' اس فرق کو بھی قبول کیا جاتا' لیکن یہ آواز۔ بلاشبہ یہ آواز بھکارن کی نہیں تھی۔ تو کیا درحقیقت اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ رقاصہ کو گھورتا رہا پھر بولا۔

"تم کہاں مقیم ہو۔؟"

"ہوٹل گرین شیڈو میں' تم وہاں سے میرے بارے میں معلوم کر سکتے ہو۔ براہ کرم مجھے میرے ہوٹل پہنچا دو۔ میں پولیس میں رپورٹ کرنا چاہتی ہوں۔ کچھ لوگوں نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔"

جس کار میں وہ سفر کر رہی تھی' وہ بھی ہوٹل گرین شیڈو کی تھی جس کا مطلب ہے کہ اس سلسلے میں اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ احمد ناصر سنجیدہ ہو گیا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ غلط فہمی میں وہ خاصی گڑبڑ کر بیٹھا ہے۔ بہرحال یہ بھی برا نہیں تھا کہ اس نے رقاصہ کی عزت بچالی تھی۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔؟" چند منٹ کے بعد اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہوٹل کی کار کہاں ہے؟۔ آپ مجھے وہاں تک پہنچا دیں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔ میں تو اس ملک میں اجنبی ہوں' اپنے طور پر سفر کرتی ہوں اور ہوٹلوں اور کلبوں سے رابطہ قائم کر کے کچھ پروگرام پیش کرتی ہوں اس طرح کچھ رقم حاصل کر کے دوسرے ملک چلی جاتی ہوں۔"

"بہتر ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور پھر وہ لڑکی کو سہارا دیکر باہر لے آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی کار میں بیٹھا اسی جگہ جا رہا تھا جہاں سے وہ لڑکی کو لایا تھا۔

درخت سے ٹکرانے والی پرانے ماڈل کی کار اب غائب تھی۔ البتہ ہوٹل کی کار اسی طرح کھڑی تھی۔ لڑکی اس کا شکریہ ادا کر کے اپنی کار میں جا بیٹھی۔ "کیا میں ہوٹل تک آپکے ساتھ چلوں۔؟"

"نہیں شکریہ! رات کافی گزر چکی ہے۔ ہوٹل کے چند لوگ میرے بارے میں غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں رقص کرتی ہوں تو عصمت فروشی کا کاروبار بھی کرتی ہوں گی۔ آپ کو اس وقت میرے ساتھ دیکھ کر ان کی جرأت بھی بڑھے گی۔ البتہ کل اگر آپ پسند کریں تو گرین شیڈو کے روم نمبر اڑتالیس میں آجائیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"بہتر ہے۔ اجازت!" ناصر نے کہا اور کار موڑ کر واپس چل دیا۔ لڑکی نے بھی اپنی کار آگے بڑھا دی تھی۔ لیکن ابھی تک ناصر کا دل پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکا تھا۔ چنانچہ کچھ دور جا کر اس نے کار پھر واپس موڑ دی اور روشنیاں گل کر کے لڑکی کی کار کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ گرین شیڈو تک اس کے پیچھے گیا اور پھر اسے ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد بھی اس نے دس پندرہ منٹ وہاں گزارے اور پھر واپس چلا آیا۔ اس کا ذہن اب بھی الجھا ہوا تھا۔ بھکارن کے خدوخال اس کے دماغ میں ہوجود تھے اور اگر رقاصہ کے چہرے کو گرد آلود کر دیا جاتا، بال الجھا دیئے جاتے، آنکھوں میں کاجل بھر دیا جاتا تو یقیناً وہ بھکارن لگتی، لیکن وہ آواز۔ رقاصہ اور بھکارن کی آواز میں نمایاں فرق تھا اور یہی فرق احساس دلاتا تھا کہ رقاصہ بھکارن نہیں ہے۔ بہرحال، وہ بمشکل بھکارن کو فراموش کر پایا تھا کہ رقاصہ نے اسے پھر یاد دلا دیا۔

یہ رات پھر اس پر بھاری گزری۔ دوسری صبح اس نے بمشکل کچھ وقت گزارا۔ اور پھر لباس وغیرہ تبدیل کر کے وہ گرین شیڈو کی طرف چل پڑا۔ کار کی رفتار بہت تیز تھی۔ بہت جلد وہ گرین شیڈو پہنچ گیا۔ ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں کار روک کر اس نے انجن بند کیا اور پھر ہوٹل کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ رقاصہ نے اسے روم نمبر بتا دیا تھا اس لئے اس نے کسی سے کچھ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور سیدھا اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن کمرے کے سامنے پہنچتے ہی اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ دروازے کے باہر تالا لگا ہوا تھا۔ اور تالے میں ایک لفافہ اٹکا ہوا تھا۔ لفافے کے اوپری سرے پر اس کا نام صاف نظر آرہا تھا۔! اس نے بیقراری سے لفافہ نکال لیا اور اسے کھول کر پڑھنے لگا! لکھا تھا!

احمد ناصر صاحب! تسلیم

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہونگے۔ دوسرا روپ آپکو پسند آیا ہوگا لیکن میں آپکا تجسس کچھ اور بڑھا رہی ہوں۔ کیا خیال ہے؟ لیکن کیا آپ مایوس ہو کر میرے بارے میں تحقیقات ختم کر دیں گے۔ کم از کم میں تو ایسی کم ہمتی کی توقع نہیں رکھتی میں وعدہ کر چکی ہوں کہ آپ سے زیادہ دور نہ رہوں گی چنانچہ ایماندارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے عرض ہے کہ میں یہاں سے رشید آباد جا رہی ہوں۔ رشید آباد بہت بڑی جگہ نہیں ہے اسلئے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جائے گی!۔ اور ہاں میری تلاش صرف دن میں کیا کریں۔ رات کو نیند بھر کر سونا بہت ضروری ہے۔

آپ کی: اللہ رکھی یا شائیلا مارکو

یہ خط پڑھ کر اس کا سر چکرا گیا۔ میرے خدا یہ لڑکی ہے یا شیطان تو شائیلا مارکو اللہ رکھی ہی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ آواز بدلنے پر بھی قادر ہے لیکن۔ وہ ہے کون۔؟ ظاہر ہے نہ وہ اللہ رکھی ہے اور نہ شائیلا مارکو پھر کون ہے وہ آخر۔؟ ضرور کوئی خطرناک لڑکی ہے۔ شاید غیر ملکی جاسوس۔ یا کسی خطرناک گروہ سے اس کا تعلق ہے۔ یقیناً ایسی ہی کوئی بات ہے۔ وہ کوئی خاص چکر چلا رہی ہے۔ کیا پولیس کو اس کے بارے میں اطلاع دی جائے اُسے بتا دیا جائے کہ ایک اس قسم کی لڑکی نہ جانے کیا کرتی پھر رہی ہے، لیکن۔ یہ بیوقوفی ہوگی، پولیس اس سے پوچھے گی کہ اسے اس پر کیا شبہ ہے؟۔ ظاہر ہے وہ اس پر کوئی جرم تو عائد نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر۔ یہ ویسے بھی مناسب نہیں تھا۔ یہ تو گھٹیا پن ہوگا کہ وہ اس سے شکست کھانے کے بعد ایسی حرکت پر اتر آئے۔ وہ کیا خیال کرے گی۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ اس پر لعنت بھیجی جائے اور یہ فیصلہ کر کے وہ ہوٹل سے چلا آیا۔ گھر جانا بیکار تھا۔ وہ آفس پہنچ گیا اور پھر اس نے دن بھر خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کی لیکن آنکھوں کے سامنے شائیلا مارکو اور اللہ رکھی ہی رہیں۔ دوپہر تک وہ بُری طرح پریشان ہو گیا۔ اس کا دل اسے اکسا رہا تھا کہ رشید آباد چلا جائے۔ دو بجے وہ دفتر سے اُٹھ گیا۔ گھر پہنچ کر ٹھنڈے پانی سے غسل کیا۔ لیکن پھر بھی سکون نہ ملا۔ اور شام تک اس نے رشید آباد جانے کا فیصلہ کر لیا۔ رشید آباد میں اس کا ایک پُرانا دوست بھی رہتا تھا۔ اسی بہانے اس سے ملاقات بھی ہو جائے گی!۔ چنانچہ اس رات تک اس نے تیاریاں مکمل کر لیں اور پھر دوسرے دن وہ ٹرین سے رشید آباد چل پڑا۔! لاکھ ذہن کو آزاد رکھنے کی کوشش کی جائے لیکن اس پر قابو مشکل ہے۔ رہ رہ کر اس کے تصور میں وہ لڑکی ابھر آتی۔! آخر وہ کون ہے۔ کیوں یہ بہروپ بھرتی پھر رہی ہے۔؟ یہی سوال بار بار اس کے ذہن میں ابھر آتے!

اور طویل سفر انہیں خیالات میں کٹ گیا۔ اُسے احساس بھی نہ ہو سکا! شام کو سات بجے وہ رشید آباد ریلوے اسٹیشن پر اتر گیا اور پھر ٹیکسی لیکر احسان کے مکان کی طرف چل پڑا۔ احسان اور اس کی بیوی کلب چلے گئے تھے، لیکن ملازم اُسے پہچانتے تھے اس لئے کوئی دشواری نہیں ہوئی اور اس کا سامان وغیرہ اندر پہنچا دیا۔ اس نے غسل کیا اور پھر لباس وغیرہ بدل کر ڈرائنگ روم میں آبیٹھا۔ !رات کو دس بجے تک وہ احسان اور اس کی بیوی کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آئے۔ ملازم نے بتایا تھا کہ ان کے آنے کا وقت مقرر نہیں ہے کبھی کبھی رات کا ایک بھی بج جاتا ہے۔ اور کبھی جلدی آجاتے ہیں۔ بہرحال، گیارہ بجے اس نے ہلکا سا کھانا کھایا اور پھر آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ پھر دوسرے دن صبح ہی آنکھ کھلی۔ سورج نکل آیا تھا۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور باہر نکل آیا۔ سامنے ہی ملازم نظر آیا۔ اور اس نے اسے سلام کیا۔

"احسان اب بھی آیا یا نہیں۔؟" اس نے پوچھا۔

"صاحب نے کہا ہے کہ آپ کے جاگتے ہی انھیں اطلاع دوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اطلاع دو۔ میں غسل کر لوں۔" اور پھر جب وہ غسل سے فارغ ہو کر لباس بدل کر باہر نکلا تو احسان اور اس کی بیوی اُسکے کمرے میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

"خوب مہمان ہو یار۔ سولہ گھنٹے سے مکان پر قبضہ جمائے بیٹھے ہو اور ملاقات تک نہیں کی۔" احسان نے اس سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ عیش کرتے پھر رہے تھے۔ مہمانوں کا خیال کیسے آتا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"رمضان نے بیوقوفی کی ورنہ تمہیں کلب ہی لے آتا۔ کم از کم تار تو دیدیا ہوتا۔"

"بس اچانک پروگرام بن گیا۔" اس نے کہا اور پھر احسان کی بیوی سے گفتگو ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ملازم نے ناشتہ لگ جانے کی اطلاع دی اور وہ ناشتہ کرنے لگے۔ ناشتہ کے دوران مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ناصر نے اچانک آمد کے سلسلے میں کوئی بہانہ کر دیا تھا۔ بہرحال اسی شام سے وہ بھکارن کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔ احسان نے اپنی کار اسے دیدی تھی۔ پورے تین گھنٹے اس نے سڑکیں ناپیں اور پھر یہاں کے ہوٹلوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ ہوٹلوں میں اسے تلاش کرنے کا کام اس نے دوسرے دن پر چھوڑ دیا تھا۔ رات کو وہ احسان کے گھر واپس پہنچ گیا احسان اور اس کی بیوی اس کی وجہ سے کلب بھی نہیں گئے تھے۔ وہ لوگ بات چیت کرتے رہے اور پھر رات کا کھانا کھانے کے بعد تاش کی بازی جم گئی۔! ناصر ان لوگوں کا ساتھ دے رہا تھا لیکن اس کا ذہن بے قابو سا تھا۔ کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جھنجھلا رہا تھا، دل ہی دل میں خود کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ کسی طرح اس کا خیال ذہن سے اتر ہی نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کون ہے ذلیل کہیں کی۔! اس کے منہ سے بڑبڑاہٹ نکل گئی اور احسان کی بیوی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"مجھ سے کچھ کہا ناصر بھائی۔؟" اس نے پوچھا۔

"ایں۔ نہیں۔ میں۔ میں پھول کی بیگم کے بارے میں کہہ رہا تھا۔" اس نے چونک کر بات بنائی۔

"کہاں غائب ہو حضرت۔ کیا چکر ہے، کھل جاؤ۔ میں نے تمہارے اندر بہت سی تبدیلیاں نوٹ کی ہیں۔" احسان نے معنی خیز انداز میں کراتے ہوئے کہا اور وہ بوکھلا گیا۔ وہ کسی کو اپنی حماقت میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا

"بے وقوف ہو تم۔ کچھ کاروباری الجھنیں ہیں۔ اُن سے نپٹنے کے بعد سیر و تفریح کرینگے۔" ناصر نے سنبھل کر بات بنائی اور شاید احسان کو یقین بھی آگیا۔!

دوسرے دن پھر وہی تگ و دو شروع ہو گئی۔ ایک ایک ہوٹل میں جا کر اس نے ایسی کسی خاتون کے بارے میں معلومات شروع کر دیں جو تنہا آئی ہو۔ خوبصورت وغیرہ وغیرہ۔! لیکن شام تک کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ اس کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چلا۔ تیسرے دن بھی اس نے وہی کوشش جاری رکھی اور چوتھے دن بھی۔!

"میں نے کہا حضرت! یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ کاروبار کے لئے میں نے کبھی تمہیں اس قدر الجھا ہوا نہیں دیکھا کوئی اور ہی چکر ہے۔" احسان نے معنی خیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"اور کیا چکر ہو سکتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جو کوئی بھی ہو۔ ویسے تمہاری عاشق مزاجی سے میں بھی واقف ہوں

اور رخسانہ بھی۔ اس کا خیال رکھنا۔"

"عشق کرنے کے لئے رشید آبادی رہ گیا ہے"، وہ مسکرایا۔

"بہرحال ایسی کوئی بات ہو تو غلام مفت مشورے دینا ہے۔ اس کا خیال رکھنا اور ہاں آج شام کو سات بجے تک ضرور آجانا۔ ہمارے کلب میں فینسی ڈریس شو ہے۔ بڑا لطف رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سات بجے تک پہنچ جاؤں گا"۔ ناصر نے کہا، اور چل پڑا۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اپنے خفقان کے بارے میں سوچ رہا تھا کیوں۔ آخر اس کا دماغ اسقدر خراب ہو گیا ہے۔ نہ جانے وہ کون ہے۔ کیا چاہتی ہے۔ اس نے خوامخواہ اسے بیوقوف بنا رکھا ہے اور وہ بن رہا ہے ممکن ہے وہ کسی کر سے یہاں آئی ہی نہ ہو۔ وہیں ہو۔ آخر اس نے اُسکی تحریر پر اعتماد کیوں کر لیا ہے۔ وہ ہونٹ کاٹتا رہا۔ بڑی بے بسی محسوس کر رہا تھا وہ، دل پر اختیار ہی نہ رہا تھا۔ سب کچھ سوچ رہا تھا، لیکن کر وہی رہا تھا، جو دل کہہ رہا تھا!۔ اس شام وہ بڑا افسردہ سا واپس آیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گیا۔

"مجھے تو خطرہ تھا کہ تم وقت پر نہیں پہنچو گے"۔ احسان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"غسل کر لیں ناصر بھائی اور جلدی سے تیار ہو جائیں"۔ احسان کی بیوی نے کہا۔ اس کا دل کہیں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا، لیکن جب سے یہاں آیا تھا ایک دفعہ بھی ان لوگوں کے ساتھ باہر نہیں گیا تھا۔ یہ بھی بداخلاقی تھی ظاہر ہے وہ کوئی سرائے یا ہوٹل تو تھا نہیں کہ شام کو آ کر سو جائے اور دن بھر آوارہ گردی کرتا رہے۔ اس نے غسل کر کے اپنا خوبصورت لباس پہنا اور باہر نکل آیا۔ رخسانہ نے ایک قبائلی لباس پہنا تھا اور احسان ابراہیم لنکن بنا ہوا تھا

"آپ کوئی روپ نہیں بدلیں گے ناصر بھائی۔؟"

"میرا خیال ہے تم اس لباس کے ساتھ صرف دم لگا لو۔ نایاب شے نظر آؤ گے"۔ احسان نے کہا۔

"میں نے تمہیں اپنی دم تصور کر لیا ہے۔ چلو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور رخسانہ بھی ہنس پڑی۔ اور وہ لوگ کلب چل پڑے، کلب میں بھانت بھانت کے جانور موجود تھے۔ کوئی اسکیمو بنا ہوا تھا تو کوئی پتھر کے دور کا انسان۔ عجیب عجیب شکلیں نظر آ رہی تھیں۔ خاص طور سے عورتوں نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ کوئی کلوپٹرا تھی تو کوئی سائیکی، سب اپنے اپنے روپ میں مست تھیں، وہ دلچسپی سے ان کے بہروپ دیکھتا رہا۔ احسان کو اسکے چند دوست گھسیٹ کر لے گئے اور رخسانہ عورتوں میں پھنس گئی! وہ ایک کونے میں سگریٹ پیتے ہوئے چاروں طرف نظریں دوڑاتا رہا۔ اور۔ اچانک اسے اپنی پشت سے ایک آواز سنائی دی!۔ "ایک پیسہ بابوجی۔ اللہ کے نام پہ۔"

اور وہ چونک کر پلٹ پڑا۔ آواز اجنبی تھی، لیکن الفاظ مانوس! اور پیسہ مانگنے والی کو دیکھ کر اس کے ذہن کے تار جھنجھنا اٹھے۔

"ایک پیسہ بابوجی۔" بھکارن گڑگڑا کر بولی۔ "چھوٹے چھوٹے بہن بھائی۔"

"تم۔ تم۔!" وہ جنونی انداز میں بولا۔ "رحم کھاؤ۔ خدا کیلئے میرے اوپر رحم کھاؤ۔ میں پاگل ہو جاؤں گا، میں مر جاؤں گا"۔ اس نے بھکارن کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"مسٹر۔ یہ فینسی ڈریس شو ہے پاگل خانہ نہیں۔" بھکارن نے غصیلے انداز میں اس سے ہاتھ چھڑا لیا۔ لیکن اس نے لپک کر اسے دونوں بازوؤں میں کس لیا۔

"میں شکست تسلیم کرتا ہوں۔ میں ہار گیا ہوں۔ میں۔ میں اب، میں اب۔!" بھکارن اسکے بازوؤں سے نکلنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اس کے چیکٹ کپڑے تتر بتر ہو گئے تھے اور بہت سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے"۔ ارے۔ یہ بھکارن یہاں کیسے گھس آئی۔ افوہ۔ کیسی بدبو ہے اسکے لباس میں"۔ کسی نے کہا۔

"لیکن بھائی صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا یہ بھی کوئی ڈرامہ ہے"۔ کسی دوسرے نے کہا لیکن ناصر ان سب کی باتوں سے بے بہرہ ہو گیا تھا۔ وہ بدستور بھکارن کو بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھا۔ دفعتاً کسی طرف سے دو افراد آگے بڑھے۔ ان میں ایک کافی لحیم شحیم تھا اور چہرے سے بارعب نظر آتا تھا۔ اس نے ناصر کے قریب پہنچ کر اس کے دونوں بازو پکڑے اور انھیں پوری قوت سے علیحدہ کر کے بھکارن کو آزاد کرا دیا۔

"مسٹر۔ یہ فینسی ڈریس شو ہے۔ غنڈہ گردی کا اکھاڑہ نہیں ہے، یہ کیا ہو رہا تھا۔"

"بکواس مت کرو۔ وہ۔ وہ اللہ رکھی ہے میرا مطلب ہے کہ وہ۔ وہ۔" ناصر نے لپک کر پھر بھکارن کا بازو پکڑ لیا۔ لیکن اس بار لحیم شحیم آدمی نے سختی سے اسے ایک طرف ڈھکیل دیا۔ پھر اس نے سخت آواز میں ناصر کو سرزنش کی۔ "براہ کرم آپ فوراً کلب سے نکل جائیں۔ آپ شریفوں کی محفل کے قابل نہیں ہیں۔ منیجر کو بلاؤ۔ ایسے بیہودہ انسان کو کلب میں داخلے کی اجازت کیوں دی گئی۔"

اور آن کی آن میں منیجر ان کے قریب پہنچ گیا۔ لحیم شحیم آدمی کے سامنے وہ بیحد مؤدب تھا۔ اور اب ناصر کو بھی ہوش آ گیا تھا۔

"آپ کا کارڈ جناب۔؟" منیجر نے خشمگیں انداز میں اس سے پوچھا اسی وقت احسان بھی ان کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے منیجر۔ یہ میرے ساتھ ہیں۔"

"آپ غلط آدمی کو یہاں لے آئے ہیں مسٹر احسان"۔ منیجر نے درشت لہجے میں کہا۔ "انہوں نے مسٹر داور کی مہمان سے بدتمیزی کی ہے۔"

"یہ آپکے ساتھ ہیں مسٹر احسان۔؟" لحیم شحیم آدمی نے احسان سے پوچھا

"اوہ ہاں مسٹر داور۔ لیکن ہوا کیا۔؟" احسان نے حیرانی سے کہا۔ بھکارن ایک طرف کھڑی تھی، اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس پورے ڈرامے سے اُس کا کوئی تعلق نہ ہو۔

"اگر یہ آپکے مہمان ہیں تو یقیناً بُرے آدمی نہ ہوں گے۔ شاید کوئی غلط فہمی ہے۔ آئیے مسٹر میں آپ لوگوں کی غلط فہمی دور کر دوں"۔ داور نے کہا اور کلب کے منیجر نے سکون کی سانس لی۔ لحیم شحیم آدمی نے دوستانہ انداز میں ناصر کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف بڑھ گیا، رخسانہ، احسان اور دو اور آدمی بھی اُنکے ساتھ تھے اور ان کے پیچھے بھکارن بھی بے نیازی سے چلی آ رہی تھی۔

"کیا بات تھی جناب؟ کیا مس عالیہ سے آپ کی پہلے سے ملاقات ہے؟" داور نے پوچھا۔ لیکن ناصر گم صم تھا۔ اُس کا ذہن تاریک ہوتا جا رہا تھا

"مسٹر احسان میرے دیرینہ دوست ہیں۔ اس لئے میں معذرت خواہ ہوں کہ آپکے ساتھ سختی سے پیش آیا۔ لیکن مس عالیہ بھی میری معزز مہمان ہیں۔ اس فینسی ڈریس شو کے لئے انہوں نے بھکارن کا روپ دھارا ہے۔ شاید آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ کیوں محترمہ عالیہ۔ آپ نے پہلے کبھی ان سے ملاقات کی ہے"

"نہیں مسٹر داور۔ یہ میرے لئے اجنبی ہیں۔" بھکارن نے جواب دیا۔ اور ناصر نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا پھر اس نے احسان سے کہا۔

"سوری احسان۔ واقعی میری طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے مجھے اجازت دو۔ میں شرمندہ ہوں"۔ اور ناصر احسان کے جواب کا انتظار کئے بغیر واپس مڑ گیا۔ اس نے احسان کی کار بھی نہیں لی اور ایک ٹیکسی لیکر چل پڑا۔ اس کا دماغ بُری طرح گھوم رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خودکشی کر لے کیسی گھٹیا حرکت سرزد ہوئی تھی اس سے۔ کیسا دیوانہ ہو گیا تھا وہ۔ لیکن اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ بھکارن وہی تھی۔ گو اس بار اس کی آواز پھر بدلی ہوئی تھی اور ان دونوں آوازوں سے مطابقت نہ رکھتی تھی جو رفاصہ اور بھکارن کی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود۔ شبہ کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس نے گھر پہنچتے پہنچتے فیصلہ کر لیا کہ وہ فوری طور پر واپس چلا جائیگا۔ تھوڑی دیر کے بعد احسان اور رخسانہ بھی گھر پہنچ گئے۔ رخسانہ مسکرا رہی تھی۔

"میں ازحد شرمندہ ہوں احسان، کہ تمہیں بھی وہاں ذلیل کرایا۔ درحقیقت میں پاگل ہو گیا ہوں میرے دوست۔ آپ بھی مجھے معاف کر دیں بھابی۔ میں آپ لوگوں کے لئے مصیبت بن گیا۔"

"زیادہ بکواس مت کرو مصیبت کے بھتیجے۔ ورنہ مار مار کر دماغ درست کر دوں گا! ویسے یار تم نے بڑی غیریت کا ثبوت دیا۔ بتایا بھی نہیں کہ بات کیا ہے اور خود ہی آوارہ گردی کرتے رہے۔"

"بس میں شرمندہ ہوں احسان۔ مجھے اجازت دو۔ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے۔؟" احسان نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"آفس کے تمام کام ادھورے چھوڑ آیا ہوں۔ واپسی انتہائی ضروری ہے۔"

"فضول باتیں نہیں۔ پہلے مجھے اس چکّر کے بارے میں بتاؤ"۔ احسان نے کہا اور پھر دونوں میاں بیوی نے اسے زچ کر دیا تب اسے زبان کھولنا ہی پڑی۔ "وہ مجھے بھکارن کے روپ میں ہی ملی تھی۔ اور۔ اس کے

بعد۔۔!" ناصر نے ان دونوں کو پوری کہانی سنائی اور وہ حیران رہ گئے۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی تھی۔۔؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو احسان، اگر مجھے اندھا نہیں سمجھتے تو میرے اوپر بھروسہ کرو۔"

"کمال ہے بھئی۔ ویسے داور میرا دوست ہے۔ وہ یہاں کی بہت بڑی شخصیت ہے۔ ایک ریاست کا منیجر ہے اس لئے اس کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ داور مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ویسے کل اس نے شام کی چائے پر بھی ہمیں دعوت دی ہے۔ کل اس کے بارے میں معلوم کرینگے کہ وہ کون ہے۔؟"

"نہیں احسان۔ مجھے زیادہ سے زیادہ کل صبح روانہ ہو جانا ہے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔" پھر احسان اور رخسانہ نے لاکھ کوشش کی۔ لیکن ناصر اپنی بات پر اڑا رہا کہ کل وہ ضرور چلا جائیگا۔!

"بڑے ضدی ہو ـــــ بہرحال داور کو آج ہی اطلاع دینا ہو گی کہ کل ہم اس کے ساتھ چائے نہیں پی سکیں گے۔"

ٹرین اونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان دوڑ رہی تھی اور وہ خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیسا دیوانگی کا دورہ پڑا تھا۔ خواہ مخواہ اس فراڈ لڑکی کے چکر میں وقت برباد کیا۔ نہ جانے منحوس کون ہے اور کیوں اسے پریشان کر رہی ہے۔ بہرحال لعنت ہے اس پر جہنم میں جائے۔ وہ زبردستی ایسی باتیں سوچ رہا تھا۔ ورنہ دل کے گوشے میں بھکارن کی حسین صورت اب بھی موجود تھی اور دل ان خیالات کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹرین رکی اور اچانک چھ سات آدمی اندر گھس آئے۔ کمپارٹمنٹ میں موجود دوسرے لوگ بھی چونک پڑے تھے۔ وہ سب سیدھے اس کی طرف آئے۔

"تمہارا نام احمد ناصر ہے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"تب تم نیچے اتر آؤ۔ تم ریاست ولی پور کے قیدی ہو۔ ہم بعد میں حکومت کو رپورٹ دیدینگے۔" اس نے کہا اور دو آدمیوں نے احمد ناصر کے دونوں بازو پکڑ لئے۔

"کیا بکواس ہے۔ کیا تم لوگ پاگل ہو؟" اس نے خود کو ان کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن دو اور آدمیوں نے اُسے قابو میں کر لیا۔ پانچویں نے اس کا سامان اٹھایا اور پھر وہ اسے زبردستی نیچے اتار لائے۔ ناصر بری طرح بوکھلا گیا تھا لیکن ان لوگوں کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ ان لوگوں نے اسے ایک ٹرک پر چڑھایا۔ ناصر نے یہاں بھی کافی جدوجہد کی تو ان میں سے ایک بولا۔ "اسے بیہوش کر دو۔ ورنہ راستے بھر شور مچائے گا۔"

اور پھر پیچھے سے کسی نے اس کی ناک پر ایک رومال رکھ دیا اور کلوروفارم کی تیز بو اس کے ذہن پر چڑھ گئی۔!

ایک انتہائی اعلیٰ پیمانے پر سجے ہوئے کمرے کے نرم بستر پر آنکھ کھلی تھی۔ اس نے کمرے کی منقش دیواروں، چھت میں لٹکے ہوئے فانوس اور دیواروں پر آویزاں تصویروں کو دیکھا اور اچھل کر بیٹھ گیا۔ وہ پاگلوں کے سے انداز میں ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اسے گزرے ہوئے واقعات یاد آئے اور وہ مسہری سے نیچے اتر آیا۔ اُس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی، لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ وہ پریشان ہو کر کمرے کے وسط میں آکھڑا ہوا۔ "کیا ماجرا ہے۔ وہ کسی بدروح کے چکر میں پھنس گیا ہے کیا۔ ورنہ پھر یہ سب کیا ہے۔ یہ کونسی جگہ ہے؟" ایک بار پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور اس میز کی طرف بڑھ گیا جو ایک کونے میں رکھی ہوئی تھی اس نے میز کی درازیں کھولیں۔ ان درازوں میں بہت سے کاغذ رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان کاغذات کو الٹنے پلٹنے لگا اور پھر ایک دراز میں اسے ایک پستول نظر آیا۔ اس نے پستول نکال لیا۔ پستول میں کارتوس موجود تھے، اگر وہ کسی چکر میں پھنس گیا ہے تو یہ پستول اس کے کام آئے گا! اس نے سوچا اور پستول نکال کر جیب میں رکھ لیا۔ ابھی وہ میز کے پاس سے ہٹا بھی نہیں تھا کہ دروازے پر آہٹ سنائی دی اور پھر کوئی عورت دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور اس عورت کو دیکھ کر اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔!

یہ وہی تھی۔ سادہ سے لباس میں ملبوس۔ اس وقت اسکے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ "سرکار نے حکم دیا ہے کہ اگر آپ ہوش میں آگئے ہوں تو غسل وغیرہ کر لیں۔ سرکار آپ سے ملاقات کریں گے۔"

"سرکار کی بچی۔ تو کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ کیوں مجھے جگہ جگہ ذلیل کر رہی ہے۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟" وہ دانت پیس کر بولا اور اس نے پستول نکال کر اس کا رخ لڑکی کی طرف کر دیا۔

"ارے۔ ارے۔" لڑکی خوفزدہ ہو کر بولی "ہم تو ملازم ہیں حضور۔ ہم کیا جانیں۔ سرکار نے جو حکم دیا۔ وہی تو کریں گے۔"

"کیوں مجھے برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ کیا بگاڑا ہے میں نے تیرا۔ بول جواب دے۔" ناصر اس کی بات نظر انداز کر کے غرایا اور اسی وقت دو تین آدمی کمرے میں گھس آئے۔ اندر کا منظر دیکھ کر ان کے ہوش گم ہو گئے۔

"اس کے پاس پستول کہاں سے آگیا؟" ان میں سے ایک نے دھاڑ کر دوسرے سے پوچھا اور دوسرا کھسیانے لگا۔ "پستول رکھ دو۔ تم

ریاست کے مہمان ہو۔ بڑے سرکار سے مل لو۔ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں" اور پھر اس نے بڑی ملائمت سے ناصر کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ ناصر نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ لڑکی چپکے سے باہر نکل گئی تھی۔!

نواب ولی احمد بڑی پُررعب شخصیت کے مالک تھے۔ نہ جانے کیوں انکے سامنے پہنچ کر ناصر پر رعب طاری ہو گیا۔ وہ اپنی کیفیت بھول گیا اور خود بخود مؤدب ہو گیا۔ اس وقت کمرے میں نواب صاحب اور اس کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔!

"آؤ ناصر میاں۔" انہوں نے مسکرا کر اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں علم ہوا ہے کہ شریر حسینہ نے تمہیں بہت پریشان کیا ہے۔ بھئی کیا بتائیں بڑی شریر لڑکی ہے۔ ہمارے قابو سے باہر ہے۔ دراصل وہ ہماری واحد اولاد ہے اس لئے ہم اسے بے پناہ چاہتے ہیں۔ ایڈونچر پسند ہے نت نئی حرکتیں کرتی رہتی ہے اور ہم ہر وقت پریشان رہتے ہیں کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ ہم سے ایک ماہ کی اجازت لیکر گئی تھی اور پھر باڈی گارڈز کو جُل دیکر نہ جانے کہاں نکل گئی۔ رشید آباد میں ہمارا منیجر داور اس کے لئے سخت پریشان تھا۔ بہرصورت تمہاری بیحد تعریفیں کر رہی تھی۔ تم نے اس کی مدد بھی کی تھی۔ تمہاری وہ بیحد ممنون ہے۔ بیٹھو صاحبزادے۔ ویسے کرتے کیا ہو۔؟"

"جی۔ ایک چھوٹی سی فرم ہے۔" اس نے اپنی فرم کا نام بتایا۔

"اوہو۔ ماشاء اللہ۔ خاصی مشہور فرم ہے۔ خوب بہت خوب۔"

اور پھر نواب صاحب اس سے اس کے خاندانی حالات پوچھنے لگے اور وہ الجھے ہوئے لہجے میں ان سے گفتگو کرتا رہا۔

"میں اندر آسکتی ہوں ابا حضور۔؟" دروازے سے آواز آئی اور وہ اچھل پڑا۔ یہ وہی آواز تھی جو پہلی بار اس نے بھکارن کے منہ سے سنی تھی، لیکن اندر جو کوئی داخل ہوا اسے دیکھ کر وہ مبہوت ہو گیا۔ کیسا انوکھا حسن تھا۔ وہ سکتے میں رہ گیا۔ وہ اعلےٰ درجے کے لباس میں ملبوس تھی اور اس کے پیچھے دو خادمائیں سر جھکائے اندر آئی تھیں۔

"آپ شاید گفتگو میں مصروف ہیں۔ میں پھر آؤں گی۔" وہ بولی۔

"تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ آؤ۔" نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور وہ ملازماؤں کو واپس جانے کا حکم دیکر اندر آگئی۔ "تم نے اس شریف انسان کو بہت پریشان کیا ہے حسینہ۔ اب ان سے معافی مانگو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔" نواب صاحب بولے۔

"کیا انہوں نے میری شکایت کی ہے ابا حضور۔!" مترنم آواز گونجی

"نہیں۔ اس بیچارے نے تو ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بہرحال

اب تم انھیں اس پریشانی کا تاوان ادا کرو۔ بتاؤ ناصر میاں تم اسے معاف کرنے کا کیا جرمانہ لوگے۔"

"صرف ایک درخواست ہے۔" ناصر نے بوجھل اور اداس لہجے میں کہا

"ہاں ہاں بھئی۔ کہو۔"

"مجھے میرے شہر واپس جانے دیا جائے۔ میں فوراً چلا جانا چاہتا ہوں۔"

"ارے بھئی ابھی نہیں کچھ عرصے ہمارے مہمان رہو۔ ہم تم سے ملکر بہت خوش ہوئے ہیں۔"

"میری درخواست قبول کرلی جائے تو میں بےحد شکر گزار ہوں گا۔ ورنہ میں ایک قیدی کی حیثیت سے ہی یہاں رک سکتا ہوں۔"

"اوہ۔ نہیں۔ تم ہمارے معزز مہمان ہو۔ بہرحال تمہاری خواہش ابھی پوری ہوجائے گی۔ ہم تمہاری واپسی کا بندوبست کردیتے ہیں۔" نواب صاحب نے کہا۔ اس دوران ناصر نے ایکبار بھی مہ جبیں کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی لیکن مہ جبیں اسے دیکھکر شوخی سے مسکرا رہی تھی اور۔ اس کی آنکھوں کی انتہائی گہرائیوں میں دبا دبا پیار جھانک رہا تھا۔!

❁

یہ پندرہ دن کیسی شدید اذیت میں گزرے تھے اس کا اندازہ وہی لگا سکتا تھا۔ دیوانوں کی طرح مارے مارے پھرنا، شراب کے نشے میں دھت رہنا اس کا مشغلہ بن گیا تھا۔ لیکن شراب کا نشہ بھی مہ جبیں کے نشے کو نہیں اتار سکا تھا۔ اس کی اصل حیثیت دیکھنے کے بعد تو وہ بالکل ہی پاگل ہوگیا تھا۔ وہ اس کی پہنچ سے باہر تھی۔ وہ اس کی حیثیت سے کہیں آگے تھی۔ وہ اداس ہوگیا تھا، کہ اس بار اس کی لگن جان لیوا ہے۔ رخشاں کو بھلانے میں اسے کوئی خاص دقت نہ ہوئی تھی۔ سمن نے بھی اسے کافی دن تڑپایا تھا، لیکن مہ جبیں نے تو زندگی بھر کا روگ لگادیا تھا۔ وہ ایسے انوکھے انداز میں سامنے آئی تھی۔ وہ اتنی حیرت انگیز لڑکی تھی کہ وہ بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ اس کے نئے نئے روپ سامنے آتے گئے اور ہر روپ حیرت انگیز تھا۔ کاش وہ اتنی بلند نہ ہوتی۔ ایسی لڑکی کو پانے کے لئے وہ دنیا بھی چھوڑ سکتا تھا، لیکن اس کی حقیقت سامنے آگئی تھی اور اب۔ اس کے بس میں کچھ نہ تھا۔ اس کی صحت خراب ہونے لگی۔ دفتر کے کام سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس کا منیجر بھی سخت پریشان تھا۔ اسے فرم چلانے میں بڑی دقت پیش آرہی تھی چنانچہ اس نے اخبارات میں سکریٹری کے لئے اشتہارات دیئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ناصر سکریٹری کو اپنا کام سمجھادے اور وہ ناصر کے کام انجام دیا کریگا ورنہ فرم کے بند ہوجانے کا خطرہ تھا۔

بمشکل تمام وہ ناصر کو اس بات پر آمادہ کرسکا تھا کہ وہ سکریٹری کی امیدوار لڑکیوں کے انٹرویو لے۔ اور اس وقت ناصر کے دفتر کے سامنے بہت سی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ جو ایک ایک کرکے اندر جارہی تھیں۔ ناصر ان سے الٹے سیدھے سوالات کررہا تھا۔ پانچویں لڑکی کے بعد چھٹی کا نمبر آیا اور وہ دروازہ کھولکر اندر داخل ہوگئی۔ یہ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی تھی اس کے خوبصورت بال خاص انداز میں بنے ہوئے تھے آنکھوں پر ایک خوبصورت چشمہ لگا ہوا تھا۔ ناصر نے اسے دیکھا اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ لڑکی اس کے سامنے آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا چشمہ آنکھوں سے سرکا کر ناک پر رکھ لیا اور شوخی سے اُسے دیکھنے لگی!

"مہ جبیں۔!" ناصر کے منہ سے گھٹے گھٹے لہجے میں نکلا۔

"میرا نام روبینہ ہے جناب۔ بڑی ضرورت مند ہوں چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ ملازمت کی سخت ضرورت ہے۔"

"تم مجھے ایکبار ہی کیوں نہیں مار دیتیں۔ یوں تڑپانے سے کیا فائدہ۔ میں تمہیں بھلانے میں کامیاب نہیں ہوسکا مہ جبیں۔ للّٰہ مجھے زہر دیدو۔ مجھ سے زندگی کی اذیت اب نہیں برداشت ہوتی۔" وہ کرب سے بولا۔ "ابا حضور نے آپ کو طلب کیا ہے۔ وہ میری درخواست پر مجھے، ہمیشہ کے لئے آپ کی سکریٹری بنانے پر تیار ہوگئے ہیں۔ چنانچہ آپ فوراً اٹھیئے اور میرے ساتھ چلیئے۔"

"کیا کہہ رہی ہو مہ جبیں۔" اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ لیکن مہ جبیں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آئی۔ انٹرویو کے لئے آئی ہوئی دوسری لڑکیاں حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں!۔

❁

اور پھر۔ اپنے خوبصورت بنگلے کے حسین کمرے میں جب احمد ناصر دولہا بنا ہوا حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو پھولوں کی سیج خالی پڑی ہوئی تھی۔ وہ بری طرح چونک پڑا، لیکن اسی وقت پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔ "ایک پیسہ بابو جی۔"

اور وہ ایکدم پلٹ پڑا، چہرے پر گرد کی تہہ۔ آدھے گالوں پر پھیلا ہوا کاجل، کتھے سے لتھڑے ہوئے ہونٹ اور چیکٹ کپڑے پہنے ہوئے بھکارن ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔ اس کے لباس سے تعفّن اٹھ رہا تھا۔ ناصر نے دوڑ کر اسے گلے سے لگالیا۔

"ہاں، ہاں۔ میرے پاس پستول موجود ہے۔" بھکارن نے کہا اور مسکراتے ہوئے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔

✺

سرورق کی دوسری کہانی

عشرت ندیم

روانہ ہونے سے پہلے ڈاکٹر ریحان نے فریدہ کو اپنے مضبوط اور طاقتور بازوؤں میں سمیٹ کر اُس کا پُرجوش اور الوداعی بوسہ لیا، پھر اسے خدا حافظ کہہ کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ فریدہ اُس کی محبوب بیوی تھی۔ ڈاکٹر ریحان نے شادی سے پہلے پورے ایک سال تک فریدہ سے افلاطونی عشق کیا تھا۔ وہ اُسے بہت زیادہ عزیز تھی اور جُدائی کے مختصر لمحات میں بھی فریدہ کا تصور اسے مسلسل بے چین اور بے تاب رکھتا تھا۔

اچانک ریحان نے دروازے میں رُک کر ایک مرتبہ پھر فریدہ کی طرف دیکھا اور نگاہیں چار ہوتے ہی فریدہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ کچھ عجیب سی مسکراہٹ تھی وہ۔ ڈاکٹر ریحان کو ایسا لگا، جیسے فریدہ نے اُسے اپنی طرف متوجہ پاکر زبردستی مسکرانے کی کوشش کی ہو۔ جیسے حقیقتاً وہ

بے حد ملول، افسردہ اور پریشان ہو اور جیسے وہ مسکراہٹ اُس نے اپنے ملال، افسردگی اور پریشانی کو چھپانے کے لئے ہی اپنے ہونٹوں پر پیدا کی ہو۔ وہ کچھ اُلجھ سا گیا۔ چند لمحوں تک فریدہ کی جانب اُلجھی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر آہستہ آہستہ اُس کے قریب آکر بولا "کیا بات ہے فری! تم مجھے پریشان نظر آرہی ہو!"

"ارے نہیں" فریدہ نے کھل کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ تمہیں وہم ہوا ہے۔"

"وہم۔!" ڈاکٹر ریحان نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک طویل سانس لی۔ ذرا رُک کر بولا "نہیں ڈارلنگ! اگر یہ پہلا موقع ہوتا تو شاید میں خود کو وہم ہی میں مبتلا سمجھ لیتا۔ مگر۔ اس سے پہلے بھی درجنوں بار میں نے تمہیں پریشان اور۔۔۔ اور خوفزدہ محسوس کیا ہے۔"

فریدہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ ڈاکٹر ریحان کہہ رہا تھا "میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں فری! میں جانتا ہوں کہ کوئی بات ضرور ہے۔ کوئی ایسی بات۔ جس نے تمہیں پریشان، مضطرب اور شاید خوفزدہ کر رکھا ہے۔ ایسی کیا بات ہے ڈارلنگ۔؟"

"کوئی بات نہیں" فریدہ نے جلدی سے جواب دیا "میں نہ پریشان ہوں، نہ مضطرب نہ خوفزدہ۔"

"تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو!"

"ہرگز نہیں ریحان! آخر تم یقین کیوں نہیں کر لیتے۔"

"میں نے کہا نا کہ میری آنکھیں دھوکا کھانا نہیں جانتیں۔ شاید کسی کی بھی آنکھیں مسلسل دھوکا کھانا نہ جانتی ہوں۔ لیکن ۔۔"

جملہ ادھورا چھوڑ کر چند لمحوں تک وہ بغور فریدہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لیکر بولا "میں نے کئی بار تمہاری بدلتی ہوئی حالت کے بارے میں سوچا ہے اور اس نتیجے پر پہنچکر مجھے ہمیشہ بے حد تکلیف پہونچی ہے کہ تم شاید مجھے اپنا نہیں سمجھتیں.... دوسری صورت میں ظاہر ہے کہ تمہارا رویہ اس قدر رازدارانہ ہرگز نہ ہوتا۔"

ڈاکٹر کے الفاظ سے فریدہ کی بے چینی اور پریشانی کچھ اور بڑھ گئی وہ آہستہ سے بولی۔ "مجھے معاف کردو ریحان! میں تو تمہیں تکلیف پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی! خدا گواہ ہے کہ....."

دفعتاً ڈاکٹر نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈال کر کہا "اس وقت نہیں۔ میرے جانے کا وقت ہو چکا ہے۔ البتہ ہم رات کو ضرور اس مسئلے پر گفتگو کریں گے اور مجھے اُمید ہے کہ ایک اچھی بیوی کی حیثیت سے تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کرو گی۔" وہ اُسے خدا حافظ کہہ کر دروازے

سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد فریدہ نے ایک طویل سانس لی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پہلی مرتبہ اُسے احساس ہوا کہ اپنی اداکاری کا سلسلہ وہ کامیابی کے ساتھ نہیں جاری رکھ سکی تھی۔ دوسری صورت میں ظاہر ہے کہ ریحان کو اتنی آسانی کے ساتھ اس کی پریشانی اور خوف کا اندازہ نہ ہوپاتا فریدہ سچ مچ پریشان، گھبرائی ہوئی اور خوفزدہ تھی اور اسکی اس پریشانی گھبراہٹ اور خوف کا سلسلہ اب سے ٹھیک ایک ماہ پیشتر شروع ہوا تھا۔ اس روز اسے اس گھر میں ڈاکٹر کی بیوی کی حیثیت سے داخل ہوئے تیسرا دن تھا۔ ان کی شادی کو کل ایک ماہ اور تین روز کی مدت ہوئی تھی اور شادی کے فوراً بعد ہی وہ اپنے شوہر کے ساتھ ماہِ عسل منانے کے لئے پُرفضا پہاڑی مقامات کی سیر کے لئے چلی گئی تھی۔ واپس آنے کے بعد دو دن تک ریحان اس کے ساتھ سائے کی طرح رہا تھا مگر تیسرے دن اسے ہسپتال کی راہ لینا پڑی تھی۔ اس کی رخصت کے دن ختم ہو چکے تھے اور فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں اس کا اسپتال جانا ضروری تھا! اس دن فریدہ بہت زیادہ اداس اور مضمحل تھی۔ ریحان کے جانے کے بعد کچھ دیر وہ وسیع و عریض بنگلے کے مختلف کمروں میں چکراتی پھری اس کے بعد لان میں ٹہلنے لگی اور پھر برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گئی لیکن اس طرح اگر وہ اُکتاہٹ اور اُداسی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی، تو اُسے اپنے مقصد میں یقیناً ناکام ہونا پڑا۔

کچھ دیر بعد اُس نے لائبریری کی راہ لی۔ لائبریری میں جہاں علم طب و جراحت سے متعلق نادر کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ موجود تھا۔ وہاں دوسری قسم کی کتابوں کی بھی بھرمار تھی۔ فریدہ کو شیلفوں میں زمانہ قدیم سے متعلق کتابیں بھی نظر آئیں اور وہ بھی جن میں اقوامِ عالم کی تاریخ قلمبند کی گئی تھی۔ فلسفے کی کتابیں تھیں اور شعری مجموعے بھی۔ اور ان کے علاوہ ادب پر مشتمل کتابوں کی بھی کمی نہ تھی۔ دنیا کی ہر زبان کا ادب اس لائبریری میں موجود تھا۔ ادبِ عالیہ سے لے کر ہلکے پھلکے ادب تک۔ بے شمار کتابیں موجود تھیں۔

فریدہ چند لمحوں تک اپنے شوہر کی اس عظیم کوشش کو تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر اُس نے شیلف میں سے ایک ناول نکالا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر اس کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئی۔ ناول بے حد دلچسپ تھا اور وہ بڑے انہماک سے اس کا مطالعہ کر رہی تھی۔ پھر ہو سکتا تھا کہ انہماک کا یہ سلسلہ ناول ختم ہونے کے بعد ہی منقطع ہوتا، مگر دفعتاً وہ آہستہ سے چونک پڑی! مطالعے کے دوران بس اچانک ہی اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے مطالعہ گاہ میں اس کے علاوہ بھی کوئی موجود رہا ہو! کتاب پر سے نگاہیں ہٹا کر اُس نے بڑی عجلت میں پورے کمرے کا ایک تیز جائزہ لیا اور پھر اپنے وہم پر خود ہی مسکرا پڑی۔ پورا کمرہ خالی تھا۔ ہوا تک کی موجودگی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ دوبارہ کتاب میں منہمک ہو گئی۔ مگر اس مرتبہ انہماک کا یہ دفعہ پہلے سے بھی زیادہ مختصر ثابت ہوا۔ اُس نے دوسری مرتبہ اپنے قریب کسی کی موجودگی محسوس کی تھی اور اس احساس کے ساتھ ہی اُسے دوبارہ کتاب پر سے نگاہیں ہٹانا پڑی تھیں۔ اس مرتبہ اُس نے زیادہ دیر تک اور زیادہ گہری نظروں سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اُس کے چہرے پر حیرت اور تشویش کے سائے لہراتے نظر آئے اور آنکھوں سے بے چینی اور گھبراہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ ہر چند کہ کمرے میں اس کے علاوہ کسی اور متنفس کا پتہ نہیں تھا لیکن اس دفعہ وہ اپنے احساس کو کسی وہم کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے بڑی اچھی طرح اپنے قریب کسی کی موجودگی کو محسوس کیا تھا اور اس احساس کو جھٹلانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ کمرے میں ضرور کوئی موجود تھا۔ مگر کون؟۔ اپنے اس سوال کا جواب اُسے بار بار آنکھیں پھاڑنے کے باوجود نہ مل سکا۔

چند ثانیے اور پھر چند منٹ گزر گئے۔۔۔ کمرے میں اس کے علاوہ کسی متنفس کا پتہ نہیں تھا۔ مگر فریدہ اس کے باوجود اپنے قریب کسی کی موجودگی کو محسوس کر رہی تھی۔

اور پھر سردی کے باوجود اُسے ایسا لگا، جیسے اس کے چہرے پر پسینے کے بیشمار قطرے اُبھر آئے ہوں۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اس کرسی کی طرف دیکھ رہی تھی جو اس طرح حرکت کر رہی تھی، جیسے کوئی اُس پر بیٹھا ہوا آہستہ آہستہ جھول رہا ہو، آرام کرسی بار بار پشت کی طرف جھک جھک جاتی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے اس کی ٹانگیں دوبارہ زمین سے لگ جاتی تھیں۔

فریدہ کو اپنا سر بڑی تیزی کے ساتھ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ گھبراہٹ اور خوف کی شدت سے وہ مضطربانہ انداز میں کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اُس نے فوراً ہی مضبوطی کے ساتھ دیوار کا سہارا نہ لے لیا ہوتا، تو یقیناً لڑکھڑا کر فرش پر ڈھیر ہو جاتی!

"مم... میرے خدا...!" اُس کے ہونٹوں سے بھرّائی ہوئی آواز نکلی اور اُس نے مضبوطی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کا سارا جسم اس وقت لرزے کے کسی مریض کی طرح کپکپا رہا تھا اور چہرے پر خوف کے گہرے سائے لہرا رہے تھے۔

چند لمحے اس طرح گزر گئے... پھر اُس نے ڈرتے ڈرتے بڑی آہستگی کے ساتھ آنکھوں میں خفیف سی دراز پیدا کی اور تب اس کے ذہن کو ایک بار پھر تحیر کا ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا۔ کرسی اب اپنی جگہ پر اس طرح رکھی تھی جیسے اُس کی پہلی حرکتیں فریدہ نے خواب میں دیکھی ہوں۔ کوئی بھی تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ کرسی نے اپنی جگہ پر ذرا سی بھی حرکت کی ہو گی!

فریدہ اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑی، خاموشی کے ساتھ تھوک نگلتی رہی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور دل، جیسے سینے سے نکل کر حلق میں دھڑکنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی کرسی کے قریب پہنچی اور پھر اُس کے قدم تیزی کے ساتھ دروازے سے گزر کر کوریڈور میں اُٹھنے لگے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ بے اختیار بیڈ پر گر پڑی اور آنکھیں بند کر کے اس طرح ہانپنے لگی جیسے میلوں دوڑتی رہی ہو۔ اُس کا سارا جسم ابھی تک پسینے میں شرابور تھا اور دل کی دھڑکنیں بدستور بے ترتیب تھیں۔

یہ پہلا پُراسرار اور غیر معمولی واقعہ تھا، جو اسے اپنے شوہر کے گھر میں پیش آیا۔ کئی دن تک وہ اس پر غور کرتی رہی اور کئی بار اُس نے سوچا کہ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سے گفتگو کرے لیکن پھر یہ سوچ کر ہر مرتبہ اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا کہ ڈاکٹر ریحان اُسکی باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے اُس کا مذاق اڑانا شروع کر دے گا۔ وہ دورِ جدید کا ایک پڑھا لکھا اور روشن خیال نوجوان تھا اور اس قسم کی گفتگو کسی طرح اُسے سنجیدگی پر مائل نہ کر سکتی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ کچھ دن بعد وہ اپنے اس مشاہدے کو بھول سی گئی اور پھر وہ شاید قطعی طور پر بھول جاتی، یا اُسے اپنے وہم اور پریشانی کی پیداوار سمجھ لیتی لیکن ایک دن دوپہر کے وقت، جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھی صبح کا اخبار پڑھ رہی تھی۔ اُسے ایک مرتبہ پھر بڑے زور سے چونکنا پڑا۔ اس وقت ریحان معمول کے مطابق اسپتال میں تھا اور دونوں ملازم غالباً اپنے کمروں میں۔ چاروں طرف ایک بوجھل سا سناٹا چھایا ہوا تھا اور اس سناٹے میں کسی ستار کی آواز بالکل صاف اور واضح طور پر اُس کے کانوں میں سُنائی دے رہی تھی۔ فریدہ فنِ موسیقی سے کچھ زیادہ واقف نہیں تھی اور ساز اور آواز سے اُسے کچھ زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ستار کی اس آواز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی اور پھر آواز کا وہ تاثر بڑھتا رہا اور فریدہ کو ایسا لگا جیسے اُس کے دل و دماغ پر کوئی سحر طاری ہونے لگا ہو! حالانکہ اس آواز نے اُسے کسی حد تک خوفزدہ کر دیا تھا اور وہ بڑی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس عمارت میں ایسا کوئی فرد نہیں رہتا جو کسی قسم کا ساز بجانا جانتا ہو لیکن اس کے باوجود وہ بیڈ سے نیچے اُتر آئی اور اب وہ کسی سحر زدہ ہی کے انداز میں خوابگاہ کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ خوف کا احساس ذہن کے کسی تاریک گوشے میں جا سویا تھا اور وہ اس طرح اس آواز کی جانب کھنچی جا رہی تھی جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔

اور پھر اس کے قدم اس کمرے کے دروازے کے سامنے جا کر

ٹھہر گئے، جس میں وہ آج تک داخل نہیں ہو سکی تھی اور جو ہر وقت مقفل رہتا تھا۔ ستار کی وہ جادو بھری آواز اسی کمرے سے نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔

فریدہ چند لمحوں تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کے بند دروازوں کو گھورتی رہی اور پھر اُس کا ہاتھ خود بخود دروازے کے بند کواڑوں تک پہنچ گیا۔ ایک مرتبہ اُس نے پُوری قوت سے انھیں دھکیلنے کی کوشش کی مگر ظاہر ہے کہ مقفل دروازہ محض کواڑوں کو دھکیلنے سے نہیں کھل سکتا تھا۔

ستار کی آواز بدستور فریدہ کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ اور پھر کسی جنون کے تحت اُس نے بڑے زور سے دروازے کو دھڑ دھڑا ڈالا۔ وہ ہر قیمت پر اُس کمرے میں داخل ہونا چاہتی تھی، چاہے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے اُسے دروازے کو توڑنا ہی کیوں نہ پڑتا۔ وہ پُوری قوت سے اُسے دھڑ دھڑاتی رہی۔ اس وقت تک دھڑ دھڑاتی رہی جب تک ستار کی مسحور کن آواز کا سلسلہ منقطع نہ ہو گیا۔

اور جب آواز کا سلسلہ منقطع ہوا تو وہ یکبارگی کپکپا کر رہ گئی۔ آواز کے انقطاع کے ساتھ ہی آواز کا جادو بھی ختم ہو چکا تھا۔ اور ذہن کے تاریک گوشوں میں سو جانے والا خوف ایک مرتبہ پھر پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ چند لمحوں تک وہ سہمی ہوئی اور وحشت زدہ نگاہوں سے بند دروازے کی طرف دیکھتی رہی، پھر مُڑی اور تیزی کے ساتھ دوڑتی ہوئی اپنی خوابگاہ میں پہنچ گئی۔ اُس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور آنکھیں ابھی تک خوفزدہ انداز میں پھیلی ہوئی تھیں!

بستر پر گر کر وہ کسی خوفزدہ پرندے کی طرح ہانپنے لگی۔ اس کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا اور ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں خوفزدہ اور گھبرائے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ بڑی دیر تک ستار کی اُس پُراسرار اور مسحور کن آواز کے بارے میں سوچتی رہی۔ لیکن اُس کی عقل کسی طرح کی توجیہہ کرنے میں ذرا کامیاب نہیں ہو سکی۔ پوری عمارت میں کوئی فرد ستار بجانا نہیں جانتا تھا اور پھر وہ آواز کوریڈور کے اس دروازے سے بلند ہو رہی تھی۔ جو ہمیشہ مقفل رہا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ کمرہ مقفل تھا، جب وہ اُسے بڑے زور زور سے دھڑ دھڑا رہی تھی! پھر آخر ستار بجانے والا بند اور مقفل کمرے میں کس طرح داخل ہوا.... اور وہ کون تھا؟

فریدہ کو چند روز پہلے کا پُراسرار اور حیرت انگیز مشاہدہ یاد آ گیا۔ کرسی بالکل خالی تھی مگر اُس کی آنکھوں نے اُسے اس طرح آگے پیچھے حرکت کرتے دیکھا تھا جیسے کوئی نادیدہ اور پُراسرار ہستی اس پر جھول رہی ہو!

تو کیا دونوں واقعات کسی ایک ہی محیر العقول سلسلے کی حیرت انگیز کڑیاں تھے!؟ بظاہر تو سو فیصدی ایسا ہی معلوم ہوتا تھا کہ جیسے دونوں واقعات کی پشت پر کسی ایک ہی پُراسرار ہستی کا ہاتھ کام کر رہا ہو۔ مگر وہ ہستی کون تھی؟ — کوئی بدرُوح یا کوئی اور —؟

شام کو ڈاکٹر ریحان کی واپسی کے بعد اُس کے جی میں آئی کہ اُسے اس سلسلے میں اپنے شوہر کو کریدنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اُس نے اپنا ارادہ ایک بار پھر پہلے ہی طرح بدل دیا۔ وہ جانتی تھی کہ ریحان اس کی گفتگو کو اس کے وہم کا نتیجہ قرار دیکر ٹال دے گا۔ اور ایک ریحان پر ہی کیا منحصر، شاید کوئی بھی پڑھا لکھا شخص ان باتوں کو اہمیت دینے کو تیار نہ ہوتا۔

مگر وہ ریحان سے باتوں ہی باتوں میں اس مقفل کمرے کے بارے میں دریافت کئے بغیر نہ رہی۔ ڈاکٹر کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ فریدہ کے سوال کو اُس نے بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا اور وہ چاہنے کے باوجود اُسے مزید کریدنے کی کوشش نہ کر سکی! بہرحال یہ ضرور ہوا کہ اس کے ذہن میں ایک خلش پیدا ہو گئی اور اس کی پریشانی اور الجھنوں میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اُس کے ساتھ وہ خوفزدہ بھی تھی کسی انجانی اور اَن دیکھی ہستی کے وجود کا احساس بعض اوقات اُسے بُری طرح سہما دیتا تھا

پندرہ دن اسی خوف اور پریشانی کے عالم میں گزر گئے! اس دوران جب کبھی ریحان سے سامنا ہوا اُس نے یہی کوشش کی کہ اُسے اس کی گھبراہٹ اور خوف کا پتہ نہ چلنے پائے۔ وہ اپنے آپ کو پُوری طرح مسرور اور پُرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اگلا واقعہ سولھویں روز پیش آیا۔

وہ شام کے وقت کسی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھی کہ دفعتہً کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا اور وہ اس طرح اچھل پڑی جیسے اس کے قریب ہی کسی بم کا زوردار دھماکہ ہوا ہو۔ اس وقت اگر ہوا بند نہ ہوتی، تو شاید اُس نے یہی سمجھا ہوتا کہ بند دروازے کے اس طرح کھُل جانے میں کسی ہوا کے جھونکے کا ہاتھ رہا ہوگا۔ مگر ہوا بالکل بند تھی اور دروازہ اس طرح کھُل گیا تھا، جیسے اُس کا کھُلنا انسانی کوشش کا نتیجہ رہا ہو۔ لیکن وہ انسان کہاں تھا؟ وہ ہاتھ آخر نظر کیوں نہیں آ رہے تھے جنھوں نے دروازہ اس طرح اچانک کھول دیا تھا۔

یکایک فریدہ نے اپنے قریب ہی ہلکی سی سرسراہٹ محسوس کی اور یکبارگی اس کا دل بڑے زور سے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایسا ہی لگا تھا جیسے کوئی لباس کسی چیز سے رگڑ کھا کر سرسرایا ہو! مگر کس کا تھا وہ لباس! اور کیسا تھا.... کہ اس کی آنکھیں اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود اسے نہیں دیکھ سکتی تھیں! خوف کی شدت سے اس کا چہرہ کسی لاش کے چہرے کی طرح سفید پڑ گیا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ اور اُس کے سراپا پر خفیف سی کپکپی طاری ہو گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنی کیفیت پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرتی، اُس کے رہے سہے ہوش بھی اُڑ گئے۔ بیڈ کے قریب رکھی ہوئی کرسی بالکل ایسے ہی انداز میں اپنی جگہ پر متحرک ہوئی تھی، جیسے کسی نے اس پر بیٹھنے کی کوشش کی ہو!

فریدہ کے ہاتھ کی گرفت خود بخود بیڈ پر مضبوط ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بُری طرح پھیلی ہوئی تھیں، حلق گویا خشک ہو رہا تھا اور زبان میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ اس کی دہشت زدہ نگاہیں متحرک ہونے والی کرسی پر مرکوز تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ اس پر ضرور کوئی موجود ہے۔ کوئی پُراسرار انجانا اور اَن دیکھا وجود! پھر ہو سکتا تھا کہ خوف کی شدت اُس کے ذہن کو انتہاہ تاریکیوں میں ہی دھکیل دیتی۔ مگر بس اچانک ہی ایک کھنکتا ہوا قہقہہ اس کی سماعت سے ٹکرایا تھا اور اس آواز کو سُن کر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی تھی!

"کک... کون ہو تم —!؟" اُس نے بمشکل تھوک نگل کر خوف و دہشت سے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا

جواب میں خوابگاہ پر پُراسرار خاموشی چھائی رہی، بظاہر وہ کمرے میں تنہا تھی، لیکن اُسے یقین تھا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے۔ کوئی نادیدہ نسوانی پیکر —! چند لمحے پیشتر سنائی دینے والی ہنسی کی کھنکتی ہوئی آواز کسی مرد کی نہیں ہو سکتی تھی!

مگر وہ عورت کون ہے؟ اُسے نظر کیوں نہیں آ رہی؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟ فریدہ کے پاس ان میں سے کسی ایک سوال کا بھی جواب نہیں تھا۔ چند لمحوں تک وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کرسی کی طرف دیکھتی رہی، پھر تھوک نگل کر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی "مم..... مجھے بتاؤ کہ تت.... تم کون ہو؟ مم.... مجھے نظر کیوں نن.... نہیں آ تیں اور مجھے خوفزدہ کک.... کرنے سے تت... تمہارا مقصد کیا ہے —؟"

لیکن اس مرتبہ بھی جواب میں مکمل پراسرار خاموشی طاری رہی۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ اُس کے کانوں میں کسی کی آواز نہیں آئی۔ اور پھر اُس کے ہونٹوں سے دھیمی سی اور گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ کرسی ایک دفعہ پھر متحرک ہوئی تھی اور اس مرتبہ فریدہ کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اُس پر بیٹھا ہوا پُراسرار جسم اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے بالکل قریب آ گیا ہو اس کا جسم کسی کمزور اور سوکھے ہوئے پتّے کی طرح لرزنے لگا اور وہ گھبراہٹ اور خوف کے عالم میں کچھ پیچھے ہٹ گئی۔ اُس کی پھیلی ہوئی آنکھیں اپنے دائیں جانب خلا میں مرکوز تھیں اور اس کا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ چند لمحے گزر گئے.... اور تب۔ یکایک فریدہ کو ایسا لگا جیسے وہ سچ مچ اس کمرے میں بالکل تنہا رہ گئی ہو! نظر نہ آنے والا پُراسرار نسوانی پیکر خوابگاہ سے رخصت ہو چکا تھا اور اب وہ اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اُس نے ملازم کو بلانے کے لئے کال بیل کے پُش سوئچ پر انگلی رکھی، پھر ملازم کے آنے پر بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے بولی "پانی۔ ایک گلاس پانی دو۔"

ملازم بڑے غور سے اُس کے پریشان اور سہمے ہوئے چہرے کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ بوتل میں سے گلاس میں پانی انڈیل کر فریدہ کو دینے کے بعد اُس نے مودبانہ لہجہ میں کہا "خیریت تو ہے بیگم صاحبہ! آپ گھبرائی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔"

"نہیں، کوئی بات نہیں۔" اُس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے جواب دیا

"لیکن آپ کا چہرہ...."

"کہا نا کہ کوئی بات نہیں۔ اب تم جا سکتے ہو!"

اس جواب سے ملازم کا اطمینان تو نہیں ہوا۔ مگر اس میں مالکن سے مزید سوالات کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ چنانچہ ادب سے سر جھکا کر خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد فریدہ نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کے کسی سوال کا جواب دے کر، ظاہر ہے کہ وہ اسے دل ہی دل میں سہی، مگر ہنسنے اور مذاق اُڑانے کا موقع نہیں دے سکتی تھی۔ پھر جس وقت ریحان گھر آیا اُس نے اپنے آپ کو بڑی حد تک سنبھال لیا تھا۔

اس دن کے بعد سے اُسے تنہائی کے تصور تک سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اگر بس میں ہوتا تو وہ ایک منٹ کے لئے بھی ریحان کو اپنے سے دُور نہیں ہونے دیتی۔ لیکن یہ کسی طرح ممکنات میں سے نہیں تھا۔ ریحان سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر تھا اور وہ اپنی انتہائی خواہش کے باوجود اُسے اس کے فرائض کی بجا آوری سے نہیں روک سکتی تھی۔ یوں بھی اُسے روکنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اسے اُن سارے حقائق سے آگاہ کر دیتی جن سے اُسے دوچار ہونا پڑا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلتا۔ مذاق اور صرف مذاق! چنانچہ ان ہوشربا واقعات سے اُس نے ریحان کو ایک مرتبہ بھی باخبر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

مگر آج وہ سوچ رہی تھی کہ ایک ایک بات اُسے بتا دے گی اور سب کچھ بتا کر اُس سے کہے گی کہ وہ ہر ممکن عجلت کے ساتھ اس گھر کو چھوڑ دے شہر میں اچھے مکانوں کی کمی نہیں تھی۔ پھر کیا ضروری تھا کہ وہ اس آسیبی عمارت میں رہتے!

رات کو ریحان نے اُس سے کہا "اب بتاؤ فری! آخر کیا بات

ہے کہ پچھلے بہت دنوں سے میں تم میں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں"

"تبدیلی!" اُس نے پژمردہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک طویل سانس لی

"ہاں۔" ریحان اُس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا "کئی بار میں نے تمہیں پریشان، مضطرب اور خوفزدہ دیکھا ہے۔ اب تک اگر خاموش رہا، تو محض اس لئے کہ میرا خیال تھا تم خود ہی اپنی پریشانی اور خوف کی وجہ بتا دوگی۔ میں سمجھتا تھا کہ ہمارے درمیان کسی طرح کا راز نہیں ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہیں"

اُس کے لہجہ میں ہلکا سا طنز اور شکایت کا عنصر موجود تھا۔ فریدہ چند لمحوں تک اُس کی طرف پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتی رہی پھر اُس نے کہا۔ "تم مجھ پر طنز کر رہے ہو ریحان! یہ غلط ہے۔ اگر میں نے تم سے کچھ چھپایا تو اُس کی وجہ رازداری نہیں، بلکہ مجھے ڈر تھا کہ میری گفتگو سننے کے بعد تم اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کرو گے۔ ویسے جہاں تک کچھ چھپانے کا تعلق ہے، تو مجھے کہنے دو کہ تم نے بھی مجھ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش کی ہے۔"

"میں نے۔! میں سمجھا نہیں!"

"میں نے تم سے اس کمرے کے متعلق پوچھا تھا، جو ہمیشہ مقفل رہتا ہے۔"

"اوہ وہ!۔ وہ کمرہ!" ڈاکٹر ریحان کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ فریدہ بڑے غور سے اُس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی اور وہ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی کہ مقفل کمرے کا ذکر سُن کر وہ بے چین ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔

"اس کمرے کے متعلق تم کیا جاننا چاہتی ہو۔؟" بالآخر اُس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"صرف ایک بات۔ اور وہ یہ کہ وہ کمرہ ہر وقت مقفل کیوں رہتا ہے۔؟"

"اس کی کوئی خاص وجہ نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس میں بعض پُرانی اور ناکارہ چیزیں موجود ہیں۔ ایسی چیزیں، جن کی کبھی کوئی ضرورت نہیں پڑتی۔ چنانچہ اُسے کھولنے کی ضرورت آج تک محسوس نہیں کی گئی!"

"کیا میری خاطر تم اسے تھوڑی دیر کے لئے کھول سکتے ہو؟" فریدہ نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں۔؟" ریحان چونکے بغیر نہیں رہا۔ "تم اسے کس لئے کھلوانا چاہتی ہو۔؟"

"اس لئے ....." فریدہ نے طویل سانس لی "اس لئے ریحان کہ جو کچھ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں، اس کا کچھ نہ کچھ تعلق اس کمرے سے بھی ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے، جیسے وہ جگہ کسی آوارہ رُوح کا مسکن ہو"

اُس کے اِن الفاظ میں نہ جانے کس قسم کی تاثیر پوشیدہ تھی کہ ریحان دوبارہ چونک پڑا۔ فریدہ اُس کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب کے آثار نمایاں طور پر دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے بعد ریحان نے اپنی جگہ پر مضطربانہ انداز میں پہلو بدل کر کہا۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا! کیا تم نے وہاں کسی بدرُوح کو دیکھا ہے؟"

"نہیں۔ لیکن میں نے اس کمرے میں ایک آواز ضرور سُنی۔"

"آواز! کس قسم کی۔!؟"

"ستار کی۔ بند کمرے میں کوئی ستار بجا رہا تھا۔"

"اوہ میرے خدا۔!" ڈاکٹر ریحان آنکھیں پھیلا کر تحیّر زدہ لہجے میں بولا۔ "مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے فری؟"

"کاش میں تمہارے اس سوال کا جواب دے سکتی!"

"لیکن ... ہم ... میرا مطلب ہے ... بند اور مقفل کمرے میں آخر یہ کس طرح ممکن ہے۔ میرا خیال ہے، تمہیں ضرور وہم ہوا ہوگا۔ سو فیصدی یہی بات ہوگی۔ دراصل پچھلے دنوں تم نے بہت ساری پُراسرار کہانیاں پڑھی ہیں۔ ان ہی کا اثر ہوگا۔"

"مجھے یقین تھا کہ تم ایسی ہی کوئی بات کہو گے۔ لیکن وہم ایک آدھ دفعہ ہو سکتا ہے۔ بار بار نہیں۔" فریدہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی مسکرائی۔

"کیا مطلب۔! کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم نے ایک سے زیادہ بار اس کمرے سے ستار کی آواز سُنی ہے۔؟" ریحان نے چونک کر حیرت سے پوچھا اس دفعہ اس کی آواز میں خوف کی ہلکی سی آمیزش بھی موجود تھی، جسے فریدہ محسوس نہ کر سکی۔

"یہ بات نہیں۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔ "ستار کی آواز صرف ایک ہی مرتبہ سنائی دی تھی لیکن ....."

اور پھر اُس نے پوری تفصیل کے ساتھ وہ پُراسرار اور ہوشربا واقعات بیان کر دیئے، جو پچھلے ایک ماہ کے دوران اُس پر بیت چکے تھے۔

ڈاکٹر ریحان کسی مجسّمے کی طرح بیٹھا، فریدہ کے ہونٹوں سے نکلنے والا ایک ایک لفظ بڑے غور اور انہماک سے سُن رہا تھا۔ اُس کے خاموش ہونے پر بولا۔ "حیرت ہے، اب سے پہلے اس قسم کی باتیں محض آسیبی اور پُراسرار کہانیوں ہی میں پڑھی تھیں۔ مگر اب ... کیا تمہیں یقین ہے فری، کہ تمہارے کانوں اور آنکھوں نے کسی طرح کا دھوکا نہیں کھایا۔؟"

"اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ تم یہاں اس وقت میری آنکھوں کے سامنے موجود ہو!"

"عجیب بات ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی اس قسم کے ناقابلِ فہم واقعات جنم لے سکتے ہیں۔ بھلا ان باتوں پر کون یقین کرے گا!"

"شاید کوئی بھی نہ کرے۔ لیکن کم از کم تمہیں مجھے جھوٹا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یقین کرو کہ ستار کی آواز میں نے بڑی اچھی طرح اور اپنے ہوش وحواس میں سُنی تھی۔ پہلے مطالعے کے کمرے اور پھر میری خواب گاہ میں یقیناً کوئی نادیدہ اور پُراسرار وجود موجود تھا اور اُس کے کھنکتے ہوئے قہقہے کو میں کسی قیمت پر اپنے وہم کی پیداوار سمجھنے کو تیار نہیں ہوں۔"

ریحان خاموش رہا۔ تاہم اُس کے چہرے اور اُسکی ایک ایک حرکت سے بے چینی مترشح تھی۔

"عجیب۔ ! بے حد عجیب۔ !" چند لمحے بعد اُس نے کہا۔

"یقیناً بے حد عجیب ہے یہ سب کچھ! لیکن میں اس کمرے کو اندر سے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ اگر یہ بات فرض بھی کرلی جائے کہ بقول تمہارے اِس کمرے کو کسی بدروح نے اپنا مسکن بنا لیا ہے، تو بھی ظاہر ہے کہ تم اُسے نہیں دیکھ سکو گے۔ البتہ اس کا امکان ضرور ہے کہ وہ مفرد روح تمہیں کسی طرح کا نقصان پہنچا بیٹھے۔"

فریدہ یہ سُن کر خاموش ہوگئی۔ ڈاکٹر ریحان کا استدلال اُسے کافی وزنی اور جاندار معلوم ہوا تھا!

"اچھی بات ہے۔" ذرا دیر بعد اُس نے ایک طویل سانس لیکر کہا "مگر تمہیں مجھ سے ایک وعدہ ضرور کرنا پڑے گا۔ اور وہ یہ کہ اب ہم اس عمارت میں نہیں رہیں گے!"

"اوہ۔ لیکن ...."

"ریحان!" فریدہ نے اُس کا جُملہ مکمل ہونے کا انتظار کئے بغیر کہا۔ "یہ میری التجا ہے۔"

"اچھا۔!" ریحان نے طویل سانس لی "اگر تم یہاں رہنا نہیں چاہتیں، تو یہی سہی۔ سچ پوچھو، تو اس وقت میں خود بھی کسی دوسری جگہ منتقل ہونے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا۔ شہر میں اچھے مکانوں کی قلت نہیں ہے۔ مگر اس میں کچھ نہ کچھ وقت ضرور لگے گا۔"

"میں جانتی ہوں لیکن تم ہر ممکن عجلت کے ساتھ اس عمارت کو چھوڑ دو گے!"

"منظور ہے۔ جو تم چاہتی ہو، وہی ہوگا!"

پھر کچھ دیر بعد وہ سونے کے لئے لیٹ گئے۔ ان کے درمیان کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی۔

ریحان خاصا اُلجھا ہوا اور پریشان نظر آرہا تھا۔ بعض اوقات خوف کی پرچھائیاں بھی آنکھوں میں لہرانے لگتیں۔ اس رات وہ صبح ہونے تک جاگتا رہا۔ رات بھر نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں سے دُور رہی اور رات بھر وہ بے چینی کے عالم میں بار بار کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح جب فریدہ نے اُس کا اُترا ہوا چہرہ اور جلتی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو وہ آہستہ سے چونک پڑی اور اس کے چہرے پر بے چینی کے سائے لہرانے لگے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ریحان کے اسپتال چلے جانے کے بعد فریدہ ایک بار پھر اُس پُراسرار اور ناقابلِ فہم گورکھ دھندے میں اُلجھ گئی۔ جس نے پچھلے ایک ماہ سے اُس کی زندگی میں ایک خوفناک ہلچل پیدا کر رکھی تھی ایک کرب تھا جس سے وہ دوچار تھی اور ایک خوف تھا جس نے اس کا دن کا چین اور راتوں کی نیندیں چھین لی تھیں۔ وہ سوچتی رہی اور پھر اس کی ذہنی رو کا رُخ ڈاکٹر ریحان کی طرف ہوگیا۔ گزشتہ شب فریدہ نے اس کی بے چینی اور اضطراب پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ مگر اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہ بے چینی اور اضطراب یقیناً غیر معمولی قسم کا تھا اور اُس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی۔ کوئی ایسی وجہ۔ جس کا علم اُس کے فرشتوں کو بھی نہیں تھا اور ریحان نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس سے باخبر ہو۔ اگویا وہ ضرور کچھ نہ کچھ جانتا تھا۔ شاید اُسے اس ہستی کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ علم تھا، جس کی موجودگی کا احساس فریدہ کو بُری طرح خوفزدہ اور بدحواس کردیتا تھا اور غالباً اُس نے اس کمرے کے متعلق بھی اسے صحیح معلومات فراہم نہیں کی تھیں، جس میں سے فریدہ نے ستار کی مسحور کن آواز بلند ہوتی سنی تھی!

مگر سوال یہ تھا کہ وہ باتیں کیا تھیں، ریحان کو جن کا علم تھا اور فریدہ سے اس رازداری کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

وہ سوچتی رہی، شاید دیر تک سوچتی رہتی۔ اگر خواب گاہ کا دروازہ خود بخود اور بالکل اچانک ہی کس طرح آواز پیدا کئے بغیر نہ کھل گیا ہوتا۔ اس کا دل ایک مرتبہ پھر اچھل کر حلق میں آگیا اور دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ کمرے میں اس کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا مگر اس کے باوجود کرسی نے اپنی جگہ پر حرکت کی تھی۔ جیسے اس پر کوئی بیٹھا ہو۔

اِدھر پھر فریدہ کی آنکھوں نے ایک تحیّر خیز منظر دیکھا۔

تحیّر خیز اور بے حد عجیب منظر! کرسی پر ایک ہیولیٰ نظر آرہا تھا اور پھر! اس سے پہلے کہ وہ تحیّر اور خوف کی شدت سے چیخ پڑتی۔ کرسی پر نظر آنے والا ہیولیٰ ایک بے حد حسین اور جوان نسوانی پیکر کی شکل اختیار کرچکا تھا فریدہ نے اسے دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کا سفید بے داغ اور سڈول جسم کسی سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آرہا تھا۔ اُس کے چہرے کے نقوش بے حد تیکھے اور جاذبِ نظر تھے۔ بڑی بڑی مسحور کن آنکھیں، پتلی ستواں ناک اور سُرخ یاقوتی ہونٹ۔ ان ہونٹوں پر اس وقت بڑی گہری اور بے حد خوبصورت مسکراہٹ تھی اور اُس کے چہرے پر نظر آنے والا سیاہ چشمہ اس کی غزالی آنکھوں سے کچھ نیچے، ناک کے اگلے حصّے پر ٹکا ہوا نظر آرہا تھا

حُسن وجوانی کی وہ منہ بولتی تصویر فریدہ کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

چند لمحے گزر گئے.... فریدہ اپنی جگہ پر تھم کر کسی بُت کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ بالکل خاموش اور سحر زدہ سی!

دفعتہً اُس نے اس لڑکی کے خوبصورت یاقوتی ہونٹوں کو حرکت کرتے دیکھا... اور اسی لمحے اس نے ایک مترنم آواز سُنی "تم مجھ سے خوفزدہ ہو!"

فریدہ چونک پڑی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ خوف کی شدت سے اس کا چہرہ کسی لاش کے چہرے کی طرح سفید پڑ گیا اور وہ ایک مرتبہ پھر لرز کر رہ گئی۔ "تت... تم کون ہو؟"

"ایک رُوح۔ جسے اُس کے جسم سے علیحدہ ہوجانے پر مجبور کردیا گیا ہے۔" لڑکی نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ پھر ذرا رُک کر بولی "میرا نام سلوانا ہے۔ کبھی میں بھی تمہاری طرح جیتے جاگتے اور شاداب جسم کی مالک تھی مگر اب۔ !"

"اب کیا ہے۔؟" فریدہ کی آواز میں خوف کے ساتھ ہی بے چینی اور تجسس کی آمیزش بھی تھی۔ "تم خاموش کیوں ہوگئیں؟"

"ایسے ہی۔ میں کہہ رہی تھی کہ اب میں محض ایک روح ہوں۔ ایک ایسی رُوح جس کے پاس کوئی جسم نہیں!"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تم اس وقت میری آنکھوں کے سامنے موجود ہو۔ میں تمہارا جسم دیکھ رہی ہوں۔ تمہارے سارے نقش ونگار میرے سامنے ہیں۔ تم خوبصورت ہو۔ بہت زیادہ خوبصورت۔ تمہارے بال سنہری ہیں۔ تم نے چشمہ لگا رکھا ہے اور تمہارے جسم پر انگوری رنگ کا بند گلے کا سوئٹر موجود ہے۔ میں بہت صاف طور پر تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ تمہارا کوئی جسم نہ ہو!" فریدہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔ نہ جانے کیوں اس لڑکی سے ملنے اور اُس سے گفتگو کرنے کے بعد اس کا خوف بڑی حد تک دُور ہوگیا تھا البتہ تحیّر اور تجسس میں ضرور زیادتی ہورہی تھی اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں سلوانا کے لئے ہمدردی کے جذبے کا احساس ہورہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے تک، جس کا تصور ہی اُس کے رونگٹے کھڑے کردینے کے لئے کافی تھا۔ اس وقت وہ اس کے لئے ہمدردی محسوس کررہی تھی!

سلوانا کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی "تم اسے نہیں سمجھ سکو گی فریدہ!"

"اوہ! تم تو میرا نام بھی جانتی ہو۔"

"میں اور بھی بہت کچھ جانتی ہوں۔ مثال کے طور پر مجھے معلوم ہے کہ تم ڈاکٹر ریحان کی بیوی ہو۔ شروع میں وہ ہر لڑکی سے بڑا افلاطونی عشق کرتا ہے۔ مگر پھر رفتہ رفتہ....."

"ٹھہرو!" فریدہ ہاتھ اٹھا کر بولی "تمہارا ریحان سے کیا تعلق ہے۔؟"

"اسے چھوڑو! میں اس وقت تمہارے سوالوں کے جواب دینے نہیں آئی ہوں۔"

"پھر؟ کیوں آئی ہو۔ کیا تمہاری اس وقت کی آمد کا کوئی خاص مقصد ہے۔؟"

"ہاں۔ تم مجھے ایک اچھی لڑکی نظر آرہی ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ تم میری مدد ضرور کرو گی۔"

"مدد۔!" فریدہ تحیّر زدہ ہوکر بولی "کیسی مدد؟ کیا کسی روح کو بھی کسی مدد کی ضرورت پیش آسکتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔ اب مجھ ہی کو دیکھ لو۔ میں ایک روح ہونے کے باوجود تمہاری مدد کی طلبگار ہوں۔ دراصل جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد روح اپنی تمام تر طاقت اور توانائی کھو بیٹھتی ہے۔ میں تو کرسکتی ہوں کہ تمہیں اس قدر خوفزدہ کردوں کہ تم مرجاؤ۔ لیکن میں اپنے ہاتھوں سے تمہارا گلا نہیں دبا سکتی تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا۔؟"

"کچھ کچھ۔ لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم مجھ سے کس قسم کی مدد کی طالب ہو۔!"

"میں.... میں تمہارا جسم چاہتی ہوں۔"

"کیا مطلب۔؟"

"مجھے اس کی ضرورت ہے مگر مستقل طور پر نہیں — بلکہ

صرف تھوڑی سی دیر کے لئے۔ اگر تم اپنا جسم میرے حوالے کرنے کو تیار ہو جاؤ تو میرا وعدہ ہے کہ اُسے بہت جلد تمہیں واپس کر دوں گی۔"

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر تم سچ مچ ایک رُوح ہی ہو تو میں کسی قیمت پر اپنا جسم تمہارے حوالے نہیں کروں گی۔ چند منٹ کیلئے بھی نہیں!"

"لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ میری وجہ سے تمہارے جسم کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچے گا۔ کیا تم ایک عورت ہو کر ایک مظلوم عورت کی اتنی ذرا سی مدد نہیں کر سکتیں۔؟"

"نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس سلسلے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتی۔ لیکن تمہیں کسی انسان کے جسم کی ضرورت کیوں ہے؟"

"یہ بھی میں تمہیں بتا دوں گی۔ لیکن ابھی نہیں۔ بلکہ تمہارا جسم واپس کرنے کے بعد!"

"مگر میں کسی قیمت پر اپنا جسم تمہارے حوالے نہیں کروں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ اور بہتر ہوگا کہ تم اس عمارت کو چھوڑ دو!.... ورنہ میں اس کمرے کو آگ لگا دوں گی، جس میں تمہارا مسکن ہے... میں اس کمرے سے واقف ہوں۔ میں نے اپنے کانوں سے اس میں سے ستار کی آواز سنی تھی"

پھر فریدہ شاید کچھ اور بھی کہتی۔ لیکن اس سے پہلے ہی کمرے کے دروازے میں ڈاکٹر ریحان کی صورت نظر آئی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے کرسی پر بیٹھا ہوا نسوانی ہیکر جیسے فضا میں اچانک تحلیل ہو گیا تھا۔

ریحان دروازے میں کھڑا ہوا اُسے اُلجھی ہوئی اور حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ظاہر ہے کہ وہ بُری طرح بوکھلائے بغیر نہیں رہی ہوگی۔

"خیریت تو ہے فری؟" ڈاکٹر ریحان اُس کے قریب آکر رُک گیا۔ "تم اس وقت بہت زیادہ پریشان نظر آرہی ہو!..... اور ابھی تنہائی میں باتیں کس سے کر رہی تھیں۔؟"

فریدہ چند لمحوں تک اپنے آپ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتی رہی، پھر دفعتہ آگے بڑھ کر شوہر سے لپٹ گئی "ریحان!" اُس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "ابھی ابھی وہ پھر یہاں موجود تھی۔ مجسم حالت میں!"

"کیا کہہ رہی ہو؟" ریحان چونکتا ہوا بولا "کون موجود تھی یہاں۔؟"

"سنہرے بالوں والی لڑکی۔ اُس نے اپنا نام سلوانا بتایا تھا۔"

"سلوانا۔!" ریحان بڑے زور سے اچھل پڑا۔ "اس نے اپنا نام سلوانا بتایا تھا۔"

"ہاں۔ شاید یہی نام بتایا تھا اُس نے۔ وہ کوئی بد رُوح ہے ریحان۔ کہہ رہی تھی کہ اسے اُس کے جسم سے زبردستی علیحدہ کر دیا گیا ہے"

"آخر تم اس عمارت کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ یا یہ چاہتے ہو کہ میں پاگل ہو جاؤں۔؟"

"ہرگز نہیں ڈارلنگ! ہم بہت جلد اس عمارت کو خیرباد کہہ دیں گے۔ لیکن کیا کہا تھا تم نے؟۔ اس نے اپنا نام سلوانا بتایا تھا اور اس کے بال سنہرے تھے۔؟"

"ہاں" فریدہ نے ریحان کے خوف اور تحیّر کو محسوس کئے بغیر کہا "اُس نے اپنا نام سلوانا بتایا تھا اور اُس کے بال سنہرے تھے۔ اُس کے چہرے پر چشمہ بھی موجود تھا اور وہ بند گلے کے انگوری رنگ کے سوئٹر میں ملبوس تھی۔ میں نے اس قدر خوبصورت لڑکیاں بہت کم دیکھی ہیں۔ مگر!۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اُسے لڑکی نہیں کہنا چاہیئے۔ وہ یقیناً کوئی بد رُوح ہے۔ اُس نے خود اپنے رُوح ہونے کا اعتراف کیا تھا"

"اوہ! میرے خدا! یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کس طرح ممکن ہے"۔ اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا اور فریدہ کو اپنے جسم سے علیحدہ کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد بولا "اور کیا کہا تھا اُس نے تم سے۔؟"

جواب میں فریدہ نے ریحان کے سامنے اپنی اور سلوانا کی رُوح کی ساری گفتگو دوہرا دی۔

"اوہ۔ اوہ!" وہ اُس کے خاموش ہونے پر مضطربانہ انداز میں بولا "وہ شیطان کی بچی تم سے تمہارا جسم مانگ رہی تھی۔! بڑا اچھا کیا تم نے اُسے دُھتکار دیا!"

"میں اس وقت اس سے خوفزدہ نہیں تھی۔ حالانکہ اب میں سوچ رہی ہوں کہ مجھے اُس کی صورت دیکھتے ہی بے ہوش ہو جانا چاہیئے تھا، مگر۔!" فریدہ نے بڑے غور سے ریحان کے چہرے کی طرف دیکھا "کیا تم اُسے جانتے ہو ریحان۔؟"

"میں۔!" وہ چونکتا ہوا بولا "نہیں تو۔ میں بھلا اُسے کس طرح جان سکتا ہوں"

"لیکن میرا خیال ہے کہ تم اتنے انجان ہرگز نہیں ہو سکتے جس قدر خود کو ظاہر کر رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں اگر سب کچھ نہیں، تو بہت کچھ ضرور معلوم ہے۔ تم جان بوجھ کر مجھے تاریکی میں رکھنا چاہتے ہو!"

"ہرگز نہیں۔ تمہارا خیال سو فیصدی غلط ہے۔ اس عجیب و غریب گورکھ دھندے کے متعلق میرے فرشتے بھی کچھ نہیں جانتے۔ سچ پوچھو تو ان حیرت انگیز اور پُراسرار واقعات نے میری عقل چکرا کر رکھ دی ہے۔ آج اسپتال میں بھی کام نہیں ہو سکا۔ تم دیکھ ہی رہی ہو کہ میں وقت سے بہت پہلے آگیا ہوں"

"ہوں" فریدہ نے ہنکارا بھرا۔ چند لمحوں تک ریحان کو گہری اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی "اُسے تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے"

"ہوگا۔ تم خود ہی کہہ چکی ہو کہ وہ ایک شیطانی رُوح ہے۔! اور اب میرا خیال ہے کہ اس قصّے کو ہمیں یہیں ختم کر دینا چاہیئے۔ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ ہم اس عمارت کو بہت جلد چھوڑ دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ دو چار روز میں ہی کوئی مناسب جگہ مل جائے گی!"

فریدہ خاموش ہو گئی۔ اب یہ اور بات ہے کہ ریحان کی گفتگو سے مطمئن نہ ہو سکی ہو!

رات کو وہ ایک فلم کا آخری شو دیکھنے چلے گئے۔ کافی دلچسپ فلم تھی مگر اب اسے کیا کیا جاتا کہ فلم کے دوران وہ دونوں ہی دماغی طور پر غیر حاضر رہے تھے۔ خاص طور پر ڈاکٹر ریحان کا ذہن بڑی تیزی کے ساتھ سلوانا کی رُوح اور اُس کی جسم حاصل کرنے کی خواہش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فریدہ کے بیان کے مطابق رُوح نے اس کا جسم حاصل کرنا چاہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کسی رُوح کے لئے کسی کا جسم حاصل کر لینا ممکن تھا یا نہیں۔ مگر وہ اس خواہش کی تہہ تک پہنچنا ضرور چاہتا تھا۔ سلوانا کی رُوح آخر کیوں فریدہ کا جسم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ بھی محض تھوڑی دیر کیلئے! آخر کیوں ۔؟ یہ تو ظاہر تھا کہ اس عجیب اور پُراسرار خواہش کے پیچھے ضرور کوئی گہرا مقصد کام کر رہا تھا۔ مگر وہ مقصد کیا تھا؟ ریحان مسلسل غور و فکر کے باوجود اپنے اس سوال کا جواب نہیں پا سکا۔

فلم ختم ہونے کے بعد وہ کار میں بیٹھ کر گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر ڈاکٹر نے کار گیراج میں پہنچائی اور فریدہ کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا عمارت کے برآمدے کی طرف ہو لیا۔ مگر اس سے پہلے کہ اُس کے قدم برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچتے، دفعتہً وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ فریدہ اس سے پہلے ہی ٹھہر چکی تھی اور اُس کی نگاہیں اپنے قریب ہی لان پر کھڑی اس لڑکی پر مرکوز تھیں جسے اُس نے اس سے پہلے آج ہی اپنی خواب گاہ میں موجود پایا تھا اور جس کے سُرخ یاقوتی ہونٹوں پر اس وقت بھی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ بے حد تلخ اور زہریلی مسکراہٹ! اُس کی نظریں ڈاکٹر ریحان کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ اس طرح اُسے دیکھ رہی تھی، جیسے اُس کی گھبراہٹ، خوف اور پریشانی سے محظوظ ہو رہی ہو۔ اُس کا مضحکہ اُڑا رہی ہو!

فریدہ نے گھوم کر سہمی ہوئی نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر قریب پہنچ کر اُس کے سینے سے جا لگی۔ اُس کا پورا جسم بڑے زور سے کپکپا رہا تھا اور چہرے پر خوف کے گہرے سائے لہرا رہے تھے۔ چند لمحے اسی طرح گزر گئے اور پھر وہ سلوانا کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ تجسّس ایک مرتبہ پھر رفتہ رفتہ خوف اور گھبراہٹ پر غالب آتا جا رہا تھا۔

سلوانا کی مسکراتی ہوئی نظریں بدستور ڈاکٹر ریحان پر مرکوز تھیں۔ اچانک اُس کے ہونٹوں میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک عجیب سا ترنم گھُل گیا۔ "کیا بات ہے ریحان! تم اس طرح کیوں رک گئے، کیا مجھ سے خوفزدہ ہو۔؟"

"نہیں" ریحان نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تم سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ مگر تم ہو کون۔؟"

"اوہ! کیا تم سچ مچ مجھے نہیں پہچانتے! اتنی جلدی بھول گئے ریحان۔!"

"بکومت۔! میں فریدہ کی طرح وہمی اور کمزور دل کا مالک نہیں ہوں۔ تمہارا یہ سوانگ کم از کم مجھے خوفزدہ نہیں کر سکے گا" ریحان نے کہا۔ اس وقت وہ سچ مچ بڑی جراُت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا اور اُس کی نال کا رُخ سلوانا کی طرف کر کے غرّاتی ہوئی آواز میں بولا "اب تمہیں یہ ناٹک ختم کرنا ہی پڑے گا!"

"ناٹک!" وہ بڑی زہریلی سی ہنسی ہنسی "کیا تم سچ مچ اسے ناٹک سمجھتے ہو ریحان۔؟"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ مرنے والا کسی قیمت پر دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ اور میں اس کا بھی قائل نہیں کہ رُوح جسم کی موت کے بعد بھی دنیا میں موجود رہ سکتی ہے۔ چنانچہ تمہارے فرشتے بھی مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے"

"سچ مچ بڑے چالاک اور ہوشیار ہو تم" سلوانا یا اس کی رُوح نے طنزیہ لہجے میں کہا "مگر تمہیں شاید فریدہ کی بتائی ہوئی باتیں اس وقت یاد نہیں۔ کیا اُس نے مجھے دیکھے بغیر ہی میری موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا اور کیا اُس نے تمہیں نہیں بتایا کہ اُس نے اپنے کانوں سے بند کمرے میں ستار کی آواز سنی تھی۔!؟"

ریحان کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا اور اس کے سیدھے ہاتھ میں خفیف سی کپکپاہٹ دوڑ گئی۔ تاہم جلد ہی اُس نے اپنے ذہن کو سنبھال لیا "تمہاری ساری شعبدہ بازی میرے علم میں ہے!" اُس نے کہا "مگر اب یہ کھیل تمہیں جلد ہی ختم کر دینا چاہیئے۔ دوسری صورت میں میرا پستول تمہارے اس رُوحانی جسم میں کم از کم آٹھ سوراخ ضرور کر دیگا ویسے کیا پولیس کو ایک رُوح کی لاش دیکھ کر خوشی نہیں ہوگی؟"

"تم احمق ہو ریحان۔ مگر نہیں۔ تم بے حد چالاک ہو۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری ساری گفتگو بے سر و پا بکواس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی لیکن اس کے باوجود تم یہ بکواس کرنے پر مجبور ہو، تاکہ فریدہ کا ذہن صحیح خطوط پر نہ سوچ سکے اور وہ کبھی نہ جان سکے کہ ماضی میں میرے اور تمہارے درمیان کسی قسم کا تعلق تھا اور یہ کہ تمہارا دامن ابھی تک میرے خون سے آلودہ ہے۔"

"بکومت۔!" ڈاکٹر ریحان چیخا "یہ غلط ہے۔ میرا کبھی تم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔"

پھر فریدہ کو بس اچانک ہی اس کے خطرناک ارادے کا علم ہوا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرتی، سلوانا کا پُراسرار پیکر خود ہی فضا میں تحلیل ہو گیا تھا۔

ریحان کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ پڑا۔ اس کی خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی آنکھیں اپنے گرد و پیش میں بڑی تیزی کے ساتھ تلاش کر رہی تھیں لیکن اس کا جسم اس جگہ موجود ہوتا تو نظر بھی آتا۔

"ریحان!" فریدہ کے ہونٹوں سے سہمی ہوئی مرتعش آواز نکلی۔

ریحان نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اس کا بازو مضبوطی کے ساتھ پکڑا اور اُسے ساتھ لے کر تیزی کے ساتھ برآمدے کے ساتھ بڑھ گیا۔ چند لمحے بعد وہ دونوں خواب گاہ میں موجود تھے۔ ریحان ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو بڑی حد تک سنبھالنے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن فریدہ کے جسم پر بدستور کپکپاہٹ طاری تھی۔

"ریحان۔!" خواب گاہ میں پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو ڈھیر کرتے ہوئے کہا "یہ سب کیا ہے ریحان! یقین کرو کہ ان حالات میں میں بہت جلد پاگل ہو جاؤں گی۔!"

"گھبراؤ مت!" ریحان اس کا بازو تھپتھپاتا ہوا بولا۔ "پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ جلد ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا!"

"میں نہیں مان سکتی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے، جیسے بہت جلد کوئی ہولناک اور انہونا واقعہ رونما ہونے والا۔ شاید اس عمارت کے اسرار میری جان لے کر ہی ختم ہوں گے۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو! گھبرانے اور خوفزدہ ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

"لیکن میں کس طرح ان ہولناک اور پُراسرار حالات کا مقابلہ کروں۔ اب تو تم نے بھی اُسے دیکھ لیا ہے۔ مگر تم مجھے اس کے بارے میں کچھ بتانے کو کیوں تیار نہیں ہوتے۔ آخر وہ ایسا کونسا راز ہے، جسے تم مجھ سے چھپانا چاہتے ہو۔!؟"

"کوئی راز نہیں۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"میں نہیں مان سکتی۔ کوئی راز ہے ضرور، جسے تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ اس قسم کی کوئی بات نہیں۔ اور اب میرا خیال ہے کہ تمہیں لباس تبدیل کر کے سو جانا چاہیئے۔"

"کیا کہا تم نے۔! سو جانا چاہیئے۔ کیا کوئی کبھی ایسے ہولناک اور رُوح فرسا حالات میں سو سکتا ہے۔" فریدہ نے آنکھیں نکالیں۔ چند لمحے بعد اُن میں آنسو بھر آئے اور پھر وہ کسی ننھی منی بچی کی طرح رونے لگی۔ "میں نہیں مان سکتی" اُس نے روتے ہوئے کہا۔ "تم ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو اُس کی وہ باتیں قطعاً بے سر و پا نہیں ہو سکتیں۔ وہ جھوٹی نہیں معلوم ہوتی اُس نے کہا تھا کہ تمہارے اور اُس کے درمیان ماضی میں کوئی گہرا اور قریبی تعلق رہا ہے۔ اور.... اور تم مجرم بھی ہو ریحان! شاید اس نے ٹھیک ہی کہا ہو کہ تمہارے ہاتھ اُس کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ اوہ میرے خدا! میں کیا کروں۔ یہ تو نے مجھے کن حالات سے دوچار کر دیا ہے۔؟"

آنسوؤں کی روانی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ کسی بچی کی طرح رو رہی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر۔ بلک بلک کر۔ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان! اس وقت تک وہ اسی طرح آنسو بہاتی رہی، جب تک کہ نیند کی دیوی کو اس پر رحم نہیں آ گیا۔

دوسرے دن جب وہ بیدار ہوئی تو ریحان کمرے میں موجود نہیں تھا البتہ اس کی تحریر ضرور میز پر موجود تھی۔ اُسے پڑھ کر فریدہ نے ایک طویل سانس لی۔ ریحان کسی دوسرے مکان کی تلاش میں اتنی جلدی گھر سے چلا گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ شب کے واقعات فلم کے متحرک مناظر کی طرح حرکت کرنے لگے... اور پھر! کچھ دیر بعد اُس کے ذہن میں ایک نیا خیال کلبلایا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ کمرے میں چابیوں کا گچھا تلاش کر رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ان واقعات کا کچھ نہ کچھ تعلق مقفّل کمرے سے ضرور ہے۔ ڈاکٹر ریحان کی واپسی سے پہلے ہی وہ اُسے کھول کر اچھی طرح دیکھ لینا چاہتی تھی!

چند منٹ بعد وہ دروازے کے سامنے نظر آئی۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں زنگ آلود چابیوں کا ایک مختصر سا گچھا تھا اور وہ ان چابیوں کی مدد سے پھرتی کے ساتھ دروازے کا قفل کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اُس کا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا اور آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا رہے تھے محض تجسّس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس جگہ آ پہونچی تھی۔ اور اگر اُس کے خیال میں اس کمرے سے کسی پُراسرار اور سربستہ راز کا تعلق نہ ہوتا، تو ستار کی آواز سننے کے بعد تو وہ بھول کر بھی اِدھر کا رُخ نہ کرتی۔

اندر پہنچ کر اُس نے فوراً ہی دروازہ بند کر لیا۔ اور اب اُس کی نگاہیں ملگجے اندھیرے میں کمرے کے ساز و سامان کا جائزہ لے رہی تھیں وہ کمرہ غالباً کبھی کسی مصوّر کے اسٹوڈیو کے طور پر استعمال ہوتا رہا تھا۔ فریدہ کو اس جگہ کئی ادھوری تصویریں اور اسکیچ نظر آئے۔ ایک جانب ایزل پر کینوس بھی چڑھا ہوا تھا اور اُس کے قریب ہی پانی کے ساتھ استعمال ہونے والے رنگ، برش اور پیالیاں موجود تھیں مگر ان سب پر گرد کی ایک دبیز تہہ نظر آ رہی تھی اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ کمرے کو آج ایک طویل عرصے کے بعد کھولا گیا تھا۔

فریدہ کی تجسّس آمیز نگاہیں تصویروں کا جائزہ لینے لگیں۔

اُن میں سے کئی میں خوبصورت قدرتی مناظر کی عکاسی کی گئی تھی، کچھ میں انسانی چہرے نظر آ رہے تھے۔ اُس نے غور سے ایک ایک چہرے کو دیکھنا شروع کیا اور پھر اُس کی آنکھوں میں ایک تیز چمک جاگ اُٹھی۔ اس کے ہاتھ میں لرزتی ہوئی تصویر ریحان کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی پھر اُسے اپنے شوہر کی دو تصویریں اور ملیں اور آخر میں اُس نے جس تصویر کو دیکھا، اُس پر نظر پڑتے ہی اُس کے دل کی دھڑکنیں ایک مرتبہ پھر بے ترتیب ہو گئیں۔ دیر تک وہ اس نسوانی چہرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتی رہی۔ وہ چہرہ سو فیصدی سلوانا کا تھا۔

فریدہ کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اب اس حقیقت میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ ریحان اس سے مسلسل جھوٹ بول رہا تھا اور سنہرے بالوں والی وہ لڑکی اس کے لئے ذرا بھی اجنبی نہیں تھی۔ فریدہ دیر تک اس تصویر کو گھورتی رہی، پھر اُس نے ایک طویل سانس لی اور اس وقت اس کی نظریں کمرے کے ایک گوشے میں رکھے ہوئے گرد آلود ستار پر مرکوز ہو گئیں۔ یہ اُس کے ذہن کے لئے حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ دیر تک اس ستار کے متعلق سوچتی رہی اُسے یقین تھا کہ موسیقی کی وہ آواز اسی ستار کے تاروں سے بلند ہوئی تھی۔ اس کمرے میں رہنے والا، ایک مصوّر ہونے کے ساتھ ساتھ غالباً ایک ماہر فن ستار نواز بھی تھا۔ اسٹوڈیو نما کمرے میں اس کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی۔ کمرے کا مالک یقیناً تصویروں سے تھک کر ستار سے دل بہلانے کی کوشش کرتا ہوگا۔ وہ سوچتی رہی۔ سوچتے سوچتے اُسے گھبراہٹ کا احساس ہونے لگا اور جب گھبراہٹ ناقابلِ برداشت ہو گئی تو اُس نے لباس تبدیل کیا اور ہلکا سا میک اپ کر کے عمارت سے باہر نکل گئی۔ اس کا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ کچھ وقت کسی کھلے ہوئے اور پُرفضا مقام پر گزارنا چاہتی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اُس نے نشست کی پشت گاہ سے اپنا سر ٹکا لیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں لیکن اس کے باوجود وہ دو انسانی چہروں کو دیکھ سکتی تھی۔ اُن میں سے ایک چہرہ ریحان کا تھا اور دوسرا سلوانا کا۔ دونوں چہرے بار بار شعور کی سطح پر ابھر رہے تھے۔ وہ بند آنکھوں کے ساتھ انھیں بار بار ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے دیکھ رہی تھی۔

یکبارگی اُس نے پوری شدت کے ساتھ آنکھیں کھول دیں۔ حلق سے ایک کربناک چیخ بھی بلند ہوئی تھی اور اُس کے ساتھ ہی اُس کا جسم ایک جھٹکے کے ساتھ کھل جانے والے دروازے کی راہ سے نکل کر باہر سڑک پر جا گرا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں مجمع اکٹھا ہو گیا۔ حادثہ بے حد شدید تھا۔ ٹیکسی ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو چکی تھی۔ ڈرائیور کا جسم بے جان تھا جبکہ فریدہ صرف بے ہوش نظر آ رہی تھی لیکن یہ اور بات ہے کہ اُس کے زندہ بچ جانے کا امکان چند فیصد سے زیادہ نہ رہا ہو۔

ڈاکٹر ریحان کو جب اس رُوح فرسا حادثے کی اطلاع ملی تو وہ فوراً ہی اسپتال پہنچ گیا۔ اس وقت تک دوسرے ڈاکٹر فریدہ کے معائنے سے فارغ ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر صدیقی اُسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "گھبرانے کی بات نہیں ہے ڈاکٹر! مجھے اُمید ہے کہ ہم تمہاری بیوی کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"اوہ۔ کیا تمہیں یقین ہے دوست۔ یا تم مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے ہو؟ میں نے سنا ہے حادثہ بہت زیادہ خطرناک تھا۔"

"تم نے غلط نہیں سنا تھا۔ مگر ہم مایوس نہیں ہیں۔ خدا نے چاہا تو تمہاری بیوی ضرور بچ جائے گی۔" ڈاکٹر صدیقی نے بڑے وثوق کے ساتھ جواب دیا۔

اور پھر فریدہ سچ مچ بچ گئی۔ ایک دو مہینے کے بعد ریحان اُسے گھر لے گیا لیکن یہ وہ گھر نہیں تھا جس میں وہ حادثے کا شکار ہونے سے پہلے موجود تھی۔ اُس کی غیر موجودگی میں ریحان نے وہ گھر چھوڑ دیا تھا۔ اسپتال سے رخصت ہو کر وہ نئے گھر میں آئی تھی۔

دوسرے دن ڈاکٹر نے اپنے دوستوں کو ایک شاندار ٹی پارٹی دی۔ نصف شب تک طوفانِ بدتمیزی برپا رہا۔ رات گئے تک بے تکلف احباب چیختے چلّاتے اور ہنستے مسکراتے رہے اور پھر جب وہ چلے گئے تو ریحان نے فریدہ کا ہاتھ پکڑ کر خواب گاہ کی راہ لی۔ پارٹی اور اُس کی دھماچوکڑی نے اُسے بُری طرح تھکا ڈالا تھا اور فریدہ تو ابھی تھی ہی کمزور و ناتواں۔! جس

وقت وہ کمرے میں پہنچے، فریدہ کی آنکھوں میں اُلجھن تیر رہی تھی۔

ڈاکٹر ریحان نے پہلے تو اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی مگر پھر اُس کے چہرے پر سوچ اور تذبذب کے سائے دیکھ کر اُسے جلد ہی اس طرف متوجّہ ہونا پڑا۔

"فری!" اُس نے فریدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "میرا خیال ہے تم کوئی خاص بات سوچ رہی ہو!"

"ہاں!" فریدہ کے لہجے میں ایک عجیب سی گمبھیرتا تھی۔ "میں سوچ رہی ہوں ریحان کہ مجھے اب اور وقت برباد نہیں کرنا چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری محبّت مجھے کسی امتحان میں مبتلا کردے!"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا!"

جواب دینے سے پہلے چند لمحوں تک وہ سوچتی رہی پھر اُس کا ذہن کسی خاص فیصلے پر پہنچ گیا۔ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس نے میز کی دراز کھولی اور پھر جب وہ ڈاکٹر ریحان کی طرف گھومی تو اُس کا چہرہ کسی پتھر کی طرح سخت اور بے جان نظر آرہا تھا اور اُس کے ہاتھ کی گرفت پستول کے دستے پر تھی۔

"میں ۔! میں سمجھا نہیں فریدہ!" ریحان اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے گھبرا کر بولا۔

"فریدہ ۔ ہُنہ!" وہ تحقیر آمیز انداز میں مسکرائی "سلوانا کہو ریحان! فریدہ اس دنیا میں کہاں! وہ تو اسی وقت سرد ہوگئی تھی جب اُس کے بے ہوش جسم کو اب سے دو ماہ پیشتر اسپتال لے جایا جارہا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا، کیونکہ اپنے قاتل اور بے وفا شوہر سے انتقام لینے کے لئے مجھے ایک جسم کی ضرورت تھی۔ ایک ایسے جسم کی، جس پر تم اعتماد کرسکتے اور ایسا جسم فریدہ اور صرف فریدہ کا تھا۔ آہا۔ تم اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی۔ مجھے سچ مچ تم سے انتقام لینا تھا۔ مجھے اس کا حق تھا ریحان! میں بے گناہ ہونے کے باوجود قتل کردی گئی تھی محض اس لئے کہ تمہارا دل مجھ سے خوب اچھی طرح بھر چکا تھا اور تمہیں نت نئے خوبصورت اور جوان جسموں کی ضرورت تھی۔ تم اپنی خواب گاہ میں کسی اور حسین اور پُرشباب لڑکی کو دیکھنا چاہتے تھے لیکن میری زندگی میں یہ ناممکن تھا۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ تمہیں معلوم تھا کہ میری موجودگی میں تم اپنے شیطانی مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکو گے۔ لہٰذا تم نے مجھے اپنی راہ سے ہٹانے کا فیصلہ کیا اور پھر ایک دن ایک ایسے مہلک اور سریع الاثر زہر کی مناسب مقدار میرے جسم میں منتقل ہوگئی، جو لاش کی جلد پر اپنا کوئی معمولی سا اثر بھی نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ لوگوں نے یقین کرلیا کہ میں حرکتِ قلب بند ہونے سے مرگئی ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟ تم کس قدر چالاک ہو ریحان اور کیسا کامیاب منصوبہ تیار کیا تھا تم نے ایک وفادار اور محبّت کرنے والی بیوی کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے۔ مگر تم ایک بات بھول گئے۔ میرا وہ عہد۔ جو میں نے بارہا تم سے کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ محبّت کے معاملے میں، میں انتہائی حد تک جذباتی ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ مرنے کے بعد میری رُوح تمہاری زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارے گرد منڈلاتی رہے گی۔ تو یہی ہوا ریحان! میری روح تمہارے گرد منڈلاتی رہی۔ اپنا انتقام لینے کے لئے۔ اگرچہ تم مجھ سے اس حد تک متنفر ہوگئے تھے کہ میرا نگار خانہ تک مقفّل کردیا تھا۔"

کچھ دیر بعد جب ملازم پستول کے دھماکوں کی آوازیں سُن کر وہاں پہنچے تو ڈاکٹر ریحان خون میں نہایا ہوا اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔۔ اور فریدہ کے ہونٹوں پر ایک غم آلود مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔

"میں بھی آرہی ہوں ریحان!" اُس نے خوفزدہ اور گھبرائے ہوئے ملازموں کی طرف متوجّہ ہوئے بغیر، ریحان کی لاش کو مخاطب کرکے کہا۔ "میری انتقام کی پیاسی رُوح اپنا مقصد حاصل کرچکی ہے... اور یوں بھی میرے لئے تمہارے بغیر اس دنیا میں رہنے کا تصوّر کسی طرح ممکن نہیں۔ تمہیں یاد ہے نا! ایک بار میں نے کہا کہ میں اس دنیا سے اُس دُنیا تک تمہارا ساتھ دوں گی۔"

چند لمحے بعد ہی کمرے میں ایک اور دھماکا سُنائی دیا اور سلوانا کی رُوح کی لاش ریحان کے مُردہ جسم کے قریب ہی فرش پر تڑپنے لگی!

❋

حامد کی نیند ٹوٹ چکی تھی مگر سر اتنا بھاری اور جسم اتنی تھکن محسوس کررہا تھا کہ اس کا دل آنکھیں کھولنے کو نہ چاہا۔ منہ کا مزہ بھی بے حد کڑوا کسیلا ہورہا تھا۔ یہ سب رات کی پارٹی کا نتیجہ ہے۔ اس نے دل میں کہا پانی کی طرح شراب پی جائے گی تو اس کا خمار اسی طرح ٹوٹے گا۔ شاید غسل کرنے سے طبیعت سنبھل جائے۔ مگر اس کے لئے بھی تو اٹھنا پڑے گا جبکہ حال یہ ہے کہ آنکھیں کھولنا بھی ایک بارِ گراں محسوس ہورہا ہے۔ اس نے لیٹے لیٹے سرہانے رکھی ہوئی میز کی طرف ہاتھ بڑھا دیا جہاں وہ عادتاً سگرٹ کیس اور لائٹر رکھدیا کرتا تھا۔ مگر ہاتھ خلا میں ٹٹولتا رہ گیا۔ وہاں کوئی میز اس کی انگلیوں سے مس نہیں ہوئی۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید وہ کچھ نیچے سرک گیا ہے یا میز کچھ

دور ہو گئی ہے۔ اس نے اوپر کی جانب کھسکتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کوشش کی اور اس بار اسے آنکھیں کھولنا ہی پڑیں۔ مگر وہاں کوئی میز موجود نہیں تھی ایک میز تھی ضرور اور اس پر حامد کا سنہری سگرٹ کیس اور گیس لائٹر بھی رکھا تھا لیکن یہ وہ میز نہیں تھی جو اس کے سرہانے رکھی رہتی تھی۔

حامد نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا میز تو میز یہ کمرہ بھی وہ نہیں تھا جس میں وہ کل رات سویا تھا۔ اس نے گھبرا کر اپنے پلنگ، بستر اور لباس پر نگاہ ڈالی۔ سب کچھ تبدیل ہو چکا تھا کمرے کا فرنیچر تک۔ حد یہ ہے کہ کمرہ بھی ہوٹل فاران کا کمرہ نظر نہیں آرہا تھا "میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں" وہ بڑبڑایا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ذہن اس سوال کا کوئی جواب دیتا اس کے کانوں میں کسی کے گنگنانے کی آواز آئی۔ بڑی سُریلی اور میٹھی آواز۔ حامد جلدی سے اٹھا اور سلیپر پہنتے ہوئے کمرے سے باہر آگیا۔

دروازہ ایک برآمدے میں کھلا تھا جس کے سامنے چھوٹا سا صحن اور دائیں بائیں کچھ اور کمرے واقع تھے۔ گنگنانے کی آواز بائیں جانب سے آرہی تھی۔ اس کے دیکھتے دیکھتے ایک حسین لڑکی ہلکی آسمانی ساڑھی باندھے کمر تک لمبے سیاہ بال کھولے۔ جو بھیگے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ ایک کمرے سے نکلی اور مقابل کے دوسرے دروازے میں چلی گئی۔ حامد پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ یہ کس کا گھر ہے۔ یہ لڑکی کون ہے اور یہاں کیسے آئی یا زیادہ صحیح الفاظ میں وہ خود یہاں کیسے پہونچا؟ بے شمار سوالات تھے جو یکبارگی حامد کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھا۔ اس دروازے کے قریب آیا جس میں اس نے لڑکی کو جاتے دیکھا تھا اور جھانک کر دیکھا۔

یہ باورچی خانہ تھا۔ چھوٹا سا مگر ضرورت کی ہر چیز سے آراستہ گیس کے چولھے پر کیتلی میں پانی اُبل رہا تھا، اس کے قریب ہی ایک ٹرے میں دو پیالیاں۔ دودھ دانی، شکر دانی اور چائے دانی نظر آرہی تھی لڑکی بڑی محویت کے ساتھ اسی طرح گنگناتے ہوئے شیلف کے ایک خانے سے کافی کا ڈبہ اٹھا رہی تھی۔ اس نے چائے دانی میں کافی کے کئی چمچے ڈال کر ڈبہ واپس شیلف پر رکھا اور چولھے سے کیتلی اٹھا کر پانی لوٹنے لگی حامد بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً لڑکی نے یا تو اسکی نگاہوں کا لمس محسوس کر لیا یا پھر اس کی آہٹ سُن لی تھی کہ وہ دروازے کی طرف گھومی۔ حامد کو کھڑے دیکھ کر ایک بڑا دلنواز تبسم اس کے خوبصورت نازک ہونٹوں پر نمودار ہوا "تو سرکار اٹھ ہی گئے" وہ بولی۔ حامد کو اسکی آواز بھی بیحد سریلی محسوس ہوئی۔

"کنیز کا خیال ہے کہ ناشتہ تیار ہے۔ اس لئے پہلے مُنھ ہاتھ دھو کر ناشتہ فرمالیں غسل بعد میں کر لیجئے گا" وہ کہہ رہی تھی اور حامد حیرت سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ وہ اس کے لئے اجنبی نہیں ہے اور نہ اس گھر میں اس کی موجودگی غیر متوقع ہے لیکن بار بار کوشش کرنے پر بھی حامد کو قطعی یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ اس خوبصورت لڑکی سے کہاں ملا تھا اور اگر اس کے گھر میں موجود ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ ممکن تھا کہ وہ اس کے بارے میں سوالات شروع کر دیتا مگر کافی کی اٹھتی ہوئی خوشبو نے اسے یہ بحث کچھ دیر ملتوی کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس وقت اسے اپنی حالت سنبھالنے کے لئے اس سکون بخش مشروب کی بیحد ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور منھ سے کوئی لفظ کہے بغیر چپ چاپ باتھ روم کی طرف چل دیا جو وہ راستے میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ منھ ہاتھ دھو کر نکلا تو لڑکی ایک اور کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوئی انتظار کر رہی تھی "تشریف لائیے سرکار"۔ وہ کسی تربیت یافتہ خادمہ کی طرح جھکتے ہوئے بولی۔

حامد کمرے میں جا کر کھانے کی میز کے گرد بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ کافی کی ٹرے کچھ دوسرے لوازمات کے ساتھ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ لڑکی بھی اس کے پیچھے اندر آئی اور کافی بنانے لگی۔

"آج سرکار بہت خاموش ہیں"۔ لڑکی نے پیالی اس کی طرف بڑھائی "کیا بات ہے"۔

"تم مجھے سرکار کیوں کہہ رہی ہو"۔ حامد نے سوچا کہ وہ کافی پینے سے قبل یہ سوال تو کر ہی سکتا ہے۔

"اس لئے کہ آپ نواب زادے ہیں۔ بہت بڑی جاگیر کے مالک دو کوٹھیاں۔ ایک بنگلہ، دو کاریں، نوکر چاکر بینک بیلنس"۔ لڑکی نے بڑے شوخ لہجہ میں جواب دیا "کیا میں غلط کہہ رہی ہوں"۔ حامد کو دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ لڑکی صرف اسے جانتی ہی نہیں ہے بلکہ خاصی اچھی طرح جانتی ہے مگر بظاہر وہ خاموشی سے کافی پیتا رہا۔ "آپنے تو پھر چپ سادھ لی۔ کچھ بولیئے، بات کیجئے"۔

"اور تم کون ہو"۔ دو پیالیاں پینے کے بعد حامد کی طبیعت بہت کچھ سنبھل گئی تھی۔

"میں"، لڑکی بڑے انداز سے مسکرائی "میں ہوں آپکی کنیز نرگس"۔

"نرگس" حامد نے دل ہی دل میں دوہرایا صورت کی طرح نام بھی خوبصورت ہے"۔ کنیز سے تمہارا کیا مطلب ہے"۔

"ہوں۔ تو آپ مجھے چھیڑنے پر تلے ہوئے ہیں"۔ نرگس اٹھلائی، "مگر میں اتنا سا بھی نہیں شرماؤں گی۔ سنیئے یہ کنیز آپ کی رفیقہ حیات۔ یعنی کہ بیوی یعنی کہ والف ہے کہیئے کچھ اور وضاحت کی ضرورت ہے"۔

"کیا" پیالی حامد کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ اس نے گھور کر نرگس کو دیکھا "محترمہ اگر یہ کوئی مذاق ہے تو اب اسے ختم ہو جانا چاہیئے مجھے نہیں معلوم کہ آپ کون ہیں اور میں جو کہ کل رات پارٹی کے بعد فاران ہوٹل میں اپنے کمرے میں سویا تھا یہاں کیسے آگیا۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ میں نے آج سے پہلے آپکو کبھی نہیں دیکھا"۔

"پارٹی؟ کیسی پارٹی؟"، نرگس نے حیرت سے پوچھا۔

"پارٹی جو کہ کمشنر صاحب نے اپنے ــــ" حامد نے کہنا شروع کیا۔ مگر نرگس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ پارٹی تو گذشتہ ہفتہ ۱۲ مئی کو ہوئی تھی"۔

"کیا"، حامد نے چونک کر اپنی کیلنڈر رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ اور بلاشبہ وہاں ہفتہ ۱۹ مئی نظر آرہی تھی۔

"جی ہاں میں اس پارٹی کو کیسے بھول سکتی ہوں"۔ نرگس نے بڑے رومانی لہجہ میں کہا "اسی پارٹی میں تو ہم پہلی مرتبہ ملے تھے۔ میں اپنے بھائی ممتاز کے ساتھ پارٹی میں شریک تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہم لوگ اس دعوت میں شرکت کے لئے احمد پور آئے تھے۔ اور ہوٹل فاران میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے مگر آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہو سکی۔ کسی نے سچ کہا ہے جوڑے آسمان سے ہی اترتے ہیں۔ احمد پور سے چلتے وقت میرے تو وہم دگمان میں بھی نہیں تھا کہ تقدیر پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کے لئے لئے جا رہی ہے۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ اسی کو کہتے ہیں۔ پارٹی میں آپ نے مجھے دیکھا اور ایسے ڈورے ڈالے کہ یہ دلِ ناسمجھ بھی آپ کا دم بھرنے لگا۔ چھ دن تک آپنے میرا اور ممتاز بھائی کا اتنا پیچھا لیا کہ ان بیچاروں کو ہاں کرتے ہی بن پڑی"۔

"خوب۔ تو گویا ہماری شادی کل ہوئی ہے"۔ حامد نے اپنے نزدیک طنز کیا تھا مگر نرگس اسے قطعاً محسوس نہیں کر سکی۔ "جی ہاں"، اس نے کچھ شرماتے ہوئے جواب دیا "ممتاز بھائی نے کہا بھی کہ شادی ہی کرنا ہے تو اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے نرگس میری اکلوتی بہن ہے مجھے کچھ تیاری کا موقع تو دیں مگر آپ کہاں سنتے تھے نواب زادے جو ٹھہرے۔ اکڑ کر بولے کہ خدا کا دیا سب کچھ میرے پاس موجود ہے۔ پھر کسی تیاری کی کیا ضرورت ہے۔ ممتاز بھائی مجبور ہو گئے، پھر بھی انہوں نے بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ پورے بیس ہزار روپیہ نقد بینک میں میرے نام سے جمع کر کے پاس بک آپکے سامنے ڈالدی"۔

"واقعی"۔ حامد کو حیرت تھی۔ اگر اس ڈرامے کو روپیہ بٹورنے کی کوئی سازش سمجھ لیا جائے تو پھر اس بیس ہزار کا کیا جواز تھا۔

"آپ کو یقین نہ ہو تو اب بھی اپنے کوٹ کی جیب دیکھ سکتے ہیں۔ پاس بک وہیں رکھی ہے"۔

"اور اب وہ آپکے ممتاز بھائی کہاں ہیں"۔

"انہیں ضروری کام سے احمد پور واپس جانا تھا مگر آپ انہیں جانے نہیں دے رہے تھے"۔ نرگس نے بلا تامل جواب دیا "آخر یہ طے ہوا کہ وہ ابھی چلے جائیں اور آٹھ دس دن بعد آپ کے مضافاتی بنگلے میں کم سے کم ایک ماہ گذارنے کے لئے آئیں جہاں آپ خود بھی تین چار دن کے بعد جانے والے ہیں"۔ حامد کو ایک مرتبہ پھر حیرت کا جھٹکا لگا۔ دارالحکومت سے پچپن میل کے فاصلے پر پیر کوٹ کے مقام پر اس کا ایک بنگلہ واقعی موجود تھا جہاں اسے ہر صورت میں بائیس تاریخ تک پہونچ جانا تھا۔ یہ بنگلہ صرف سیر و شکار کے لئے بنوایا گیا تھا اور ہر سال شکار کے موسم میں دو چار معزز سرکاری اور غیر سرکاری مہمان اس کے یہاں آکر قیام کرتے رہتے تھے۔ اس سال یہ خصوصیت تھی کہ ملک کے وزیر اعظم صاحب بجٹ اجلاس سے پہلے ایک ہفتہ آرام کرنے کے لئے اس کے بنگلے پر تشریف لا رہے تھے۔

"اچھا اس مکان میں شان نزول کیا ہے۔ وہ بھی بتا دیں"۔ حامد نے کہا "اس لئے کہ جہاں تک مجھے یاد ہے میں تو اپنے ہوٹل کے کمرے میں سونے کے لئے لیٹا تھا"۔

"جتنا جی چاہے انجان بننے کی کوشش کریں"۔ نرگس مسکرائی "یہ مکان حضور نے شادی کے لئے کرائے پر حاصل کیا ہے اور ہم کل شادی کے بعد ہی ہوٹل سے یہاں منتقل ہوئے ہیں"۔

"معاف فرمائیے محترمہ میں انجان بننے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں بلکہ سچ مچ انجان ہوں"۔ حامد نے بڑی سنجیدگی سے کہا "میرا خیال ہے کہ پارٹی میں مجھے ضرورت سے زیادہ شراب کے نشے میں مدہوش دیکھ کر میرے کسی قریبی دوست نے یہ دلچسپ مذاق کیا ہے اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ اسکیم اتنی خوبی سے تیار کی گئی ہے کہ مذاق سمجھنے کے باوجود میرا ذہن ابھی تک اس شک وشبہ میں مبتلا ہے کہ یا تو میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں یا پھر کسی حادثے کے نتیجہ میں گذشتہ ایک ہفتے کے واقعات میرے ذہن سے محو ہو گئے ہیں اس لئے میری طرف سے اس بھرپور فطری اداکاری کی مبارکباد قبول کرتے ہوئے اب اس ڈرامے کو ختم کیجئے اور مجھے اس دوست کے نام سے آگاہ کرتے ہوئے ثواب دارین حاصل کیجئے"۔

"ہوں"، نرگس نے ایک گہری سانس لی "میری سہیلیاں کہہ رہی تھیں کہ بنو نواب زادے کے گھر جا رہی ہو ذرا ہوشیار رہنا یہ لوگ طرح طرح کے مذاق کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ شادی کے دوسرے دن ہی آپ اتنا خطرناک مذاق کرنے بیٹھ جائیں گے۔ خدا کے لئے ایسی بیگانہ نظروں سے میری طرف نہ دیکھئے مجھے ہول آرہا ہے"۔

"آپ کو دیکھ کر جی تو یہی چاہتا ہے کہ اگر یہ جھوٹ ہے تو بھی سچ

مان لیا جائے لیکن محترمہ نرگس صاحبہ میں ہرگز مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ معلوم نہیں آپ کیا چکر چلا رہی ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ آپ سے شادی کرنا تو درکنار میں نے آج صبح سے پہلے زندگی میں کبھی آپ کو نہیں دیکھا اور اسی طرح مجھے یہ بات بھی تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ آج ۱۹ مئی ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کل ۱۲ تھی اور آج ۱۳ مئی ہے۔"

یہ الفاظ سن کر نرگس کا چہرہ ایکدم زرد پڑ گیا۔ اس نے غور سے حامد کی طرف دیکھا جیسے اس کے انداز میں کوئی ایسا تاثر تلاش کر رہی ہو جو اِن الفاظ کی سنگینی کم کر سکے۔

"تو آپ سمجھتے ہیں کہ میں کوئی چکر چلا رہی ہوں۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے جو کچھ آپ کو بتایا اس کی حیثیت ایک گڑھی ہوئی داستان سے زیادہ نہیں ہے۔ میں آپ کی منکوحہ بیوی نہیں کوئی آوارہ سوسائٹی گرل ہوں۔ کل شام احمد پور جانے سے پہلے بھائی امتیاز نے جب نکاح نامے کی نقلیں مجھے دیں تو انہوں نے مذاق میں کہا تھا کہ بہن انہیں سنبھال کر رکھنا نواب زادوں کی یادداشت بہت کمزور ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کبھی حامد صاحب اپنا اور تمہارا رشتہ بھول جائیں۔ یہ کاغذ اس وقت تمہارے بہت کام آئے گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان کا مذاق اتنی جلدی حقیقت بن کر سامنے آجائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ حامد اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یا خدا یہ کیا اسرار ہے، وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ کہیں سچ مچ میں اپنی یادداشت تو گم نہیں کر بیٹھا ہوں۔ نرگس جتنی تیزی سے گئی تھی ایک منٹ بعد اسی تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور بھورے رنگ کے دو بڑے بڑے کاغذ حامد کے سامنے میز پر پھینک دیئے۔ حامد نے انہیں اٹھا کر دیکھا اور بُت بن کر رہ گیا۔ بلاشبہ وہ ایک رجسٹرڈ نکاح خواں کی مُہر اور دستخطوں سے جاری ہونے والی نکاح نامے کی دو نقلیں تھیں اور اپنے ہر کالم سے نرگس کے دعوے کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں۔

"میں نے نوابوں اور جاگیرداروں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔" نرگس بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی "کہ کس طرح وہ بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو اپنے بستر کی زینت بنانے کے لئے طرح طرح کے پرفریب ہتھکنڈے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو دیکھنے اور آپ کی باتیں سننے کے بعد مجھے وہ تمام داستانیں جھوٹ معلوم ہونے لگی تھیں، مگر ثابت ہوا کہ میں غلطی پر تھی۔ آپ اپنے طبقہ کے دوسرے لوگوں سے مختلف نہیں ہیں آپ نے بھی شکار کھیلا تھا! اور ظاہر ہے کہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اب آپ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں لیکن آپ کے اندر اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں کہ اس کا اعتراف کر سکیں اور یادداشت گم ہونے کا بہانہ بنا رہے ہیں پھر بھی میں اپنے دل کو کیا کہوں جو آپ کے اس سلوک کے بعد بھی آپ سے نفرت کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔"

اور یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حامد کا دل الٹ پلٹ ہونے لگا۔ وہ کسی خوبصورت لڑکی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ شادی تو اسے کبھی نہ کبھی کرنا ہی تھی۔ پھر یہ نرگس تو اس کی توقعات سے کہیں زیادہ حسین و دلکش ہے۔ اتنی اچھی لڑکی کوئی فریب نہیں کر سکتی۔ اور بالفرض یہ کوئی فریب ہے تو بھی اتنا خوبصورت ہے کہ اسے خواہ مخواہ بھی کھانے کے لئے دل چاہنے لگتا ہے۔ "ارے یہ کیا" اس نے جلدی سے اٹھکر نرگس کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا اور تم نے سچ مچ آنسو بہانا شروع کر دیئے۔"

❀

حامد نے ہرچند نرگس کو منا لیا تھا اور وہ اتنی سادہ طبیعت تھی کہ فوراً ساری باتیں بھول کر پھر اسی طرح ہنسنے بولنے لگی تھی مگر نکاح نامے اور جیب میں رکھی ہوئی پاس بک دیکھنے کے باوجود حامد کو یقین نہیں آرہا تھا کہ پورا ایک ہفتہ اس طرح اس کی یادداشت سے محو ہو سکتا ہے۔ ناشتہ اور پھر غسل کے بعد لباس تبدیل کر کے وہ نرگس سے یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ اپنے کچھ دوستوں سے ملنے جا رہا ہے اور گھنٹے دو گھنٹے میں واپس آجائے گا اس وقت تک گھر میں ایک بوڑھی ملازمہ بھی آچکی تھی جسے نرگس کے بقول مالک مکان نے ایک ہفتہ کے لئے عارضیاً انہیں دیدیا تھا۔ تاکہ انہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔

گھر سے باہر نکل کر حامد نے دیکھا کہ مکان کے ساتھ ایک گیرج بھی ہے جس میں اس کی کار موجود ہے اور پھر کئی باتوں کی تصدیق یکے بعد دیگرے ہوتی چلی گئی۔ پہلی چیز تو کار کی میٹر ریڈنگ ہی تھی جو حامد کے خیال کے مطابق کم سے کم تین سو میل آگے تھی۔ وہ ایک رات میں تو اتنا فاصلہ طے نہیں کر سکتا تھا اس لئے ثابت ہوا کہ جب وہ پچھلی مرتبہ کار میں بیٹھا تھا تو اس وقت سے اب تک یقیناً ایک رات سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ ایک ہاکر سے اخبار خرید کر دیکھا تو رہا سہا شک بھی دور ہو گیا۔ بلاشبہ آج ۱۹ مئی تھی۔ گویا یہاں تک نرگس کا کہنا بالکل درست نکلا تھا۔ وقت ایک ہفتہ آگے بڑھ چکا تھا اور حامد کو کچھ یاد نہیں تھا کہ اس نے یہ ایک ہفتہ کہاں اور کیسے گزارا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فاران ہوٹل جا کر نرگس کی دوسری باتوں کو بھی چیک کرے اور پھر ان قاضی صاحب سے بھی ملاقات کرے جن کا نام و پتہ نکاح نامے پر دیا ہوا تھا۔

اس سلسلے میں ایک بات ایسی تھی جس کا حامد کو تقریباً یقین

ہونے لگا تھا اور وہ یہ کہ اگر اس کی یادداشت گم نہیں ہوئی ہے اور نرگس اور اس کا بھائی امتیاز مل کر کوئی گہری چال چل رہے ہیں تو کم سے کم ان کا مقصد حامد سے کوئی مالی فائدہ اٹھانا نہیں ہے۔ حامد نے اپنی چیک بک اور ٹریولرز چیکوں کا جائزہ لیا۔ اور دیکھا کہ گزشتہ ہفتے اس نے کوئی ایک چیک بھی نہیں کاٹا ہے جبکہ نرگس چاہتی تو اس کی حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کم سے کم پچاس ہزار کا بیلنس تو صاف کر ہی دیتی جو مقامی طور پر دو بینکوں میں جمع تھا۔ اسی طرح ٹریولرز چیک بھی صرف پانچ ہزار کے بقدر کم تھے اور ایک ہفتے کی مدت کو دیکھتے ہوئے یہ رقم کچھ زیادہ نہیں تھی۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ اگر شادی ہوئی تھی تو اس نے اس کے اخراجات بھی اسی رقم سے ادا کئے ہوں گے اور شاید ہوٹل کا بل بھی۔

حامد ان ہی خیالات میں گم کار چلاتا ہوا ہوٹل فاران کی طرف جا رہا تھا کہ اسے ایک ٹریفک سگنل پر روشنی مخالف پاکر کار روکنا پڑی اسکے سامنے پیدل چلنے والوں کی خاصی بھیڑ سڑک پار کر رہی تھی۔ اچانک لوگوں کے ہجوم میں وہ ایک شخص کو دیکھ کر چونک پڑا۔ یہ اختر ندیم تھا جو اب سے کئی سال پہلے کالج کے زمانے میں اس کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ کالج سے نکل کر مختلف پیشوں میں اپنی صلاحیتیں آزمانے کے بعد وہ دو تین سال تک ایک مشہور اخبار میں کرائم رپورٹر کی حیثیت سے کام بھی کر چکا تھا اور ہرچند حامد کو اس سے ملے ایک برس سے زیادہ ہو گیا تھا مگر اخبارات دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے رازداں ایجنسی کے نام سے سراغ رسانی کا کوئی ادارہ کھول لیا ہے اور اس لائن میں خاصا کامیاب جا رہا ہے۔

ایک ثانیہ سے بھی کم میں یہ خیالات حامد کے ذہن سے گزر گئے اور جیسے ہی اختر اس کی کار کے سامنے پہونچا حامد نے کھڑکی سے سر نکال کر اسے آواز دیدی۔ اختر نے گھوم کر دیکھا اور حامد کو پہچان کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ "یہ تو اپنے نواب زادہ حامد علی خاں معلوم ہوتے ہیں" وہ قریب آتے ہوئے بولا۔

"صرف معلوم ہی ہوتا ہوں"۔ حامد نے مسکرا کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کار کا دروازہ کھول دیا۔

"تقریباً ایک سال بعد ملاقات ہوئی ہے"۔ اختر نے بڑی بے تکلفی سے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "ظاہر ہے کہ جب تک پرکھ نہ لوں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہی حامد ہو یا زمانے کے انقلاب کے ساتھ تم بھی بدل گئے ہو۔" اتنی دیر میں سگنل کی روشنی سبز ہو چکی تھی پچھلی کار نے ہارن دیکر حامد کو اس کا احساس دلایا اور حامد نے جلدی سے گیئر تبدیل کرتے ہوئے کار آگے بڑھا دی "بہرحال اس وقت بڑے موقع سے ملے ہو۔" اس نے جواب دیا "میں جس الجھن میں پھنسا ہوا ہوں شاید تمہارا جاسوس ذہن اس کا کوئی حل تلاش کر سکے۔"

"کیسی الجھن"، اختر نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہ کہ آج صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک عدد نہایت حسین و جمیل بیوی کا شوہر پایا۔ جبکہ بخدا مجھے کچھ یاد نہیں کہ وہ کون ہے اور آیا میری اس سے شادی ہوئی بھی ہے یا نہیں"

"بہت دلچسپ"، اختر مسکرایا۔ "معلوم ہوتا ہے آجکل الف لیلیٰ کا کوئی جدید ایڈیشن زیر مطالعہ ہے۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں"۔ حامد نے کہا اور پھر مختصر طور پر تمام واقعات اختر کو کہہ سنائے۔

"میں اس وقت ہوٹل فاران جا رہا تھا۔" آخر میں اس نے کہا "تاکہ وہاں نرگس کے بیان کی تصدیق کر سکوں"

"لڑکی خوبصورت ہے۔" اختر نے پوچھا۔

"بہت زیادہ۔"

"پڑھی لکھی بھی ہے"

"باتوں سے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے"۔

"سلیقہ شعار بھی ہے"۔

"ہاں کم سے کم ناشتہ تو اس نے بہت مزیدار بنایا تھا۔"

"میرے بھائی تو تمہیں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا چاہیئے کہ جو خصوصیات لوگوں کو چار چار بیویوں میں میسر نہیں آتیں خدا نے تمہیں ایک ہی بیوی میں مجسم کر کے دیدی ہیں۔ ایک ہفتہ کیا بڑی بات ہے، میں ایسی بیوی پانے کے لئے اپنی زندگی کے پورے تیس سال بھولنے کے لئے تیار ہوں"۔

"تم ابھی تک سنجیدہ نہیں ہو، اور میں اس خیال سے پریشان ہوا جا رہا ہوں کہ اگر شادی والا معاملہ سچ ہے تو یہ بڑی خطرناک صورت حال ہے" حامد نے کہا "اگر غائب دماغی کے ایسے ہی کسی اور دورے میں میں کوئی جرم کر بیٹھا تو کیا ہوگا۔"

"پہلے بھی کبھی ایسا ہوا کہ تم کوئی کام کر کے اسے بھول گئے ہو" اس مرتبہ اختر نے کچھ سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

"قطعی نہیں"۔

"اس بات کا کوئی امکان ہے کہ نرگس کی نظریں تمہاری جاگیر اور دولت پر لگی ہوں"۔

"میرے دل میں بھی پہلا خیال تو یہی پیدا ہوا تھا مگر جس لڑکی کا بھائی اسے جہیز میں بیس ہزار نقد دے سکتا ہو، اسے دولت کا لالچ

نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ کہ نکاح نامے میں مہر کی رقم صرف پانچ ہزار لکھی ہوئی ہے اگر اسے مجھ سے کوئی فائدہ اٹھانا تھا تو مہر کم سے کم سوا لاکھ کا تو ہونا چاہیئے تھا، اس کے علاوہ اسے میری بیوی بننے کے لئے اتنے لمبے چوڑے پلان کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ مجھے کہیں بھی ملتی میں اس سے شادی کر لیتا۔"

"کافی سمجھداری کی باتیں کرنے لگے ہو"۔ اختر نے کہا۔ "بہرحال فاران ہوٹل چل ہی رہے ہیں دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا معلوم ہوتا ہے"۔

✿

حامد اختر کے ساتھ استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھا تو کلرک اسے پہچانتے ہی مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"شادی مبارک ہو نواب زادہ صاحب"۔ اس نے کہا، "آپ نے تو ہوٹل سے جاتے ہوئے ہم خادموں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا"۔

حامد نے معنی خیز نظروں سے اختر کی طرف دیکھا۔ اور پھر کلرک سے مخاطب ہوا۔ "کیسی شادی بھئی"۔

"اس تجاہلِ عارفانہ سے کام نہیں چلے گا حضور"۔ کلرک مسکرایا۔ "سارا ہوٹل جس بات کا گواہ ہے آپ اسے کس کس سے چھپائیں گے"۔

"کیا مطلب"

"سرکار محترمہ نرگس صاحبہ بھی ہمارے ہی ہوٹل میں قیام پذیر تھیں۔ اور پچھلے ہفتے آپ دونوں جس طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے ہر شخص کا یہ ہی اندازہ تھا کہ اب عنقریب کوئی خوش خبری سننے کو ملے گی۔ مگر حضور منیجر صاحب کو سخت شکایت ہے کہ آپ نے شادی کی تقریب کے لئے ہمارے ہوٹل کو نظر انداز کر دیا"۔

"ہوں"۔ حامد نے ایک گہری سانس لی۔ اب بھلا نرگس کے بیان میں کیا شبہ باقی رہ جاتا تھا۔ "کچھ ایسے ہی حالات تھے کہ ہمیں یہ فرض بڑی سادگی کے ساتھ انجام دینا پڑا۔ مگر عنقریب اس سلسلے میں ایک شاندار دعوت دے رہے ہیں جس کے لئے ظاہر ہے کہ ہوٹل فاران سے اچھا انتظام کہیں اور نہیں ہو سکتا"۔

"شکریہ حضور"، کلرک نے جواب دیا۔

"آؤ چلیں"، حامد نے اختر کی طرف دیکھا۔

"ایک منٹ"، اختر نے کہا اور کلرک سے بولا۔ "میں ان حضرت کا قانونی سرپرست ہوں اور یہ فرض مجھے ان کے والدین کی جانب سے سونپا گیا ہے کہ بچے کو بھٹکنے نہ دوں۔ اسی شادی کے سلسلے میں پتہ نہیں کیا کیا امیدیں، امنگیں اور پروگرام تھے مگر انہوں نے اچانک شادی کر کے ان سب پر پانی پھیر دیا۔ بہرحال جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب ان کے بزرگ یہ اطمینان کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جو خاندانی طور طریقوں کے خلاف ہو۔ چنانچہ مجھے اس واقعہ کی تحقیقات کے لئے بھیجا گیا ہے اور میں اس بارے میں تم سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں"۔ کلرک نے حیرت سے پلکیں جھپکا کر پہلے حامد اور پھر اختر کی طرف دیکھا۔ دوسری طرف اختر نے یہ قدم اتنا اچانک اٹھایا تھا کہ حامد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا ردعمل ظاہر کرے۔ "پوچھئے"، آخر کلرک ہی نے کہا۔

"نرگس صاحبہ ہوٹل میں اکیلی ٹھہری ہوئی تھیں"۔ اختر کا پہلا سوال تھا۔

"جی نہیں۔ اپنے بھائی ممتاز صاحب کے ساتھ"۔

"نواب زادہ صاحب تو کمشنر صاحب کے مہمان تھے۔ کیا نرگس اور ممتاز کا شمار بھی مہمانوں میں تھا"۔

"جی نہیں۔ وہ اپنے واجبات خود ادا کر رہے تھے"۔

"وہ ہوٹل میں کب آئے تھے"۔

"غالباً ۸ مئی کو۔ نواب زادہ صاحب کے آنے سے دو دن پہلے"۔

"ابھی تم نے بتایا تھا کہ گذشتہ ہفتہ نواب زادہ اور نرگس صاحبہ اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں"۔ اختر نے کہا۔ "کیا ایسے مواقع پر ممتاز صاحب بھی ان کے ہمراہ ہوا کرتے تھے"۔

"جی نہیں"۔ کلرک نے ذہن پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

"ممتاز صاحب کا حلیہ کیا ہے"۔

"وہ قد و قامت میں تقریباً نواب زادہ صاحب کے برابر ہیں۔ ہم عمر بھی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مونچھیں بھی رکھتے ہیں اور بڑی بڑی قلمیں بھی۔ اس کے علاوہ شاید ان کی آنکھوں میں کوئی خرابی تھی کہ ہر وقت سیاہ شیشوں کا چشمہ بھی لگائے رہتے تھے"۔

"ذرا یاد کر کے بتاؤ کہ تم نے کسی بھی موقع پر ممتاز صاحب کو نرگس صاحبہ اور نواب زادہ صاحب کے ساتھ دیکھا تھا"۔

"جناب جب سے آپ نے پہلا سوال کیا تھا میں مسلسل غور کر رہا ہوں"، کلرک نے کچھ حیرت سے کہا۔ "مگر واقعی یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے انہیں کبھی بھی نواب زادہ صاحب کے ساتھ نہیں دیکھا"۔

"شکریہ"۔ اختر نے کلرک سے کہا اور حامد کے بازو میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ "چلیئے نواب زادہ صاحب"۔ وہ دونوں ہوٹل سے باہر نکل آئے۔

"یہ کیا حرکت تھی"۔ حامد نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ کلرک دل میں کیا کہتا ہو گا کہ نواب زادہ صاحب ابھی تک نابالغ ہیں جو ان کے لئے ایک نگراں مقرر کیا گیا ہے"۔

"واقعی بڑی بھول ہو گئی آؤ واپس جا کر اسے سمجھا دیں کہ تمہارے سن بلوغت تک پہونچنے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ سوالات صرف اس لئے کئے جا رہے تھے کہ تمہیں اپنی شادی کے بارے میں شک ہے کہ سچ مچ ہو گئی ہے یا فریقِ ثانی تمہیں بیوقوف بنا رہا ہے"۔ اختر نے دروازے میں رکتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا بس بیٹھ جاؤ"۔ حامد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ "اکڑ تو اس طرح رہے ہو جیسے ان بے تکے سوالات سے کوئی معرکے کا انکشاف کر کے آ رہے ہو"۔

"در ایں چہ شک"۔ اختر نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "کم سے کم یہ ضرور واضح ہو چکا ہے کہ تمہاری یادداشت غائب نہیں ہوئی اور تمہیں کسی بہت گہرے مقصد کے لئے آلۂ کار بنایا جا رہا ہے"۔

"کیا"، حامد نے چونک کر اختر کی طرف دیکھا۔ کار ایک مرتبہ پھر بین روڈ پر دوڑ رہی تھی۔ "یہ تم نے کیسے سمجھ لیا"۔

"صاحبزادے کوئی لڑکی اتنی بے تکلف نہیں ہوتی کہ صرف ایک ملاقات کے بعد تمہارے ساتھ تنہا گھومنے پھرنے نکل کھڑی ہو اور کوئی بھائی اتنا غیر محتاط نہیں ہوتا کہ اپنی بہن کو ایک اجنبی سے رسم و راہ بڑھانے کی اجازت بھی دیدے اور خود اتنا غیر متعلق ہو جائے کہ ایک بار بھی ان کے ساتھ جانے کی ضرورت محسوس نہ کرے۔ یہ بات تقریباً طے سمجھو کہ وہ دونوں محض تمہیں پھانسنے کے لئے ہوٹل میں ٹھہرے تھے"۔

"اتنی بات تو میں بھی محسوس کر رہا تھا"، حامد نے دل میں قائل ہونے کے باوجود شرارت سے کہا۔ "پھر جناب نے کون سا تیر مار لیا"۔

"ابھی بتاتا ہوں پہلے تم سوچ کر جواب دو کہ پارٹی کے ختم ہونے کے بعد تم خود اپنے کمرے تک گئے تھے یا کوئی تمہیں پہونچانے گیا تھا"۔ اختر نے پوچھا۔

"مجھے ٹھیک سے یاد نہیں"، حامد نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اس رات میں ضرورت سے زیادہ شراب پیتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی مجھے کمرے تک پہونچانے گیا ہو"۔

"کیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جہاں تمہیں لے جایا گیا ہو وہ تمہارا اپنا کمرہ نہ ہو"۔

"نہیں۔ اس بارے میں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے سونے سے قبل حسبِ عادت ایک سگرٹ پیا تھا اور سگرٹ کیس اور سگرٹ لائٹر سرہانے میز پر رکھ دیا تھا۔ اگر وہ میرا کمرہ نہ ہوتا تو میز کو وہاں موجود نہیں ہونا چاہیئے تھا کیونکہ یہ خصوصی میز میرے کہنے پر ہوٹل والوں نے فراہم کی تھی"۔

"واہ اپنا کمرہ ہونے کی کیا پہچان مقرر کی ہے تم نے"۔ اختر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ شراب کے نشے میں تمہیں کہیں بھی لیجایا جائے اور سرہانے ایک چھوٹی سی میز رکھ دی جائے تو تم اس جگہ کو اپنا کمرہ تصور کرتے ہوئے بڑے آرام سے سو جاؤ گے"۔ حامد نے کچھ چونک کر اختر کی طرف دیکھا، ایک ہاتھ سے سر کھجایا اور پھر خفت آمیز لہجے میں بولا۔ "یار کہتے تو سچ ہو۔ میں نے اس نکتے پر غور نہیں کیا تھا"۔

"اور اب اس تیر کا حال سنو جو میں نے مارا ہے"۔ اختر نے جواب دیا "میرا اندازہ ہے کہ پارٹی کے بعد تم اپنے کمرے میں ہرگز واپس نہیں گئے بلکہ ممتاز تمہیں کہیں اور ہی لے گیا۔ جہاں اس نے تمہیں مسلسل چھ دن تک کسی انجکشن کی مدد سے مستقل نیند کی حالت میں رکھا اور مصنوعی ذرائع سے تمہارے جسم میں غذا پہونچاتا رہا۔ پھر اس نے اس کام کے لئے کسی ہپناٹزم کے ماہر کی خدمات حاصل کیں جس نے تمہیں ایک ہفتہ نیم ہوش نیم بیہوشی کی حالت میں قید رکھا اور بعد میں ہپناٹزم کے ذریعہ ان دنوں کی یادداشت تمہارے ذہن سے محو کر دی۔ اور دوسری طرف وہ خود تمہارے میک اپ میں ہوٹل آ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے ایک اور میک اپ میں ہو۔ بڑی بڑی موٹی مونچھیں، بڑی بڑی قلمیں اور سیاہ شیشوں کی عینک تینوں اتنی نمایاں چیزیں ہیں کہ ایک عام آدمی کی نظر ان کے پیچھے چہرے کے اصلی خد و خال تک نہیں پہونچ سکتیں۔ وہ کبھی اپنے کبھی تمہارے حلیئے میں لوگوں کے سامنے آتا رہا۔ تمہارے بھیس میں اپنی بہن سے (جو خدا جانے اس کی بہن ہے بھی یا نہیں) رومان لڑاتا رہا۔ دن بھر باہر گھومنے پھرنے کا سلسلہ بھی اسی لئے شروع کیا گیا تھا کہ وہ تمہارے میک اپ میں زیادہ لوگوں کی نظروں میں آنے اور کسی غلطی کے پکڑے جانے کے امکان سے بچا رہے۔ دوسری طرف اس طریقے سے رومان اور پھر شادی کی فضا بھی سازگار ہو رہی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ہوٹل کے کلرک نے کسی بھی موقع پر تم تینوں کو ایک ساتھ نہیں دیکھا"۔

"باتیں تو تم سب پتہ کی کہہ رہے ہو"۔ حامد نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جوڑ توڑ سے اسے حاصل کیا ہوا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ میں نرگس کو اپنی بیوی سمجھنے لگوں۔ تو یہ مقصد تو وہ سیدھے سادے طریقے سے بھی حاصل کر سکتا تھا"۔

"اس کا جواب تو آگے چل کر ہی ملے گا لیکن سر دست میرا ذہن دو وجوہات سوچ سکا ہے"۔

"وہ کیا"؟

"پہلی بات تو یہ ہے کہ ممکن ہے ممتاز کو اس بات کا یقین نہ ہو کہ تم واقعی نرگس سے محبت اور پھر شادی کر لو گے"۔ اختر نے جواب دیا۔ "پھر اس کے پاس اتنا وقت نہ ہو کہ وہ قدرتی طور پر محبت ہونے پروان

چڑھنے اور پھر سہرے کے پھول کھلنے تک انتظار کر سکے۔"

"لیکن ایسا کیا فائدہ ہو سکتا ہے جو وہ مختصر وقت کے اندر اٹھانا چاہتا ہو۔"

"اسی سوال کا جواب معلوم کرنا ہے"۔ اختر نے کہا۔

"پھر اب کیا ارادہ ہے"۔

"فی الحال تو ذرا قاضی صاحب سے بھی دو دو باتیں کر لی جائیں تو اچھا ہے"۔ اختر نے جواب دیا اور سگرٹ سلگانے لگا۔

✿

مگر قاضی صاحب سے مِل کر بھی کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ یہاں بھی ممتاز نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے ایک ایسے مردِ بزرگ کا انتخاب کیا تھا جنہیں اب سے بیس سال پہلے ہی آنجہانی ہو جانا چاہیئے تھا۔ مگر نہ معلوم کس مصلحت سے اللہ میاں مسلسل ان کی رسّی دراز کئے چلے جا رہے تھے۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ دو قدم چلتے تھے تو دو گھنٹے تک سانس قابو میں نہیں رہتا تھا۔ ہاتھوں میں رعشہ، نظر کمزور، سماعت ایسی کہ بغیر آلۂ سماعت کی مدد کے بم کا دھماکا بھی نہ سن سکیں اور یہ تھے وہ قاضی صاحب جنہیں کار میں بٹھا کر خدا معلوم کہاں لے جایا گیا تھا جہاں انہوں نے مسماۃ نرگس خاتون بنت سردار احمد خاں کا نکاح حامد علی ولد زاہد علی کے ساتھ بالعوض پانچ ہزار سکہ رائج الوقت پڑھایا تھا۔ البتہ ایک کام کی بات انہوں نے یہ ضرور بتائی کہ دلہن کا بھائی انہیں لینے آیا ضرور تھا نکاح کے فارم بھی اسی نے پُر کئے تھے۔ دلہن کا وکیل بھی وہ ہی بنا تھا مگر جب وہ دو گواہوں کے ساتھ دلہن کی اجازت لے کر آیا تب انہیں دولہا کے پاس لیجایا گیا اور اس کے بعد دعائے فاتحہ تک انہیں دلہن کے بھائی کی صورت نظر نہیں آئی۔ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں وہ اس وقت ان سے ہاتھ مِلانے آیا جب وہ کار میں بیٹھ کر رخصت ہو رہے تھے۔ براتیوں کے متعلق انہوں نے زیادہ غور نہیں کیا مگر وہ دو چار سے زیادہ نظر نہیں آ رہے تھے اسکے علاوہ قاضی صاحب نے بڑی ہچکچاہٹ کے بعد قبول کیا کہ انہیں معاوضہ کے بطور مبلغ سَو روپے پیش کئے گئے تھے۔

"یہاں تک آنا تو بیکار ہی رہا"، حامد نے قاضی صاحب کے مکان سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"نہیں ایسا بیکار بھی نہیں گیا"، اختر نے جواب دیا، "کم سے کم اتنی ہی تصدیق ہو گئی کہ نکاح کے وقت بھی تمہیں سامنے نہیں لایا گیا بلکہ یہاں بھی تمہارا رول ممتاز نے ہی ادا کیا جو اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ تم اس وقت سامنے لائے جانے کی پوزیشن میں نہیں تھے"۔

"پھر اب کیا کریں"۔

"ابھی دو حضرات اور ہیں جن سے شرف ملاقات حاصل کیا جا سکتا ہے"۔

"وہ کون"۔

"نکاح کے گواہ"۔ اختر نے کہا۔ "ان کے نام و پتے تو نکاح نامے میں دیئے ہوئے ہیں"۔

"اگر وہ غلط نکلے تب"۔

"مجھے اس کی توقع نہیں، ممتاز یقیناً سمجھتا ہو گا کہ ہوش میں آنے کے بعد تمہیں نرگس کو اپنی بیوی کی حیثیت میں پا کر حیرت ہو گی اور عین ممکن ہے کہ تم اس واقعہ کی تصدیق کرنے نکل کھڑے ہو، چنانچہ اس نے پختہ کام کیا ہو گا میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ گواہ حضرات نہ صرف ان پتوں پر موجود ہوں گے بلکہ انہیں یہ ہدایت بھی کر دی گئی ہو گی کہ وہ تمہاری آمد کے منتظر رہیں اور دو چار دن گھر سے باہر نہ نکلیں"۔ اختر کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ نکاح نامے میں گواہوں کے نام ارشاد اور جمیل دیئے ہوئے تھے اور پتہ دونوں کا ایک تھا۔ جس وقت اختر نے کار سے اتر کر دروازے پر دستک دی ہے تو فوراً ہی ایک اوباش قسم کا نوجوان باہر نکلا اور بتایا کہ اس کا نام جمیل ہے نیز ارشاد صاحب بھی مکان میں تشریف رکھتے ہیں۔ البتہ ایک بات ایسی تھی کہ جس کی توقع نہ اختر کو تھی اور نہ غالباً ممتاز یا شادی کے معزز گواہان کو رہی ہو گی۔ اور وہ یہ کہ جب جمیل نے اختر اور حامد کو کمرے میں لے جا کر بٹھایا اور دوسرے گواہ ارشاد نے قدم رنجہ فرمایا تو وہ اختر کی صورت دیکھتے ہی الٹے پاؤں واپس ہونے لگا تھا کہ اختر نے لپک کر اس کی گردن پکڑ لی۔ "خوب تو یہ تم ہو"۔ اس نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ جیبیں کاٹنے کے علاوہ تم فرضی شادیاں بھی کرتے ہو"۔ اور پھر حامد کی طرف دیکھ کر بولا۔ "بھائی صاحب آپ کی شادی کے یہ دوسرے گواہ شہر کے چھٹے ہوئے بدمعاش اور کئی مرتبہ کے سزا یافتہ مجرم ہیں۔ ان کا اصلی نام بھی ارشاد نہیں بندو خاں ہے"۔

"مر گیا اختر صاحب" بندو خاں نے دہائی دی۔ "میری گردن تو چھوڑیئے"

"گردن صرف ایک شرط پر چھوڑی جا سکتی ہے"۔ اختر نے کچھ اور دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "کہ تم سارا کچا چٹھا بغیر جھوٹ بولے بیان کر جاؤ گے" جمیل جو اختر سے واقف نہیں تھا حیرت کے پہلے جھٹکے سے سنبھل کر مٹھی کستے ہوئے آگے بڑھا۔

"ابے او گھونچو"۔ بندو جلدی سے بولا۔ "وہیں کھڑا رہ۔ تو اختر صاحب کو نہیں جانتا۔ ایک ہاتھ بھی پڑ گیا تو ہفتہ بھر تک گردن سیدھی کرکے نہیں چل سکے گا"۔ اور پھر اختر سے مخاطب ہوا۔ "آپ گردن چھوڑیں مجھے جو کچھ معلوم ہے ضرور بتا دوں گا"۔ اختر نے گردن چھوڑ دی۔ جمیل بڑی حیرت سے پلکیں جھپکاتا ہوا کبھی اسے اور کبھی بندو کو دیکھ رہا تھا اور کم و بیش یہی حال حامد کا تھا۔ بندو نے گردن سہلاتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور جیب سے سگرٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ نے سردارا کا نام سنا ہے"۔ اس نے اختر سے پوچھا۔

"سردارا"۔ اختر نے چونکتے ہوئے دُہرایا۔ "اس کا اس معاملے سے کیا تعلق"، اور پھر حامد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے تمہیں معلوم ہو کہ سردارا بعض اونچے سرکاری افسروں کا پلا ہوا غنڈہ ہے، اور اس سے حکومت کے سیاسی حریفوں کی مزاج پرسی کا کام لیا جاتا ہے"۔

"میں جانتا ہوں"، حامد نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک ہفتہ ہوا مجھے سردارا نے اپنے اڈے پر بلایا تھا" بندو نے بتایا۔ "وہاں اس نے میری ملاقات ایک نوجوان سے کرائی جس کا نام ممتاز تھا اور کہا کہ مجھے ایک فرضی شادی کے لئے قاضی صاحب۔ گواہوں اور دو چار براتیوں کا انتظام کرنا ہے۔ اس کام کے لئے مجھے پانچ ہزار روپے ملیں گے اور یہ میری مرضی ہے کہ اس رقم میں سے اپنا حصہ نکال کر گواہوں اور براتیوں کو کیا دینا پسند کرتا ہوں۔ سردارا سے سب ہی ڈرتے ہیں۔ اور یہ تو کوئی ایسا کام بھی نہیں تھا۔ میں راضی ہو گیا۔ چنانچہ پچھلے جمعہ کو سردارا کے ہاؤسنگ سوسائٹی والے بنگلے پر یہ شادی ہو گئی۔ مگر مجھے وہ شخص ممتاز کوئی بہت ہی گہرا کھیل کھیلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نکاح سے پہلے وہ خود ہی لڑکی کے بھائی کی حیثیت سے اسکا وکیل بنا اور پھر خود ہی سہرا باندھ کر قاضی صاحب کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا بھی کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قاضی صاحب کی نظر اتنی موٹی ہے کہ کوئی بھی دولہا بن جائے وہ اسے بعد میں شناخت نہیں کر سکتے۔ مگر وہ نہیں مانا۔ میرا خیال ہے کہ اس لڑکی سے اس کا کوئی ایسا نازک رشتہ ضرور

ہے کہ وہ فرضی طور پر بھی کسی مرد کو اس سے متعلق نہیں دیکھ سکتا۔ بہر حال نکاح کے بعد ہم سے کہا گیا تھا کہ ہم دو چار دن اس مکان میں ٹھہر کر انتظار کریں اور کوئی بھی اس شادی کے سلسلے میں پوچھ گچھ کرنے آئے تو اسے پوری طرح مطمئن کریں کہ یہ شادی واقعی ہو چکی ہے۔"

"بس یا کچھ اور۔"

"قسم لے لو اختر صاحب جو اسکے علاوہ کچھ معلوم ہو۔"

"ممتاز اب کہاں ہے۔"

"یہ بھی مجھے نہیں معلوم۔"

"اچھی بات ہے۔ میں اب جا رہا ہوں۔ لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ تم نے دانستہ کوئی بات چھپائی تھی تو ....."

"آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" بندو نے جلدی سے بات کاٹی۔ "میں قسم کھا کر جھوٹ نہیں بولا کرتا۔"

"کسی کو یہ بھی نہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ حامد صاحب کے ساتھ میں بھی یہاں آیا تھا اور یہ کہ تم نے حامد صاحب کو اس کے علاوہ کچھ بتایا ہے جو تمہیں بتانے کے لئے کہا گیا تھا۔ خاص طور سے سردار اکو۔"

"میں سمجھتا ہوں اختر صاحب۔" بندو بولا۔ "یوں بھی آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ میں چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پسنا پسند نہیں کروں گا۔"

اختر حامد کا ہاتھ پکڑ کر مکان سے باہر نکل آیا۔

"تم سیاسی طور پر کس پارٹی سے وابستہ ہو۔" اس نے حامد سے سوال کیا۔

"کسی سے بھی نہیں۔" حامد نے جواب دیا۔ "یوں میرے تعلقات حکومت کے تمام ذمہ دار لوگوں سے ہیں۔ کئی وزیر یہاں تک کہ خود وزیر اعظم حیدر علی بھی جب شکار کھیلنے کے موڈ میں ہوتے ہیں تو میرے پیر کوٹ والے بنگلے میں آ کر قیام کرتے ہیں۔ اس مرتبہ بھی وہ ۲۲ر تاریخ کو تشریف لا رہے ہیں۔ مگر تم نے یہ سوال کیوں پوچھا۔"

"آج کل ملکی سیاست بڑے اہم موڑ پر آ گئی ہے۔" اختر نے جواب دیا۔ "ایک طرف حکمراں جماعت کی بعض پالیسیوں کی وجہ سے خود اس کے کئی سرکردہ ارکان در پردہ مخالفت پر آمادہ ہیں دوسری طرف حزب اختلاف کو عثمان صاحب جیسا مقبول رہنما مل گیا ہے۔ افواہ ہے کہ جون میں جب قومی بجٹ پیش کیا جائیگا تو حکومت کے باغی ارکان حزب اختلاف سے جا ملیں گے اور حکمراں جماعت اقلیت میں رہ جائے گی۔ ایسی صورت میں قطعی ممکن ہے کہ صدر عثمان صاحب کو وزارت بنانے کی دعوت دیں۔"

"لیکن ان معاملات سے اس واقعہ کا کیا تعلق۔"

"کچھ نہیں۔" اختر نے جیسے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ "مجھے یونہی ایک خیال آ گیا تھا۔"

"اچھا اب کہاں کا پروگرام ہے۔"

"کہیں کا نہیں۔ تم ایک الجھن میں مبتلا تھے کہ تمہیں یادداشت گم ہونے کے دورے تو نہیں پڑنے لگے ہیں سو میں نے تمہاری الجھن دور کر دی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے تمہیں باقاعدہ کسی سازش کا آلہ کار بنایا گیا ہے چنانچہ میرا کام ختم ہوا۔ جہاں سے ساتھ لیا تھا وہیں کار سے اتار دو سکتا تاکہ میں اپنا دھندا دیکھوں۔ آخر مجھے بھی اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالنا ہوتا ہے۔"

"بال بچے۔" حامد نے حیرت سے کہا "تو کیا تم نے شادی کر لی۔"

"کسی نہ کسی دن تو کرنا ہی پڑیگی۔ آخر اس دنیا میں شادی سے کس کو مفر ہے۔"

"تو پھر یہ بال بچے کہاں سے آ گئے۔"

"جہاں سے اور سب کے آتے ہیں۔" اختر نے جواب دیا پھر مسکرا کر بولا "میں نے یہ کب کہا ہے کہ وہ بال بچے میرے ہیں۔"

"تم چاہے کتنی لفاظی کر لو لیکن جب تک یہ معمہ حل نہیں ہو جاتا میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔" حامد نے کہا "آخر تم پرائیویٹ سراغ رساں ہو۔ یوں سمجھو کہ میں نے تمہاری خدمات حاصل کر لی ہیں۔"

"میرے سمجھنے سے کچھ نہیں ہوتا بھیا۔ وہاں دفتر میں ایک سیکریٹری بیٹھی ہے سیما۔ اسے سمجھا سکو تو اچھا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ عام عورتوں کی طرح وہ بھی صرف ایک ہی زبان سمجھتی ہے۔ کرنسی نوٹ یا بیئرر چیک۔"

"دوست ہو کر معاوضے کی بات کر رہے ہو۔" حامد ہنسنے لگا "تم نے سنا نہیں کہ دوستوں کا حساب دلوں میں ہوا کرتا ہے۔"

"کسی زمانے میں ہوا کرتا تھا جب آڈٹ کا طریقہ رائج نہیں تھا۔"

"خدا کے لئے سنجیدہ باتوں میں مذاق کی گنجائش مت نکالا کرو۔" حامد نے کہا۔ "تمہاری جتنی فیس بنتی ہے میں اس سے زیادہ ادا کرنے کے لئے تیار ہوں مگر جس طرح بھی ہو یہ بات صاف ہونا چاہیئے کہ اس فرضی شادی سے نرگس اور ممتاز کا مقصد کیا ہے۔"

"یہ بات ہے تو پھر کسی بھی پبلک فون بوتھ پر کار روک دو تاکہ میں دفتر میں سیما کو اپنی چند روز کی غیر حاضری سے مطلع کر دوں۔"

"اور اس کے بعد۔"

"اس کے بعد تم نرگس سے میرا تعارف کراؤ گے اور ہم سب ایک ساتھ تمہارے پیر کوٹ والے بنگلے پر چلیں گے۔" اختر نے جواب دیا۔ "تم نے بتایا تھا کہ نرگس کے کہنے کے مطابق وہاں ممتاز بھی آئیگا۔"

"ہاں، اس نے کہا تو تھا لیکن کیا تمہیں امید ہے کہ وہ وہاں آنے کی ہمت کر سکے گا۔"

"کیوں نہیں۔ بظاہر تو اس کا پلان۔ جو کچھ بھی ہو۔ بہت کامیاب جا رہا ہے۔" اختر نے جواب دیا "اور یہ بات اسے دیکھنے اور اس کی نگرانی کرنے سے ہی واضح ہو سکے گی کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔" اسی وقت حامد نے ایک پبلک فون بوتھ کے سامنے کار روک لی۔

وزیر اعظم حیدر علی صاحب بڑے زبردست حفاظتی اقدامات کے ساتھ ۲۲ مئی کی سہ پہر کو پیر کوٹ تشریف لے آئے۔ ان کے ذاتی عملے میں دو چار خدمتگاروں کے علاوہ صرف مس زیبا دانش ان کی پی اے اسٹینو گرافر شامل تھیں مگر حفاظتی گارڈز کی تعداد پچاس سے کم نہیں تھی۔ ان میں سے تیس کے قریب بنگلے پہونچنے والی دونوں سڑکوں پر اس طرح متعین کر دیئے گئے تھے کہ کوئی ایک فرد بھی ان کی نظروں سے بچ کر بنگلے نہیں پہونچ سکتا تھا۔ پندرہ گارڈ بنگلے کے چاروں طرف پھیلا دیئے گئے تھے اور پانچ گارڈ بنگلے کے مین گیٹ پر ایستادہ چھوڑ دیئے گئے۔ حامد نے نرگس، اختر اور اپنے میزکسار کے ساتھ وزیر اعظم کا استقبال کیا۔ مگر وہ ان غیر معمولی حفاظتی اقدامات پر حیرت زدہ تھا۔ اس سے قبل حیدر علی تین چار مرتبہ اس کے مہمان رہ چکے تھے مگر ان کے ساتھ اتنے گارڈز کبھی نہیں ہوتے تھے۔ ایک اور خاص بات جو حامد نے نوٹ کی یہ تھی کہ اس بار ان کے ہمراہ کوئی پریس رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی نہیں تھا۔

نرگس نے اس موقع کے لئے نہ صرف لباس بلکہ میک اپ میں بھی بڑا اہتمام کیا تھا اور بہت زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی خاص طور سے اس کا دھوپ کا چشمہ جسے وہ بار بار بڑے اسٹائل سے سنبھالتی جا رہی تھی اور چشمہ کسی الھڑ دوشیزہ کے سر پر پڑے ہوئے ریشمی دوپٹہ کی طرح ہر مرتبہ پھسل کر نیچے آ جاتا تھا۔ معلوم نہیں اس کی یہ حرکت بالارادہ تھی یا چشمہ ہی کچھ ڈھیلا واقع ہوا تھا۔ بہر حال وزیر اعظم صاحب اس کے حسن و جوانی اور پھر اپنی طرف متوجہ کرنے والی اس ادا سے کافی متاثر نظر آ رہے تھے۔ چائے کا انتظام بنگلے کے سامنے لان پر کیا گیا تھا چنانچہ حامد انہیں گیٹ سے سیدھا وہیں لے گیا۔

"جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ اس طرح چھپ چھپاتے شادی کر لینے پر تمہاری گوشمالی کرتا۔" حیدر صاحب نے آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "مگر تمہاری بیگم کو دیکھ کر تمہاری عجلت اور احتیاط دونوں درست معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں کسی مناسب وقت کے انتظار میں آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہ ہی کرتا لیکن بہر حال یہ بڑی زیادتی کی بات ہے کہ شادی کے بعد بھی تم نے دوستوں کو ابھی تک دعوت نہیں دی ہے۔"

"اگر آپ دعوت کیلئے اتنے ہی بیتاب ہیں تو وہ کل ہی ہو سکتی ہے۔" حامد نے جواب دیا۔

"کیا یہاں،" وزیر اعظم صاحب چونکے۔

"اور کہاں۔ کیا جنگل میں منگل منانے کا محاورہ آپ نے نہیں سنا۔؟"

"نہیں بھئی۔ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔" حیدر صاحب کچھ پریشان سے نظر آنے لگے تھے "میں یہاں تنہائی سکون اور آرام کے خیال سے آیا ہوں۔ اتنی احتیاط رکھی ہے کہ یہ خبر پریس میں بھی نہیں جانے دی ہے۔"

"جی ہاں۔ وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" حامد مسکرایا "اس نرتبہ آپ اس شان سے تشریف لائے ہیں جیسے کسی دوست کے گھر نہیں دشمن کے علاقے میں جا رہے ہوں۔"

وزیر اعظم صاحب نے کوئی جواب دینے کا ارادہ کیا مگر پھر اختر کی طرف دیکھ کر رک گئے "تم نے اپنے دوست کا مکمل تعارف نہیں کرایا۔" وہ بولے۔

"آجکل یہ اپنی شخصیت کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔" حامد کے بجائے اختر نے جواب دیا۔ "اس لئے اپنا تعارف میں خود ہی کرائے دیتا ہوں، نام تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ اور یہ بھی کہ میں زمانۂ طالب علمی سے حامد صاحب کا دوست ہوں۔ جہاں تک کام کا تعلق ہے تو کئی چھوٹے موٹے پیشے آزمانے کے علاوہ کرائم رپورٹر بھی رہ چکا ہوں اور آجکل حامد صاحب بڑی سنجیدگی سے مجھے اپنی جاگیر کا منتظم اعلیٰ بنانے کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔" حامد نے حیرت سے اختر کی طرف دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ "آپ نے جس طرح حامد صاحب کی بات کا جواب دینے کے بجائے میرے بارے میں دریافت کیا ہے۔" اختر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میرے متعلق یہ اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ مجھ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ تو اس سلسلے میں کیا آپ اس امر واقعہ کو اعتماد کا ووٹ نہیں سمجھتے کہ شادی کے بعد حامد صاحب نے جس دوست کو اپنے ساتھ بنگلے میں قیام کی دعوت دی ہے وہ یہ کمترین ہی ہے۔"

حیدر صاحب نے بڑی خوش دلی سے ایک قہقہہ بلند کیا حامد مسکرانے لگا اور نرگس کچھ جھینپ سی گئی۔ زیبا البتہ اسی طرح سپاٹ چہرہ لیئے بیٹھی رہی جس طرح وہ اب تک خاموش تماشائی بنی رہی تھی۔

"آدمی ہوشیار معلوم ہوتے ہو۔" انہوں نے کہا اور پھر دفعتاً سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ "میں نوابزادہ حامد علی کو کافی مدت سے جانتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ انہیں ملکی سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور بہت محب وطن آدمی ہیں اس لئے خاص طور پر ایسے موقع پر جبکہ میں بھی یہاں آ رہا تھا یہ کسی ایسے شخص کو مدعو نہیں کر سکتے جن پر انہیں اعتماد نہ ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں ملکی سیاست ایک ایسے موڑ پر آ کھڑی ہوئی ہے کہ اگر ہوشیاری اور وطن دوستی کے جذبہ سے کام نہیں لیا گیا تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس ملک کا کیا حشر ہوگا۔"

"آپ تو بڑی خطرناک باتیں کر رہے ہیں۔" حامد نے تعجب سے کہا۔

"حالات اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔" حیدر صاحب نے جواب دیا "میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگ اس افواہ سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ حزب اختلاف حکومت کے بعض انقلابی اقدامات کو جواز بنا کر ہماری پارٹی میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں پس و پیش نہیں کہ ہر جماعت کی طرح ہمارے یہاں بھی کچھ ایسے مفاد پرست گھس آئے ہیں جو اپنے فائدے کے لئے ملک و ملت کو بھی بیچ ڈالنے سے گریز نہیں کریں گے اور جب سے حزب اختلاف کو اس آدمی عثمان کی قیادت میسر آئی ہے برابر جوڑ توڑ کے ذریعے ہمارے ارکان کو بغاوت پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ عثمان کو اپنی ہر کوشش میں منہ کی کھانا پڑ رہی ہے۔ ایک دو ممبروں کے سوا سب ہمارے ساتھ ہیں۔ اس کا منصوبہ تھا کہ بجٹ میں بعض نئے ٹیکس عائد کرنے کے مسئلہ پر حکومت کو ووٹنگ میں شکست دیکر خود اقتدار پر قبضہ کرلے مگر جب یہ آرزو پوری ہوتی دکھائی نہیں دی تو وہ میری جان کا دشمن بن گیا۔"

"ارے نہیں۔" حامد نے جلدی سے کہا "عثمان صاحب سے میری زیادہ واقفیت نہیں ہے مگر میں جانتا ہوں وہ ایسے آدمی نہیں ہیں کہ اپنے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی کی جان کے گاہک بن جائیں۔"

"تمہاری یہی بات ظاہر کرتی ہے کہ تمہیں لوگوں کو پرکھنے کا کتنا کم تجربہ ہے۔" حیدر صاحب نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا "میں کوئی بات بغیر ثبوت کے نہیں کہہ رہا ہوں۔ کچھ ایسے لوگ جنہیں عثمان اپنا دوست سمجھتا ہے میرے بہی خواہ ہیں اور ان کی زبانی انتہائی باوثوق طور پر مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ عثمان نے مجھے قتل کرنے کے لئے کچھ غنڈوں کی خدمات حاصل کی ہیں۔"

"حیرت ہے۔ میں عثمان صاحب کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔"

"آپ ابھی کچھ ثبوت کی بات کر رہے تھے۔" اختر نے کہا۔

"جی ہاں۔" حیدر صاحب نے کہا اور اپنی پی اے کی طرف دیکھا۔

"زیبا تم اختر صاحب کو اس فون کال کے بارے میں بتا سکتی ہو۔"

"پی ایم صاحب نے یہاں آنے کا پروگرام اپنے طور پر بنایا تھا۔" زیبا نے جواب دیا "اور چند قریبی لوگوں کے علاوہ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ پی ایم صاحب ۲۲ مئی سے ۲۷ مئی تک یہاں قیام کرنے کے ارادے سے آ رہے ہیں۔ خود مجھے بھی یہ ہدایت تھی کہ میں کسی کو بھی اس کے بارے میں ایک حرف نہ بتاؤں۔ لیکن ۱۹ مئی کو جبکہ پی ایم صاحب ایک آرٹ گیلری کا افتتاح کرنے گئے ہوئے تھے مجھے ایک فون ملا۔ بولنے والے نے اپنے آپ کو حیدر صاحب بتاتے ہوئے کہا کہ یہاں آرٹ گیلری میں امریکہ کے سفیر نے انہیں ۲۳ مئی کو اپنے یہاں ایک تقریب میں شریک ہونے کی دعوت دی ہے میں ذرا ان کا پروگرام دیکھ کر بتاؤں کہ اس تاریخ کو انہیں کوئی ایسی مصروفیت تو نہیں ہے جو یہ دعوت قبول کرنے میں مانع ہو۔ بات اتنی عام اور لب و لہجہ اتنا سرسری تھا کہ مجھے ایک لمحہ کے لئے یہ گمان نہیں ہو سکا کہ مخاطب پی ایم صاحب کے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے اور میں نے بغیر سوچے سمجھے بتا دیا کہ آپ تو ۲۲ سے ۲۷ تک پیرکوٹ میں ہونگے جواب میں بولنے والے نے شکریہ ادا کر کے ریسیور رکھ دیا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ پروگرام ایسا تو نہیں تھا جو پی ایم صاحب کو یاد نہ رہتا۔ نیز ایسی کوئی بات تھی بھی تو آرٹ گیلری سے فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس طرح کی دعوتیں نہ اتنی فوری دی جاتی ہیں اور نہ زبانی۔ میرے ذہن میں ایک الجھن سی رہی اور جب پی ایم صاحب واپس آئے تو میں نے ان سے فون کال کا ذکر کیا.....۔"

"وہ فون میں نے نہیں کیا تھا۔" حیدر صاحب زیبا کی بات کاٹ کر باقی گفتگو کا فرض اپنے ذمہ لیتے ہوئے بولے۔ "چنانچہ یہ سنکر کہ کسی نے میرے نام سے فون کیا تھا فطری طور پر مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے فوراً وہ کال چیک کرنے کا حکم دیا۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ وہ فون کال واقعی آرٹ گیلری کے ایک فون بوتھ سے کی گئی تھی۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ افتتاح کی تقریب میں عثمان بھی آیا ہوا تھا اور جب میں نے تقریب کے دوران اس کی نقل و حرکت کی تفتیش کرائی تو معلوم ہو گیا کہ جس وقت فون کیا گیا تھا، اس وقت ایک نہیں تین تین گواہوں نے اسے فون بوتھ میں کھڑے دیکھا تھا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ وہ فون عثمان صاحب نے کیا تھا۔" حامد نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔" حیدر صاحب نے کہا "وہ مجھے بجٹ پیش ہونے سے قبل اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے اور اس کام کے لئے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں یہاں آرام کرنے اور شکار کھیلنے آیا ہوں۔ پیرکوٹ چھوٹا سا قصبہ ہے یہاں مجھے کسی طرف سے کیا خوف ہو سکتا ہے حفاظتی انتظامات بھی ناکافی ہونگے۔ قصبہ ہونے کی وجہ سے فوری طور پر کوئی کارروائی بھی نہیں کی جا سکتی اور شکار کے لئے کئے جانے والے فائروں میں ایک گولی میری طرف بھی چلا دی جائے تو کسی کو کیا خبر ہو سکتی ہے۔"

"مگر آپ تو بڑے انتظامات کے ساتھ آئے ہیں۔"

"یہ تو میں نے خبردار ہونے کے بعد احتیاط کی ہے لیکن عثمان تو اسی بنیاد پر منصوبہ بنا رہا ہوگا جو میں نے بتائی۔"

"لیکن کیا اسے یہ خیال نہیں ہوگا کہ اس کی فون کال چیک کی جا سکتی ہے جس کے بعد آپ کا محتاط ہونا یقینی ہے۔" اختر نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں اس نے زیبا کی ذہانت کا اندازہ بہت غلط لگایا ہے۔" حیدر صاحب نے کچھ ہنستے ہوئے اپنی پی اے کی طرف دیکھا۔ "عثمان کا خیال ہوگا کہ عورت ذات بھلا اتنی معمولی باتوں پر کہاں توجہ دیتی ہے۔"

"اگر آپ کو عثمان صاحب کی جانب سے حملہ کا اتنا ہی یقین تھا تو پروگرام ختم کر دیا ہوتا۔" نرگس نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا۔

"بیگم حامد میں اس ملک کا سربراہ ہوں کم سے کم مجھے تو اتنا بزدل نہیں ہونا چاہیئے کہ دشمن کے چیلنج کا جواب دے سکوں۔" حیدر صاحب نے گردن سیدھی کرتے ہوئے جواب دیا۔ "وزارت عظمیٰ پھولوں کی سیج نہیں ہوتی۔ میں اگر ایسی معمولی معمولی باتوں سے خوفزدہ ہو جاتا تو مجھے یہ عہدہ قبول ہی نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ میرا تو ارادہ تھا کہ ایک بھی حفاظتی گارڈ ساتھ لیئے بغیر یہاں آؤں اور پھر دیکھوں کہ وہ کون مائی کا لال ہے جو مجھ پر گولی

چلانے کی جرأت کرتا ہے۔ مگر ہمارے سکیورٹی ڈیپارٹمنٹ کے نگرانِ اعلےٰ اس وقت تک نہیں مانے جب تک انہوں نے یہ پورا دستہ میرے ساتھ نہیں کر دیا۔ پھر بھی آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں اپنے وزیروں، مشیروں، صوبائی حکام اور جی حضوریوں کے بغیر یہاں آیا ہوں۔"

"حفاظتی اقدامات کی بات ہو رہی ہے تو میں اس سلسلہ میں یہ دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ اس وقت آپکے بنگلے میں ملازمین کے علاوہ اور کون کون لوگ مقیم ہیں۔" زیبا نے حامد کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

"بس جتنے افراد کو آپ یہاں دیکھ رہی ہیں۔" حامد نے جواب دیا۔

"آپ ممتاز بھائی کو بھولے جا رہے ہیں جو کل آنے والے ہیں۔"

"اوہ۔ مجھے واقعی یاد نہیں رہا تھا۔"

"یہ ممتاز کون صاحب ہیں۔" حیدر صاحب نے پوچھا اور پھر نرگس کی طرف دیکھ کر بولے۔ "کیا آپ کے بھائی"

"جی ہاں۔"

"تب تو پھر وہ اپنے ہی آدمی ہوئے۔"

"آپ نے اچھا کیا کہ ان کی آمد کے بارے میں بتا دیا" زیبا نے کہا "میں سکیورٹی گارڈ کے کیپٹن کو مطلع کر دوں گی ورنہ بہت ممکن تھا کہ ممتاز صاحب بنگلے تک پہونچ پاتے۔ اچھا ملازمین تو سب آپکے پرانے اور قابلِ اعتماد ہیں۔"

"یقیناً۔" حامد نے جواب دیا۔

"افوہ زیبا تم یہ کیا جرح کرنے بیٹھ گئی ہو۔" حیدر صاحب نے منہ بنایا "میں یہاں آرام کرنے آیا ہوں ان فکروں میں ذہن پریشان کرنے نہیں آیا۔" انہوں نے حامد کی طرف دیکھا "شکار کیلئے کب چل رہے ہو۔"

"جب آپ کہیں"

"میرا خیال ہے کہ کل تو میں چادر تان کر دن بھر چین کی نیند سوؤں گا۔ البتہ پرسوں صبح چلنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

"جیسی آپ کی خوشی" حامد نے جواب دیا "آج شام کا کھانا کس وقت کھائیں گے۔؟"

"ابھی تو کھانے کی کوئی خواہش ہی محسوس نہیں ہو رہی ہے"

"ایک دو گیم ٹینس کے ہو جائیں تو پھر دیکھئے گا کہ بھوک کیسی کھل کر لگتی ہے"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں" حیدر صاحب نے نرگس کی طرف دیکھا "بشرطیکہ بیگم حامد میری پارٹنر بننا پسند کریں۔"

"مجھے کھیلنا نہیں آتا" نرگس نے بڑی ادا سے چشمہ سنبھالتے ہوئے [illegible] "آپ ہار جائیں گے۔"

"جیتنے کی تمنا بھی کسے ہے" حیدر صاحب نے ایک گہری سانس لیکر اٹھتے ہوئے کہا "میرا مطلب ہے کہ کھیل ہی تو ایک ایسا میدان ہے جہاں میں اپنے ہارنے کی حسرت پوری کیا کرتا ہوں۔"

دوسرے دن ممتاز بھی آ گیا۔ وہ حامد ہی کی عمر اور تقریباً اسی کے قد و قامت کا ایک ذہین نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ چہرے کے خدوخال میں نرگس سے اتنی مشابہت موجود تھی کہ وہ یقیناً اس کا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ وہ اختر کے ساتھ بھی بڑی بے تکلفی سے ملا۔ اس کی باتیں اتنی دلچسپ اور پُرمذاق تھیں کہ زیبا جیسی لڑکی جو خود کو ہر وقت سنجیدہ ظاہر کرنیکی کوشش کرتی رہتی تھی اس کی باتوں پر منہ پھیر کر مسکرانے پر مجبور ہو جاتی تھی لیکن معلوم نہیں کیا بات تھی کہ حیدر صاحب کی موجودگی میں ممتاز ایکدم خاموش ہو جاتا اور پھر کسی نہ کسی بہانے سے اُٹھ کر چلا جاتا۔ اختر نے کئی مرتبہ حامد سے ممتاز کے بارے میں بات کرنیکی کوشش کی مگر حامد حیدر صاحب کی بائیں شکران کی سلامتی کی طرف سے اتنا فکرمند ہو گیا تھا کہ سرِدست نرگس اور ممتاز میں اس کی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ اسے سب سے زیادہ یہ بات پریشان کر رہی تھی کہ اگر اس کے بنگلے کے دورانِ قیام حیدر صاحب پر کوئی آنچ آئی تو نہ صرف اسکی میزبانی پر حرف آئیگا بلکہ ہوسکتا ہے کہ لوگ اُسے بھی اس سازش میں ملوث خیال کرنے لگیں کیونکہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ حزبِ اختلاف کا لیڈر بننے کے بعد عثمان صاحب سے بھی اس کے اچھے خاصے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ اتنا ہی نہیں اس نے اختر سے بھی یہی کہا کہ وہ فی الحال نرگس اور ممتاز کو بھول کر حیدر صاحب کی حفاظت کو اپنی ذمہ داری میں شامل کرے۔

معلوم نہیں یہ حامد کی فہمائش کا اثر تھا یا اختر کسی اور ہی چکر میں تھا کہ تیسرے دن جب ممتاز سمیت پوری پارٹی شکار کیلئے روانہ ہوئی تو اختر نے معذرت کر لی اور ایک ضروری کام کا عذر پیش کرتے ہوئے گھڑیالی چلا گیا جو ہرکوٹ سے سات میل دور واقع تھا اور جہاں ڈاکخانے اور تار گھر کے علاوہ ٹیلیفون کی سہولت بھی میسر تھی۔ ادھر حامد دن بھر سائے کی طرح حیدر صاحب کے ساتھ لگا رہا۔ اُسے اندیشہ تھا کہ اگر وزیرِ اعظم صاحب کے خدشات کچھ بھی درست ہیں تو ان پر حملے کی بہترین جگہ جنگل ہی ہو سکتا ہے جس کا احاطہ کرنا بجا گارڈز کے بس کی بات نہیں تھی اور کوئی بھی شخص کسی بھی سمت سے گھنے درختوں کی آڑ سے لیتے ہوئے شکارگاہ تک آ کر حیدر صاحب کو نشانہ بنا سکتا تھا۔

لیکن دن کسی حادثے کے بغیر گزر گیا اور حامد نے اطمینان کی سانس لی۔ شکار بھی کامیاب رہا تھا۔ شام ہونے سے قبل ہی وہ سب بنگلے پر واپس آ گئے۔ اختر بھی اس وقت تک اپنے پراسرار مشن سے لوٹ چکا تھا اور لان میں کرسی ڈالے سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے کسی گہری سوچ میں کھویا

ہوا نظر آ رہا تھا۔ بنگلے کے گیٹ پر سکیورٹی گارڈز کے کیپٹن نے حیدر صاحب کو دارالحکومت سے آئے ہوئے کچھ اہم کاغذات کا تھیلا پیش کیا۔ حیدر صاحب نے لباس تبدیل کرنے سے قبل ایک نظر کاغذات پر ڈالی اس خیال سے کہ کوئی معاملہ فوری طور پر توانکی توجہ نہیں چاہتا معلوم ہوا کہ ان کا خیال درست تھا، چنانچہ انہوں نے زیبا کو ہدایت کی کہ وہ لباس تبدیل کرنے کے بعد فوراً انکے کمرے میں آ جائے جہاں انہیں کچھ ضروری خطوط کے جوابات لکھوانا ہیں۔

حیدر صاحب کی مصروفیت اتنی طویل ثابت ہوئی کہ کھانے کے لئے بھی زیادہ وقت نہیں دے سکے اور فارغ ہوتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ مختلف مہمانوں کو دیئے جانے والے کمروں کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ حیدر صاحب اور زیبا کے کمرے ایک دوسرے سے ملحق تھے اس کے بعد ایک مختصر سا کوریڈور تھا جس کے بعد ڈرائنگ روم کے برابر کا کمرہ اختر کے پاس تھا اور اس کے سامنے والا کمرہ ممتاز کو دیا گیا تھا۔ حامد اور نرگس بنگلہ کے نسبتاً عقبی حصہ کے کمروں میں تھے۔ جہاں باورچی خانہ اور کھانے کا کمرہ بھی واقع تھا۔

آخر پونے گیارہ بجے خدا خدا کر کے کام ختم ہوا۔ حیدر صاحب نے زیبا کو ہدایت کی کہ وہ سونے سے قبل ٹائپ کا تمام کام ختم کر لے تاکہ صبح دستخطوں کے بعد جملہ ضروری کاغذات دارالحکومت روانہ کیئے جا سکیں۔ دن بھر کے شکار اور پھر اس دفتری مصروفیت نے حیدر صاحب کو بیحد تھکا دیا تھا۔ وہ زیبا کے کمرے سے جاتے ہی بستر پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ دوسری طرف زیبا نے اپنے کمرے میں پہونچ کر پورٹیبل ٹائپ رائٹر نکال کر میز پر رکھا بریف کیس سے وزیرِ اعظم صاحب کا مخصوص لیٹر پیڈ برآمد کرتے ہوئے مطلوبہ مقدار میں کاغذ ٹائپ رائٹر میں لگا کر ٹائپ کرنے لگی۔ ٹائپ کرتے کرتے وہ کچھ رکی، جھک کر اپنی شارٹ ہینڈ نوٹ بک میں دیکھنے لگی۔ اس طرح کام نہیں بنا تو اسے اٹھا کر زیادہ روشنی میں غور سے دیکھا۔ نفی میں سر ہلایا۔ رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اسے آئے پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ امکان تھا کہ شاید ابھی حیدر صاحب نہ سوئے ہوں۔ کچھ ہچکچاتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھی اور نوٹ بک اٹھا کر دروازے کی طرف چلی۔ ابھی اس کا ایک قدم اندر اور ایک کوریڈور میں تھا کہ اس نے کسی شخص کو حیدر صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ اس کی صرف پشت ہی دیکھ سکی تھی لیکن رات کے گیارہ بجے کسی بھی شخص کا اس مشکوک انداز میں وزیرِ اعظم صاحب کے کمرے میں داخل ہونا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا وہ تقریباً بھاگتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی۔ حیدر صاحب اپنے بستر پر دراز تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ سو رہے ہیں یا محض آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ وہ شخص دروازے کے پاس ہی رُک گیا تھا۔ زیبا نے دیکھا کہ اس نے ہاتھ میں سائیلنسر لگا ہوا ریوالور پکڑ رکھا ہے اور نشانہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ زیبا کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور اس نے آگے بڑھ کر اس شخص کا سیدھا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

چیخ سنتے ہی حیدر صاحب نے آنکھیں کھول دیں اور اچھل کر بستر سے کھڑے ہوئے۔ ادھر اس شخص نے فائر کر دیا۔ ایک ہلکے پٹاخے جیسی آواز سُنائی دی مگر گولی یقیناً خطا گئی تھی کہ حیدر صاحب لپک کر اس شخص کی طرف دوڑے۔ اسی وقت حامد بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ زیبا ابھی تک اس شخص کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی لیکن اس شخص نے۔ جس نے منہ پر ایک سیاہ ریشمی رومال آنکھوں کے نیچے تک باندھ رکھا تھا، زیبا کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور اسے اپنے آگے لے لیا۔

"خبردار" وہ سانپ کی طرح پھنکارا "اگر کسی نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میں اس لڑکی کو گولی مار دوں گا۔"

حامد نے حیدر صاحب کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہونچا ہے اطمینان کی سانس لی۔ حیدر صاحب کمرے کے وسط میں آ کر رک گئے تھے۔ حامد دروازے کے پاس کھڑا تھا۔

"راستے سے ہٹ جاؤ۔" اس شخص نے کہا۔

"رومال سے چہرہ چھپانے کے باوجود تم اپنی آواز نہیں بدل سکے ممتاز۔" حامد نے کہا "اس بنگلے کے باہر پچاس سکیورٹی گارڈز موجود ہیں تم فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ بہتر ہوگا کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"تو یہ ممتاز ہے" حیدر صاحب نے گہری سانس لی۔ مگر ممتاز کوئی جواب دیئے بغیر زیبا کو ڈھال بنائے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ حامد نے راستہ چھوڑ دیا تھا وہ اور حیدر صاحب دونوں زیبا کی وجہ سے کوئی قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ دروازے سے باہر نکلتا اچانک اختر اس کے پیچھے نمودار ہوا بجلی جیسی سرعت سے اس کا ہاتھ چلا۔ ممتاز نے آہٹ سُن کر گھوم کر دیکھنا چاہا لیکن اختر کا زبردست گھونسا اس سے قبل ہی اس کی گدی پر پڑ چکا تھا۔ اسکے منہ سے ایک ہلکی سی کراہ نکلی اور وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اختر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا۔

"تو تم نے اس فرضی شادی کا ڈرامہ اس لئے اسٹیج کیا تھا کہ تم ملک کے وزیرِ اعظم کی زندگی ختم کرنا چاہتے تھے۔" حامد نے انتہائی غصہ سے پوچھا۔ ممتاز کو ہوش آ گیا تھا اور اب وہ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا اپنی گردن سہلا رہا تھا۔ مگر اس کے کسی بھی انداز سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ موجودہ صورتِ حال سے خوفزدہ یا پریشان ہے۔ اسکی تیز نظریں کبھی زیبا کو گھورنے

لگیتیں کبھی اختر کو جیسے وہ ان دونوں کو اپنے منصوبے کی ناکامی کا ذمہ دار خیال کرتے ہوئے انتقام کے خیال سے جوش کھا رہا ہو۔

"میں نہیں سمجھتا کہ میرے انکار یا اقرار سے کوئی فرق پڑ سکتا ہے" وہ سخت لہجے میں بولا اور حیدر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ تم میرے ہاتھ سے بچ گئے۔ مگر اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو صرف ایک ہاتھ تھا۔ ایسے نہ جانے کتنے ہاتھ تمہارا چراغ گُل کرنے کے لئے آگے بڑھ چکے ہیں۔"

"لیکن آخر تمہیں مجھ سے ایسی کیا دشمنی تھی" حیدر صاحب نے کہا "جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پھر تم میری جان کے گاہک کیوں بن گئے تھے"

"آپ سمجھے نہیں سر" زیبا نے ممتاز کو گھورتے ہوئے کہا "یہ خود نہیں آیا کسی کا بھیجا ہوا ہے۔"

"اوہ۔" حیدر صاحب چونکے "تمہارا مطلب ہے کہ اسے عثمان نے بھیجا ہے۔"

"بہت دیر میں سمجھے حیدر علی صاحب" ممتاز کا لہجہ بڑا طنزیہ تھا

"مجھے حیرت ہے" اختر نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا "تم نے اس خطرناک کام کے لئے عثمان صاحب کا آلۂ کار بننا کیوں پسند کر لیا جبکہ تمہیں ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہونا چاہیئے۔ میں معلوم کر چکا ہوں کہ انہوں نے تمہیں اپنے پبلشنگ ادارے کی منیجری سے بظاہر کسی قصور کے بغیر نکال دیا تھا۔"

نہ صرف ممتاز بلکہ حیدر صاحب بھی اس انکشاف پر کچھ حیرت زدہ سے نظر آرہے تھے۔ "تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا" حیدر صاحب نے پوچھ ہی لیا۔

"میں آج اسی لئے گھڑیالی گیا تھا کہ ممتاز کے بارے میں کچھ تحقیقات کر سکوں" اختر نے جیب سے سگریٹ کیس نکالتے ہوئے بتایا "میں اخبار کی ملازمت چھوڑ چکا ہوں مگر اب بھی وہاں کچھ دوست ایسے ہیں جو میری خاطر پرانا ریکارڈ دیکھ کر کچھ مفید معلومات بتا سکیں۔"

"عثمان بڑا گہرا آدمی نکلا" حیدر صاحب نے کہا "اس نے غالباً اسی خیال سے ممتاز کو برطرف کیا تھا کہ اگر یہ اپنی مہم میں ناکام ہو کر پکڑا جائے تو کوئی براہِ راست اسے اس سازش میں ملوث ثابت نہ کر سکے۔"

"مجھے اب بھی حیرت ہے کہ تم نے اپنی اور اپنی بہن کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے پہلے یہ نہیں سوچا کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جانے کے باوجود تمہارے فرار کے امکانات مایوس کن ہیں۔ یہاں سے نکل بھی جاتے تب بھی پکڑے جاتے۔ پورے ملک کی پولیس تمہارے پیچھے پڑ جاتی۔"

"اس کا انتظام پہلے ہی کر لیا گیا تھا" ممتاز نے فخریہ لہجہ میں بتایا۔

"نرگس اس وقت اپنے کمرے میں تیار بیٹھی ہوگی۔ میرا اور اس کا پاسپورٹ، سوئٹزرلینڈ کا ویزا اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ سب کچھ موجود تھا۔ گھڑیالی پر ایک ہیلی کاپٹر ہمارا منتظر ہوگا جو ہمیں ایک گھنٹے میں دارالحکومت پہونچا دیتا جہاں سے رات کے ایک بجے ایک طیارہ سوئٹزرلینڈ کے لئے پرواز کرتا ہے۔"

حیدر صاحب نے بڑی غضیلی نظروں سے ممتاز کو گھورا۔ اپنے بستر کی طرف لگے تکیہ کے نیچے سے ریوالور نکالا اور ممتاز کو زد پر لیتے ہوئے حامد سے بولے۔ "تم زیبا کو اپنے ساتھ ڈائریکٹ فون والے کمرے میں لیجاؤ اور زیبا تم دارالحکومت میں شریف صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ میں اب تک عثمان کو ڈھیل دے رہا تھا مگر معلوم ہوتا ہے اس کی آزادی کے دن ختم ہو چکے ہیں اب وہ اپنی ریشہ دوانیاں جاری نہیں رکھ سکے گا۔ صبح ہونے سے پہلے اسے جیل کی کوٹھری میں ہونا چاہیئے" یہ کہکر وہ اختر کی طرف گھومے "میں اس بدمعاش کو کور کرتا ہوں تم گیٹ سے کیپٹن سعید کو بلا لاؤ۔"

وہ سب یکے بعد دیگرے کمرے سے باہر نکلے۔ ڈائریکٹ فون ڈرائنگ روم میں رکھا رہتا تھا۔ حامد اور زیبا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے مگر اختر جسے گیٹ پر جانا تھا اس وقت تک وہیں کھڑا رہا جب تک وہ کمرے کے اندر نہیں چلے گئے اس کے بعد اس نے پھرتی سے اپنی انگلیوں میں پکڑا ہوا سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے سے مسلتے ہوئے بنگلے کے عقبی حصے کا رخ کیا جہاں نرگس کا کمرہ واقع تھا۔

نرگس نے پہلی ہی دستک پر دروازہ کھول دیا مگر اختر کو دیکھ کر یوں گھبرا کر پیچھے ہٹی جیسے کسی نے اسے زور سے دھکا دیدیا ہو۔ اختر نے کمرے میں ایک گھومتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ نرگس اس وقت پورے لباس میں تھی۔ دو سوٹ کیس دروازے کے قریب ہی رکھے تھے۔ گویا ممتاز کا کہنا درست ہی تھا۔ وہ دونوں فرار کی مکمل تیاری کر چکے تھے۔

"مجھے نہیں معلوم کہ اس سازش میں تم اپنی مرضی سے شامل ہوئی ہو یا بھائی کی محبت نے تمہیں یہ خطرناک کھیل کھیلنے پر مجبور کیا تھا" اختر نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر تم نے ہوشیاری اور سمجھداری سے کام نہیں لیا تو نہ صرف ممتاز بلکہ تمہاری زندگی بھی انتہائی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔" یہ کہکر اس نے نرگس کا بازو پکڑا اور چپکے چپکے اس کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کچھ کہنے لگا۔

***

ابھی اختر اور نرگس حیدر صاحب کے کمرے سے چند قدم دور ہی تھے کہ انہوں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ آواز زیادہ بلند نہیں تھی جسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اختر آواز سنتے ہی کمرے کی طرف دوڑا۔ اس نے زور سے دروازہ کھولتے ہوئے اندر قدم رکھا تو حیدر صاحب ہاتھ میں ریوالور پکڑے کھڑے تھے اور ممتاز فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے سینے کے اوپر ایک گول سوراخ نظر آرہا تھا جس سے خون نکل کر قالین پر گرنے لگا تھا۔

"اس بدمعاش نے مجھ سے ریوالور چھین کر فرار ہونے کی کوشش کی تھی" حیدر صاحب نے بتایا۔ اتنی دیر میں نرگس بھی اندر داخل ہو چکی تھی۔ اس نے جو ممتاز کو اس حالت میں پڑے دیکھا تو ایک لمحہ کے لئے جیسے سکتہ میں رہ گئی۔ "تم تو گارڈز کو لینے گئے تھے" حیدر صاحب نے اختر سے پوچھا۔ جو زمین پر جھک کر ممتاز کو دیکھ رہا تھا۔

آواز سن کر نرگس کو جیسے ہوش سا آگیا۔ وہ حیدر صاحب کی طرف گھومی "تو تم اپنے وفاداروں کو یہ صلہ دیتے ہو" وہ چیختی ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھے افسوس ہے لڑکی۔ مگر تمہارے بھائی نے میری جان لینے کی کوشش کی تھی" حیدر صاحب نے جواب دیا۔ اور اختر کی طرف دیکھکر بولے "تم کیا دیکھ رہے ہو۔ جا کر گارڈز کو کیوں نہیں لاتے"

"یہ جھوٹ ہے" نرگس چلائی "بلکہ تم نے اسے اپنا راز محفوظ رکھنے کے لئے دانستہ قتل کیا ہے"

"کیسا راز" اختر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس شخص نے اپنی کرسی چھن جانے کے خوف سے عثمان صاحب کے خلاف سازش کا منصوبہ تیار کیا تھا" نرگس کی کانپتی ہوئی انگلی حیدر صاحب کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ "اسے خوف تھا کہ بجٹ اجلاس میں اس کی پارٹی کے بہت سے ارکان حزب اختلاف سے مل جائیں گے۔ یہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر عثمان صاحب کو راستے سے ہٹا دیا جائے تو حزب اختلاف کسی اور لیڈر کے پیچھے جمع نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ اس نے میرے بھائی کی مدد سے خود اپنے اوپر مصنوعی حملے کا ڈرامہ کھیلا اس طرح کہ شبہ براہِ راست عثمان صاحب پر جائے اور اسے اقدامِ قتل کے جرم میں اپنے سب سے بڑے حریف پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جائے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو" حامد نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں" نرگس نے اپنی بات جاری رکھی "ممتاز بھائی کو کسی وجہ سے عثمان صاحب نے ملازمت سے برطرف کر دیا تھا اور وہ ان کے دشمن بن گئے تھے۔ اس آدمی نے ان کی دشمنی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنا آلۂ کار بنایا اور اپنے بھائی کی محبت سے مجبور ہو کر میں بھی اس سازش میں شریک ہو گئی۔ اس فریبی انسان نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس فرضی حملے کے بعد ممتاز بھائی پکڑے بھی گئے تو وہ انہیں فرار ہونے کا موقع دیدیگا۔ اس نے ہماری تسلی کے لئے پاسپورٹ ویزا اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ تک بنوا دیئے تھے اور کہا تھا کہ وہ کسی قیمت پر بھی ممتاز بھائی کو اور مجھے پولیس یا عدالتی کارروائی میں نہیں پھنسنے دیگا اور

سوئٹزرلینڈ کے کسی بینک میں اتنی رقم جمع کرا دے گا کہ ہماری باقی زندگی عیش و آرام سے گزرے گی مگر اب اس نے اپنا راز محفوظ رکھنے کے لئے انہیں قتل کر دیا اور شاید مجھے بھی زندہ نہ چھوڑے مگر آپ سب لوگ گواہ رہیں کہ عثمان صاحب بالکل بےگناہ ہیں اور...؟

"بکواس بند کر لڑکی۔" حیدر صاحب جوش میں آ کر بولے "معلوم ہوتا ہے بھائی کی موت نے تیرا دماغی توازن خراب کر دیا ہے"۔

"مجھے افسوس ہے حیدر صاحب کہ اب بازی آپکے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔" اختر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"خوب، تو تم بھی عثمان کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔ گارڈز کو بلانے کے بجائے تم نرگس کے پاس اس لئے گئے تھے کہ اسے ورغلا کر میرے خلاف بیان دلا سکو۔" حیدر صاحب نے غصے سے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ بات سچ ہے تو مجھے بتایئے کہ آپکے پاس اس سوال کا کیا جواب ہے کہ ریوالور آپکے تکیہ کے نیچے بھرا رکھا تھا مگر آپ ممتاز کے پہلا فائر کرنے کے بعد اسے اپنی مدافعت میں نکالنے کے بجائے ممتاز کو پکڑنے کے لئے دوڑ پڑے" اختر نے کہا اور پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا "آپ چاہتے تو اسی وقت اسے ختم کر سکتے تھے مگر آپ کا پلان یہ تھا کہ ممتاز اس وقت تک زندہ رہے جب تک وہ ہم سب کے سامنے اس سازش کا اعتراف نہ کرے کہ اسے عثمان صاحب نے آپ پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا تھا۔ اس بیان کے بعد اب آپکو اس کی ضرورت نہیں رہی تھی اور آپ نے ہم سب کو کسی نہ کسی بہانے سے باہر بھیجکر اسے گولی مار دی۔"

"تمہیں یہ گستاخی بہت مہنگی پڑیگی اختر۔" حیدر صاحب گرجے۔

"یہ غصہ غالباً اس لئے ہے کہ آپ سمجھتے ہیں میرے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کیلئے کوئی ثبوت نہیں ہے۔" اختر نے میز کے قریب جاتے ہوئے وہ سگریٹ کیس اٹھا لیا جو سگریٹ سلگانے کے بعد اس نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ "آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ بظاہر یہ سگریٹ کیس نظر آتا ہے مگر حقیقت میں یہ ایک بہت حساس ٹیپ ریکارڈر ہے۔ ہم سب کے کمرے سے نکلنے کے بعد آپکے اور ممتاز کے درمیان جو بھی گفتگو ہوئی ہے وہ سب اس پر ریکارڈ ہو چکی ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ آپکے ہزار ڈھونگ کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے، کہ آپکی پارٹی کے ممبران کی ایک کثیر تعداد حزب اختلاف سے جا ملی ہے اور آپکو حکومت سے نکالنے کے لئے صرف بجٹ سیشن کا انتظار تھا۔ آپ یہ بات جانتے تھے اور آپکا خیال تھا کہ اگر عثمان صاحب کو راستے سے ہٹا دیا جائے تو چونکہ کوئی اور لیڈر تمام ممبران کا معتمد علیہ نہیں اس لئے آپکی پارٹی منتشر ہونے سے بچ جائے گی۔ اس کے لئے جیسا کہ ابھی نرگس نے بتایا آپ نے ممتاز کی

عثمان صاحب سے نفرت کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ گارڈز کی موجودگی میں اس بنگلے میں کوئی اجنبی قدم نہیں رکھ سکتا تھا اس لئے آپ نے ممتاز کو آمادہ کیا کہ وہ حامد صاحب کو پھانسے اور اس طرح بیوی اور سالے کی حیثیت سے وہ دونوں آپکے دوران قیام بنگلے میں موجودگی کا حق حاصل کر لیں۔ بلاشبہ آپ کا منصوبہ بہت کامیاب تھا۔ ممتاز اور نرگس کی موت کے بعد کیونکہ آپ دونوں کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکے تھے، چاہے عدالت سے عثمان صاحب کو مجرم قرار دیا جاتا یا نہیں۔ لیکن اس واقعہ سے وہ اتنے بدنام ہو جاتے کہ پھر سیاسی طور پر آپ سے ٹکر نہیں لے سکتے تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ آج شام تک جبکہ میں گھڑ یالی سے کچھ معلومات حاصل کر کے واپس آیا تھا مجھے یہ شک نہیں تھا کہ یہ خود آپ کی سازش ہو سکتی ہے۔ میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ اس فون کال کی داستان جو آپ نے زیبا صاحبہ کی زبانی ہمیں یہ باور کرانے کیلئے سنائی تھی کہ عثمان صاحب آپکے قتل کی سازش کر رہے ہیں کم سے کم اس حد تک غلط ضرور ہے کہ وہ فون عثمان صاحب نے نہیں کیا تھا۔ وہ آرٹ گیلری گئے ضرور تھے مگر ایک دوسری تقریب میں شریک ہونے کی غرض سے دس منٹ بعد ہی چلے گئے تھے اور وہ فون تقریباً نصف گھنٹے کے بعد کیا گیا تھا یہ جان کر بھی میرا شبہ آپ پر نہیں گیا۔ میں نے سوچا ممکن ہے کوئی اور آپکا دشمن ہو اور آپ چونکہ عثمان صاحب سے خوفزدہ ہیں اسلئے فطری طور پر آپ کا خیال ان کی طرف منتقل ہو گیا اور ان گواہوں نے جنھوں نے عثمان صاحب کو بوتھ میں دیکھنے کا بیان دیا تھا حقیقت میں کسی اور کو دیکھا ہو جس کا حلیہ عثمان صاحب سے ملتا ہو۔ لیکن جب میں نے ممتاز سے اس کا ریوالور لے کر چیک کیا تو یقین ہو گیا کہ اس پردہ زنگاری میں آپکی اپنی ذات پوشیدہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ ریوالور کے چیمبر میں عین گھوڑے کے نیچے واقعہ خانے میں جو گولی رکھی ہوئی ہے وہ نقلی ہے جبکہ باقی گولیاں اصلی تھیں۔ ممتاز ایک فائر کر چکا تھا جس نے آپکو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اس لئے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ وہ گولی بھی نقلی ہی تھی جو شخص کسی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو وہ ریوالور میں نقلی گولیاں رکھ کر نہیں آتا۔ ظاہر بات ہے کہ آپ نے مزید احتیاط کے خیال سے کہ کہیں غلطی سے ہی ممتاز کی گولی آپکو نہ لگ جائے اسے یہ ہدایت کی تھی کہ وہ نقلی گولیاں رکھ کر ریوالور لوڈ کرے اسے دو فائر کرنا تھے جس کے بعد یہ بتانا تقریباً ناممکن ہو جاتا کہ اس نے اصلی گولیاں چلائی تھیں یا نقلی۔ مگر آپکی بدقسمتی سے عین وقت پر زیبا صاحبہ مداخلت کر بیٹھیں۔ اور اسے دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں مل سکا یہ پہلی ٹھوس بات تھی جس نے مجھے آپکی جانب سے مشکوک کر دیا۔ اس کے بعد جب آپ نے تکیئے کے نیچے سے ریوالور نکالا تو مجھے دوسرا ثبوت مل گیا پھر جب میں نے ممتاز کے عثمان صاحب کے ادارے میں ملازم ہونے کا ذکر کیا تو وہ ہی نہیں آپ بھی چونک پڑے تھے۔ اس کی حیرت تو سمجھ میں آ سکتی ہے مگر آپ کو جو ممتاز

سے ناواقف ہونے کا پارٹ ادا کر رہے تھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ کبھی عثمان صاحب کا ملازم رہ چکا ہے۔ یہ گویا تیسرا نکتہ تھا جو آپکے خلاف جاتا تھا۔ ان سب باتوں کے علاوہ میں ممتاز کو بھی دیکھ رہا تھا وہ قطعی خوفزدہ نہیں تھا جو کہ ایک غیر فطری سی بات تھی اور اسی صورت میں ممکن ہو سکتی تھی کہ اسے آپکی جانب سے تحفظ کا اطمینان دلایا گیا ہو۔ مزید یہ کہ وہ جذباتی نوجوان پاسپورٹ ویزا اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے ساتھ ساتھ ہیلی کاپٹر کا ذکر بھی کر بیٹھا۔ یہ بات ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ حزب اختلاف کا کوئی لیڈر آپکی اطلاع کے بغیر پاسپورٹ کے محکمہ سے دو پاسپورٹ حاصل کرے کجا یہ کہ اس کے پاس ہیلی کاپٹر بھی موجود ہو۔ اسی موقع پر آپ نے یہ محسوس کر کے کہ ممتاز اپنی بیوقوفی سے کوئی اور غلط بات منہ سے نہ نکال بیٹھے ایکدم سے ریوالور سنبھالتے ہوئے ہم سب کو باہر بھیج دیا۔ مگر میں اس وقت تک آپکی جانب سے اتنا مشکوک ہو چکا تھا کہ ٹیپ ریکارڈر پیچھے چھوڑے بغیر نہیں رہ سکا۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے جاتے ہی جو گفتگو آپکے اور ممتاز کے درمیان ہوگی وہ ضرور سننے کے قابل ہوگی۔ چنانچہ یہ آخری ثبوت ہے جسے آپ اپنے تابوت میں آخری کیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیا ارادہ ہے کیا ان معزز سامعین کو ٹیپ سنا دیا جائے۔؟"

حیدر صاحب کا تمام جوش دودھ کے ابال کی طرح بیٹھ چکا تھا ان کا چہرہ اتنا سفید اور ستا ہوا نظر آ رہا تھا کہ جیسے کسی بھی لمحہ بیہوش ہو کر گر پڑیں گے مگر انہوں نے بڑی ہمت سے خود کو سنبھالا۔ لڑکھڑاتے ہوئے بستر کی طرف بڑھے اور دھم سے بیٹھ گئے۔ کمرے میں گہری خاموشی مسلط تھی۔ حامد۔ زیبا۔ نرگس سب حیرت سے کبھی اختر اور کبھی ملک کے وزیراعظم کی صورت دیکھ رہے تھے۔

"میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔" آخرکار حیدر صاحب نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مگر ایک ذہین نوجوان کی حیثیت سے، جیسا کہ تم نے اپنے آپ کو ثابت کیا ہے۔ تم یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہ ان حالات میں جبکہ ہمارا ملک اندرونی اور بیرونی خطرات میں گھرا ہوا ہے اگر یہ معاملہ اس کمرے کی چہار دیواری سے باہر نکل گیا تو یہ کتنی خطرناک بات ثابت ہو سکتی ہے اپنے لئے نہیں ملک کی سلامتی کے لئے میں تم سے اپیل کرتا ہوں کہ یہ ٹیپ ریکارڈر مجھے دیدو۔ میں اسکے بدلے تمہیں منہ مانگی رقم دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ اب بھی آپ نے نیک نیتی کا ثبوت نہیں دیا۔" اختر نے جواب دیا۔ "مگر قومی وقار کو مجروح ہونے سے بچانے کے لئے میں آپکے سامنے دو صورتیں رکھتا ہوں ان میں آپ اپنے لئے جو بہتر سمجھیں قبول کر لیں۔"

"وہ کیا؟" حیدر صاحب نے بیتابی سے پوچھا۔

"پہلی صورت تو یہی ہے کہ آپکی تمام داستان کل کے اخبارات میں آ جائے۔ آپ خود کو قوم کے سپرد کر دیں اور پھر وہ جو سلوک بھی آپکے ساتھ کرے۔"

"یہ ناممکن ہے۔ میں اس ذلت کا سامنا کرنے سے پہلے خودکشی کر لونگا" حیدر صاحب نے سنجیدہ لہجہ میں جواب دیا۔

"تب پھر دوسری صورت یہ ہے کہ آپ بجٹ کا اجلاس ہونے دیں اور ممبران اسمبلی کو آزادی کے ساتھ فیصلہ کرنے دیں۔ خواہ وہ آپکے حق میں ہو یا اس کے خلاف۔ خلاف ہو تو پوری جمہوری روایات کی پابندی کرتے ہوئے اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر کسی اور کو ملک و قوم کی خدمت کرنے کا موقع دیں۔"

"مجھے منظور ہے۔" حیدر صاحب نے فوراً اور بڑی آمادگی کے ساتھ کہا۔

"جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے تو خدا کا شکر ہے کہ آپکی گولی کارگر ثابت نہیں ہوئی۔" اختر نے کہا "ممتاز ابھی زندہ ہے اور اسے فوراً ہسپتال بھیجنے کا انتظام کریں۔ مجھے امید ہے کہ وہ بچ جائے گا اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس معاملے کے تمام فریق ملکی و قومی مفاد کے پیش نظر آئندہ اپنی اپنی زبانیں بند رکھیں گے۔"

حیدر صاحب ڈرائنگ روم میں ایمبولنس کے لئے فون کر رہے تھے۔ زیبا اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ نرگس اپنے زخمی بھائی کے پاس موجود تھی اور بنگلے کے برآمدے میں حامد اور اختر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

"اب نرگس کے بارے میں کیا کیا جائے۔" حامد نے پوچھا۔

"یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں" اختر مسکرایا "مگر ایک بات تو بتاؤ۔ ممتاز جیسے نوجوان غیرت کے معاملے میں بڑے جذباتی ہوتے ہیں اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ اس نے کسی دوسرے شخص کے نام کو فرضی طور پر بھی اپنی بہن کے ساتھ منسوب کرنا پسند نہیں کیا پھر کیا اسے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ کہیں تم اپنے شوہرانہ حقوق کا مطالبہ نہ کر بیٹھو۔"

"شادی کی حقیقت کا علم ہونے کے بعد خود میں نے دوسرے کمرے میں سونا شروع کر دیا تھا۔" حامد نے جواب دیا "مگر مجھے شک ہے کہ اگر میں یہ نہ بھی کرتا تب بھی نرگس کے قریب پہنچنا ممکن نہیں تھا۔"

"وہ کیسے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ روزانہ شام کو کھانے میں یا رات کی کافی میں مجھے خواب آور دوا کی گولیاں دیتی رہی ہے۔" حامد نے خفت آمیز لہجہ میں جواب دیا اور اختر نے ایک قہقہہ بلند کیا۔

"بہت خوب۔" وہ ہنستے ہوئے بولا "ویسے میں سمجھتا ہوں کہ تم شریفانہ طور پر کوشش کرو تو شاید ممتاز تمہاری بات مان جائے۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے نرگس بھی تمہیں ناپسند نہیں کرتی۔ سہرے کے پھول کھلنے کی پوری توقع ہے۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے" حامد نے جلدی سے کہا۔

تمہیں اس کیس میں کوئی ندی نہیں مل سکی لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر نرگس راضی ہوگئی تو ایک شاندار اسپورٹ کار تمہیں تحفہ میں پیش کروں گا۔"

"یہ گویا بالواسطہ رشوت ہے کہ اگر مجھے کار چاہیئے تو نرگس کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں؟" اختر نے شوخ لہجہ میں کہا۔

"تم نے اس کی اور اسکے بھائی کی زندگی بچائی ہے۔ وہ دونوں تمہاری بات نہیں ٹال سکتے" حامد نے خوشامد کی۔

"اچھا بھائی اچھا۔ دوستوں کے لئے تو جان بھی حاضر ہے۔"

"اختر بھائی زندہ باد" حامد نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا

"لو اسی بات پر سگریٹ پیو۔" اختر نے کھلے ہوئے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالکر ہونٹوں میں دبالیا۔

"اب تم اس ٹیپ ریکارڈر کا کیا کروگے" حامد نے لائٹر سے اُسکا سگریٹ جلاتے ہوئے پوچھا۔ "تمہاری ہوشیاری کا جواب نہیں۔ وقت ضرورت کیلئے ہر چیز اپنے پاس رکھتے ہو۔ ویسے مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب اتنے چھوٹے ٹیپ ریکارڈر بھی ایجاد ہوگئے ہیں جو ایک سگریٹ کیس میں سما سکیں۔"

"تم نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے" اختر نے نہ معلوم کیوں ہنستے ہوئے جواب دیا۔ حامد حیرت سے اُسکی طرف دیکھنے لگا کہ آخر اس نے ایسا کونسا لطیفہ کہدیا ہے لیکن اختر اسے کیا بتاتا کہ وہ ٹیپ ریکارڈر کسی اور نے نہیں خود اسی نے وقتی طور پر ایجاد کرلیا تھا۔ ورنہ جہاں تک اس کے سگریٹ کیس کا تعلق تھا وہ اوّل تا آخر ایک معمولی سگریٹ کیس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

*